

المحیث اور سستی

www.KitaboSunnat.com

تصنیف

مولانا ندیم راحہ محمد رحمانی

ناشر

دارالترجمہ و التالیف

جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس



معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

سلسلہ اشاعت نمبر

الحشاشہ

مصنف

حضرت مولانا ندیم احمد رحمانی رح

www.KitaboSunnat.com

ناشر

دار الترجمة والتالیف

الجامعة السلفية (مرکزی دارالعلوم بنارس)

تعداد اشاعت بار اقل ایک ہزار
قیمت فی کاپی چھ روپے

پتہ

- (۱) مکتبہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم، پوسٹ بکس ۱۹ بنارس۔
(۲) مکتبہ مرکزی جمعیتہ المحدثین ہند، ۳۱۴ پریس سٹریٹ، دہلی ۶۔

مکتبہ عبدالحجید اثری غازی پوری

عرض ناشر

بھلا اللہ! الجامعۃ السلفیہ، مرکزی دارالعلوم کے شعبہ ”دارالترجمہ والتالیف“ نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور اس کی طرف سے چند اہم مطبوعات ملک اور دنیائے اسلام کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں۔ پہلی کتاب ہے ”الہدایت اور سیاست“ اور دوسری کتاب ہے ”تقویۃ الایمان کا عربی ایڈیشن“۔

”الہدایت اور سیاست“ بڑی فکر انگیز، جامع اور مدلل کتاب ہے اور اس سے تحریک حریت واستقلال وطن کے وہ گوشے نمایاں ہو کر سامنے آگئے ہیں جن پر غلط پروپیگنڈوں کا دیر پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ مصنف رحمہ کے حقیقت نگار قلم نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھایا ہے۔ قارئین کے سامنے یہ کتاب نئے حقائق پیش کرتی ہے۔

دوسرا حصہ - دارالترجمہ والتالیف، کی طرف سے اس کتاب کے دوسرے حصہ کی تصنیف و اشاعت کا اہتمام بھی کیا جا رہا ہے جس میں حضرت میانصاحب کے بعد سے اب تک کے سیاسی حالات زیر بحث آئیں گے انشاء اللہ۔

تقویۃ الایمان عربی مولانا اسماعیل شہید کی وہ معرکہ الابرار تصنیف جس نے توحید باری تعالیٰ کی تینین و تشریح میں بیغرافی شہرت حاصل کی اردو زبان میں ہونے کے باعث دنیائے عرب کے لیے غیر مفید تھی۔ ادھر مرکزی دارالعلوم کے شعبہ ”دارالترجمہ والتالیف“ سے عرب کے بعض ممتاز اہل علم نے پیہم خواہش ظاہر کی کہ اس کتاب کی افادیت کو عام کرنے کے لیے اس کا عربی ترجمہ شائع کیا جائے۔ ان کی خواہش پر مرکزی دارالعلوم کے استاذ مولانا عبدالوحید صاحب رحمانی نے اسے عربی کا جامہ پہنایا اور اب شعبہ نشر و اشاعت اسے شائع کر رہا ہے۔

مرعاة المفاتيح . مشکوٰۃ کی مشہور شرح مرعاة المفاتيح مصنفہ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی مدظلہ اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے اہل علم میں انتہائی مقبول ہے ۔ لیکن اس کی پہلی جلد پاکستان میں طبع ہونے کے باعث دستیاب نہیں ہوتی اور اس کے حصول میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے المکتبۃ السلفیہ کی طرف سے چھوٹی تقطیع پر ٹائپ کے حروف میں اس کی طباعت شروع ہو چکی ہے اور جلد ہی یہ کتاب بھی منظر عام پر آجائے گی انشاء اللہ ۔

یہ کتابیں الجامعۃ السلفیہ (مرکزی دارالعلوم) کے شعبۂ دارالترجمہ والتالیف کی ابتداء مگر بڑی اہم پیش کش ہیں ۔ قارئین دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو اوتیریزی سے کام کرنے کی توفیق بخشے ۔

جب کوئی کام اپنے ابتدائی مراحل میں ہوتا ہے تو نئی نئی دشواریاں بھی سامنے آتی رہتی ہیں ۔ ابتداء مرکز دارالعلوم کے شعبۂ نشر و اشاعت کو بھی ان سے دوچار ہونا پڑا ۔ اس لئے ان کتابوں کی اشاعت میں اگر کسی طرح کی تاخیر ہوئی ہے تو اس میں غیر متوقع حالات کا دخل زیادہ ہے ۔ امید ہے کہ آئندہ بھی یہ ادارہ ملک و بیرون کے سامنے ایسے ہی نادر امد قیمتی تحفے پیش کرتا رہے گا ۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری مدد فرمائے ۔ آمین

دارالترجمہ والتالیف

الجامعۃ السلفیہ (مرکزی دارالعلوم) پوسٹ بکس ۱۹

بنارس

فہرست مضامین اہلحد و سیاست

صفحہ	عناوین	صفحہ	عناوین	صفحہ
۳۵	وطن کی واپسی اور بیکاری	۱۶	۱۱	حضرت مولانا ذریعہ صاحب خانی رحمہ اللہ
۳۶	تعلیم کی خصوصیات	۱۷		ماحول اور اشارے
۳۷	تقریر و تحریر	۱۸	۱۲	ماحول اور ولادت
۳۸	جماعتی درد	۱۹	۱۳	مالی تعاون
۳۹	مرکزی دارالعلوم اور لفظ تعلیم کی	۲۰	۱۴	المومنین علمی اور دینی سرگرمیاں
۴۰	علامت اور وفات	۲۱	۱۵	ترجمہ مؤلف
۴۱	شادی اور اولاد	۲۲	۱۶	خاندانی حالات
۴۲	زہد و تقویٰ حق گوئی و بیباکی	۲۳	۱۷	مولد و منشاء
		۲۴	۱۸	تعلیم و تربیت
		۲۵	۱۹	طالعہ الحدیث رحمانیہ ہلی کا قیام
۱	مقدمہ مصنف	۲۶	۲۰	امتیازی شان
۲	الحدیث اور سیاست	۲۷	۲۱	بدایوں میں تحصیل علم
۳	الحدیث کی مجاہدہ خدا کو چھپانے کی	۲۸	۲۲	والحدیث میں مراجعت اور سند دہی
۴	نار و کوشش اور تاریخ پر ظلم	۲۹	۲۳	شیخ عطاء الرحمن کی وفات اور فی ذمہ لریاں
۵	ہندوستان میں تحریک الحدیث	۳۰	۲۴	وہد ابتلا و آزار ناشی
۶	مولانا اسماعیل شہید اور تحریک الحدیث	۳۱	۲۵	ایک دوسری آزمائش
۷	کی قیادت	۳۲	۲۶	

نمبر شمار	عناوین	صفحت	نمبر شمار	عناوین	صفحت
۶	رسالہ الفتی کا ایک غلط جواب	۳۲	۲۳	ظلم و جور	۹۰
۷	الجواب	۳۳	۲۴	شیخ عبدالحق بنارس	۹۱
۸	اس تحریک کے ثمرات و اثرات	۴۵	۲۵	شیوخ و تلامذہ	۹۵
۹	جوش جہاد اور شوق شہادت	۵۲	۲۶	تصنیف	۱۰۰
۱۰	جوش جہاد کس کے خلاف؟	۶۱	۲۷	تکرار حج اور وفات	۱۰۰
۱۱	چند ممتاز اہلحدیث مجاہدین	۶۵	۲۸	مولنا سندھی کا ایک غمناک پہنا	۱۰۱
۱۲	مولانا اسماعیل شہیدؒ	۶۵	۲۹	انگریزوں کی بنائی ہوئی کہانی	۱۰۳
	دعوت و تبلیغ	۶۶	۳۰	منشی فضل الرحمن، منشی محمدی انصاری	۱۰۵
۱۳	کارنامہ مہائے جہاد	۶۸	۳۱	جنگ مایار	۱۰۵
۱۴	مولنا شہیدؒ کی شجاعت کا عجب	۷۰	۳۲	شہداء کی تدفین	۱۰۸
۱۵	مولنا گیلانی کا ایک مضمون	۷۰	۳۳	سید صاحب کی دعا	۱۰۹
۱۶	مولنا آزادؒ کا ناشر	۷۱	۳۴	منشی محمدی انصاری	۱۱۰
۱۷	شہادت	۷۳	۳۵	ہجرت	۱۱۱
۱۸	قصیدہ در فضائل جرنیل	۷۵	۳۶	انتظام دفتر	۱۱۱
	مولنا محمد اسماعیلؒ		۳۷	ایک واقعہ	۱۱۱
۱۹	مولنا سید جید علی رام پوری	۸۱	۳۸	اخلاق و عادات	۱۱۳
۲۰	مولنا سید محمد علی رام پوری	۸۵	۳۹	شہادت	۱۱۳
۲۱	دراس کا دوسرا سفر	۸۹	۴۰	سید اولاد حسن قنوجی	۱۱۴
۲۲	خان عالم خان اور ان کی صاحبزادی	۹۰	۴۱	بیعت جہاد	۱۱۵
	کی استقامت		۴۲	دعوت و ارشاد	۱۱۵

صفحہ نمبر	عناوین	صفحہ نمبر	عناوین	صفحہ نمبر
۴۳	وفات	۱۱۸	عبارت کا پورا متن اور اس کا صحیح مطلب	۱۴۱
۴۴	اولاد	۱۱۹	نواب صاحب کی بعض دوسری عبارتوں سے اس کی تائید	۱۴۲
۴۵	سید احمد حسن عرشی	۱۲۰	سیرت والا جاہی کے دوسرے بیان پر تنقید	۱۵۰
۴۶	مولنا عرشی کا ایک خواب	۱۲۳	نواب صاحب باقرار خود الحمد للہ مشہور تھے	۱۵۲
۴۷	وفات	۱۲۴	مولنا خرم علی بلہوری	۱۵۴
۴۸	نواب صدیقی حسن خالص صاحب	۱۲۷	حکیم مومن خاں مومن	۱۵۹
۴۹	اساتذہ	۱۲۸	جذبہ جہاد	۱۶۰
۵۰	ورود بھوپال (پہلی مرتبہ)	۱۲۹	مسلم کا اظہار	۱۶۳
۵۱	وطن کی داپسی	۱۳۰	وفات	۱۶۵
۵۲	افسوسناک تنگدستی	۱۳۰	مولنا ابوالحسن افغانی	۱۶۶
۵۳	ورود بھوپال (دوبارہ)	۱۳۲	حاجی عبداللہ خاں	۱۶۷
۵۴	چند ماہ ٹونک میں	۱۳۳	میاں نجی کریم اللہ خاں	۱۶۸
۵۵	ورود بھوپال (تیسری مرتبہ)	۱۳۴	تحریر کا دورِ ثانی	۱۶۹
۵۶	مرثیہ	۱۳۷	مولانا ولایت علی	۱۸۱
۵۷	دعا	۱۳۸	مولنا ولایت علی کا مسلک	۱۸۲
۵۸	نواب صاحب کا مسلک	۱۳۸		
۵۹	سیرت والا جاہی کا بیان	۱۳۹		
۶۰	سیرت والا جاہی کے دعویٰ اور دلیل	۱۴۰		
	(میں مطابقت نہیں)	۱۴۱		

نمبر شمار	عناوین	صفحات	نمبر شمار	عناوین	صفحات
۴۵	ایک شبہ اور اس کا جواب	۱۹۶	۹۳	تفریح ج کے متعلق	۲۵۲
۴۶	مولانا ولایت علی کے خاندان اور دوسرے	۲۰۱	۹۴	تفریح د کے متعلق	۲۶۲
۴۷	اقر بار کا مسلک	۲۰۱	۹۵	۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں الہ آباد	۳۶۳
۴۸	مولانا ولایت کی مجاہدانہ خدمات	۲۰۲	۹۶	علماء نے حصہ لیا ہے	۳۶۴
۴۹	کانہایت مختصر اور اجمالی تذکرہ	۲۰۲	۹۷	بعد کی سیاسی تحریکات اور علمی جہاد	۳۶۵
۵۰	سرحد کی طرف منتقل ہجرت	۲۰۲	۹۸	میں علماء اہلحدیث کا حصہ	۳۶۶
۵۱	دہلی میں ورود اور قیام	۲۰۵	۹۹	ایک معذرت اور اس کا جواب	۳۶۷
۵۲	دہلی سے روانگی اور ستخانہ میں ورود	۲۰۶	۱۰۰	عجیب انصاف	۳۷۰
۵۳	ستخانہ میں قیام اور وفات	۲۰۶	۱۰۱	دوسرا طعنہ اور اس کا جواب	۳۷۱
۵۴	مولانا عنایت علی	۲۰۸	۱۰۲	انعام کی توقع سے زیادہ اپنی جان	۳۷۲
۵۵	غزوات	۲۰۹	۱۰۳	کا خطرہ تھا	۳۷۳
۵۶	۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۷ء	۲۱۱	۱۰۴	واقعہ کی بابت ایک دوسری روایت	۳۷۵
۵۷	۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور مشکلات	۲۱۳	۱۰۵	اس میم کا تعارف	۳۷۸
۵۸	علامت اور وفات	۲۱۴	۱۰۶	حفاظت سے انگریزوں کے کیمپ	۳۷۹
۵۹	مولانا کے متعلق مہر صاحب کے تاثرات	۲۱۶	۱۰۷	میں پہونچا دی گئی	۳۸۰
۶۰	۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور میاں صاحب	۲۱۸	۱۰۸	اس سلوک کا جائزہ قرآن کی روشنی	۳۸۱
۶۱	پہلا طعنہ اور اس کا جواب	۲۱۹	۱۰۹	میں	۳۸۲
۶۲	چند تفریعات	۲۲۲	۱۱۰	انسانی فطرت اور شرافت کا تقاضا	۳۸۳
۶۳	تفریح الف کے متعلق	۲۲۲	۱۱۱	انعامات کی اور چھٹیوں کی حیثیت	۳۸۴
۶۴	تفریح ب کے متعلق	۲۵۰	۱۱۲	انعامات کی مقدار	۳۸۵

صفحہ نمبر	عناوین	صفحہ	نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱۰۸	ایک غلط روایت	۲۹۰	۱۲۲	مکہ معظمہ میں میاں صاحب کی مجلس	۲۹۹
۱۰۹	میاں صاحب نے یہ قسمیں اور برسرِ ٹفلیس	۲۹۰		افسوسناک ریشہ و انیاں	
۱۱۰	کیوں قبول کیں ؟		۱۲۳	کیس کی تیاری میں ہندوستانی	۳۴۳
۱۱۱	خود اپنے کردار و عمل کو بھی دیکھیے	۳۰۱		فتوؤں سے کام لیا گیا	
۱۱۱	ایک معزز غیر مسلم کی شہادت اور	۳۰۲	۱۲۴	مکہ میں میاں صاحب کی گرفتاری	۳۴۴
	ہمارے لئے نازیبا نہ ریغرت			اور شریف مکہ کے سامنے پیشی	
۱۱۲	ایک تازہ انکشاف	۳۰۳	۱۲۵	میاں صاحب نے اپنے عقائد کے	۳۴۶
۱۱۳	میاں صاحب کا سفر حج	۳۰۴		بارے میں ایک تحریر پیش کی	
۱۱۴	اس خبر سے مقلدین میں ہلچل	۳۰۴	۱۲۶	برٹش کونسل کی مداخلت سے میاں	۳۴۷
۱۱۵	مکہ میں علماء اچھدیث پر قیامت	۳۰۹		صاحب کی رہائی -	
۱۱۶	کوڑوں کی سزا کا حکم	۳۱۳	۱۲۷	میاں صاحب کی بابت غلط بیانیوں	۳۵۰
۱۱۷	برٹش کونسل میں پناہ	۳۱۴		اور مولانا آزاد کی طرف سے انکا جواب	
۱۱۸	تبصر اطمینان اور اسکا جواب	۳۱۷	۱۲۸	خالف کمیٹی کے بعض ممتاز ممبروں	۳۵۳
۱۱۹	میاں صاحب کے خلاف میجران انگیز نفوذ	۳۱۹		کا مختصر تعارف -	
۱۲۰	ہندوستان سے لیکر مکہ تک علماء افاضی	۳۲۴	۱۲۹	معرکہ شامی کی حقیقت	۳۶۴
	درپے آزار تھے		۱۳۰	پہلا بیان	۳۶۶
۱۲۱	ایک ٹولی نے پیچھا کیا، راستہ بھر	۳۲۷	۱۳۱	دوسرا بیان	۳۶۷
	پریشان کرتی رہی		۱۳۲	درس عبرت	۳۸۸

صفحہ	عناوین	صفحہ	عناوین	صفحہ
۴۱۴	میاں صاحب کی خانہ تلاشی اور جیل	۳۸۸ ۱۳۹	ایک فرضی اور جعلی توبہ نامہ	۱۳۳
	کی نظر بندی	۳۹۲	سوال	۱۳۶
۴۱۹	ایک عجیب اعتراض	۳۹۳ ۱۴۰	جواب	۱۳۵
۴۲۴	میاں صاحب کے بعض عقیدوں	۳۹۶ ۱۴۱	توبہ نامہ کی بابت اسیحاۃ بعد الممات	۱۳۷
	کا غلط حسن ظن		کی محدث کا تحقیقی جائزہ	
۴۳۵	تمت	۴۰۳ ۱۴۲	ایک شبہ اور اس کا جواب	۱۳۷
		۴۰۵	شمس العلماء کا خطاب	۱۳۸

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حضرت مولانا ندیر احمد صاحب رحمانی رحمہ اللہ

ماحول ————— اور اشاکے

زیر نظر کتاب استاد الاساتذہ حضرت مولانا ندیر احمد صاحب رحمانی رحمہ اللہ کی
کمال آخری تصنیف ہے۔ مرحوم نے اس کتاب میں اپنی بیٹیوں پر لکھے جانے والے اس الزام کا جائزہ
لیا ہے کہ

”ہندوستان کی تحریک آزادی اور ملک کی سیاسی زندگی میں جماعت اہلحدیث کا
کوئی کردار یا حصہ نہیں ہے“

ہم مرحوم کی اس کتاب کا تعارف کرانے سے پیشتر آپ کی حیات طیبہ کا ایک اجمالی خاکہ نظر
کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں چونکہ مرحوم کی یہ کتاب ”تحریک اہلحدیث“
”آزادی وطن“ اور ”مجاہدین وطن“ سے تعلق رکھتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ
آپ کے حالات زندگی پیش کرنے سے پہلے اس ماحول پر بھی مختصر روشنی ڈال دی جائے۔
جس میں حضرت مولانا ندیر احمد صاحب رحمانی رحمہ اللہ کی پرورش و پرورش و پرورش ہوئی تاکہ نظر
اس بات کو بے آسانی سمجھ سکیں کہ اس موضوع پر لکھانے سے پہلے ”تحریک آزادی وطن“ اور تحریک
اہلحدیث کے سلسلہ میں آپ کی خدمات کیا ہو سکتے ہیں اور آپ کے دل میں ”استقامت وطن“

کی تڑپ کتنی شدت سے جاگزیں رہی ہوگی ؟

یہ موضوع ایک ایسا موضوع ہے جو پوری شدت کے ساتھ "تحریک مجاہدین آزادی" کی منظر کشی اور عکاسی کا متقاضی ہے تاکہ یہ بات پوری طرح واضح ہو سکے کہ "تحریک المجاہدین" کا ایک بڑا مقصد کتاب و سنت کے اجبار کے ساتھ ساتھ غیر ملکی جوہر استبداد اور اغیار کے استعمار و استحصال سے ملک کو آزادی دلانا بھی تھا۔ لیکن طوالت کا خوف دانگیہ ہونے کے سبب سے ہم مختصر نگاری سے کام لیں گے اور صرف چند جزئی واقعات کا ذکر کر کے مولانا رحمان مرحوم کے حالات زندگی سے ناظرین کو روشناس کرائیں گے۔

حضرت مولانا ندیر احمد صاحب مرحوم کی جائے ولادت

ماحول اور ولادت

کا ایک موضع ہے جسے اٹلو کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ یہ موضع شہر اعظم گڑھ سے جانب مشرق سات آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اعظم گڑھ کے مشہور قصبہات میں ایک قصبہ مبارکپور بھی ہے۔ جہاں عرصہ دراز سے مشہور اساطین علم و فن اور یکتائے روزگار کا عالم پیدا ہوتے رہے ہیں (جامع ترمذی کے مشہور شاہ) خاتم المحدثین، علامہ زماں حضرت مولانا ابوالعلی عبدالرحمن صاحب مبارکپوری صاحب تحفۃ الملاحوئی و ابکار المنن و مصنف تصانیف کثیرہ مبارکپوری کے تھے، حضرت مولانا عبدالسلام صاحب مبارکپوری مرحوم و مغفور مصنف سیرۃ البخاری و حیات ایخ محمد بن دتاریخ المغوال) کا تعلق بھی اسی مبارکپور سے تھا اور اس وقت تو حضرت الشیخ، استاذ الاساتذہ مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی حفظہ اللہ و عاہ مصنف مرعاة المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح کی معتمد ہستی ایسی ہے کہ آپ کے باعث قصبہ مبارکپور خواہیں و عوام کے لئے اپنے اندر ایک خاص کشش اور جاذبیت رکھتا ہے۔

قصبہ مبارکپور کا بیچاقتی نظام عرصہ دراز سے ۲۸ محلوں پر مشتمل چلا آتا ہے، اس حیثیت

سے موضع اطو بھی اس کے پچا کئی نظام کا ایک جز ہے۔ گویا موضع اطو اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے ہوئے بھی مبارکپور ہی کا ایک حصہ ہے۔

موضع اطو، مبارکپور سے عین جانب مشرق کم و بیش ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس موضع پر "اتحرک الہدیث" اور "اتحرک حریت و استقلال وطن" کا سایہ اسی وقت سے پڑنا شروع ہو گیا تھا جب ہندوستان میں یہ تحریکیں شروع ہوئیں۔ اسی لئے جب ملک کی خاطر قربانیوں کی ضرورت تھی، مجاہدین آزادی کی سپاہ تیار ہو رہی تھی اور لام بندی کا بگل بچھا ہوا تھا تو غازی محمد اسماعیل، غازی عبدالسبحان پسر بابو اور غازی محمد اکبر مرحوم مجاہدین آزادی کی صفوں میں شامل ہو کر میدان کارزار کیلئے روانہ ہو گئے۔

واقعہ حال لوگوں کا بیان ہے کہ غازی عبدالسبحان نے رات میں یہ خواب دیکھا کہ وہ مجاہدین آزادی کا کھانا تیار کر رہے ہیں اسی اثناء میں ان کو غنیم کی فوج کی گولی لگتی ہے اور وہ جان بحق ہو جاتے ہیں۔ دوسرے دن ان کے ساتھ بعینہ یہی واقعہ پیش آیا اور اس طرح وہ جام شہادت نوش کر کے شہیدوں میں شامل ہو گئے۔

غازی محمد اسماعیل محاذ جنگ پر گئے تو آج تک ان کی کوئی اطلاع نہ مل سکی کہ انھوں نے جام شہادت کب نوش کیا اور اپنی جان، جان آفریں کو کب ہونی؟ غازی محمد اکبر مرحوم البتہ دو مرتبہ محاذ جنگ سے واپس آئے۔ تیسری مرتبہ جاتے ہوئے پٹنہ میں گرفتار ہو گئے تو شہادت کے لئے اطو سے جناب محمد موسیٰ، عبدالقدیر اور عبدالغفار صاحبان پٹنہ گئے۔ ان لوگوں کی شہادت پر غازی صاحب موصوف کو قید فرنگ سے رہائی تو مل گئی مگر ان کی پیشانی کو جلتے ہوئے سرخ لوسے سے داغدار بنا کر انھیں حریت پسندوں کا نمونہ دیدیا گیا۔

اس کے بعد غازی محمد اکبر مرحوم کا سرحد جانا مشکل ہو گیا۔ لیکن اپنے وطن میں رہ کر بھی وہ مجاہدین حریت کی امدادی خدمات انجام دیتے رہے۔ سچ ہے من المؤمنین رجال صدقوا

ما عاهدوا اللہ علیہ ۲۱

غازی محمد اکبر مرحوم کی تنہا یادگار ان کے ایک صاحب فرزند میاں محمد یحییٰ مرحوم تھے جو نہایت پرمیتر گار، متقی، دیندار اور خدا رسیدہ انسان تھے۔ ان کی پوری زندگی علم دین کی خدمت میں گزری، ان کی موت بھی اپنے مسکن سے دور، موضع شاہ پور میں ہوئی۔ جہاں وہ تعلیم کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس طرح ان کی تدفین بھی وطن سے دور عمل میں آئی غازی محمد اسماعیل اور غازی عبدالسبحان کے خاندان اور رشتہ دار اب تک موضع اٹو اور پٹیا میں آباد ہیں۔

ملک میں جذبہ جہاد و حریت پیدا کرنے اور غازیوں کے سامان جہاد کی مالی تعاون | تیاری کے لئے کثیر مال و دولت کی ضرورت تھی اس بارے میں جہاں ملک کے بہت سے حریت پسندوں نے مجاہدین آزادی کی اعانت و کفالت کا بار اٹھایا "موضع اٹو" بھی اپنی حیثیت کے مطابق اس تعاون میں برابر شریک رہا۔ راس العلماء استاد الاساتذہ حضرت مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری رحمہ اللہ مجاہدین سے بڑی محبت رکھتے تھے سر گذشتہ مجاہدین کے ۱۳۳۵ھ پر مولانا غلام رسول تہر مرحوم لکھتے ہیں۔

”مولانا رحیم آبادی جب ہلی تشریف لاتے تو شیخ عطار الرحمن کے یہاں پچھلے کچھ خاں میں قیام فرماتے، جمعہ پڑھاتے تو خطبے میں سورۃ فاتحہ اور آخر تک پڑھتے اور مختصری تقریر فرماتے پھر وہ اور حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری اور دوسرے علماء و رؤساء اوکھلا میں جمع ہوتے وہاں بندہ کے کمرتب دکھائے جاتے جنھیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے انھیں اور حافظ صاحب غازی پوری کو مجاہدین سے بڑی الفت تھی اور جہاد کا بہت شوق تھا اسی خیال سے وہ موزوں جوانوں کو منتخب کر کے ان کے

لئے سپاہیانہ فنون کے سیکھنے کا انتظام فرمایا کرتے تھے،
پھر مہر صاحب ^{۶۵۳} پر لکھتے ہیں۔
”صوفی صاحب کے بیان کے مطابق مندرجہ ذیل حضرات جماعت مجاہدین کی
امداد و استعانت کے ستون تھے۔“

مذکورہ بالا عبارت کے بعد موصوف نے ۲۳ آدمیوں کے نام تحریر فرمائے ہیں۔ ان میں دوسرا
نام حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی کا ہے گیا رہواں نام جناب شیخ غطا الرحمن
مرحوم مہتمم مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی کا اور بائیسویں نمبر پر حضرت حافظ صاحب غازی
پوری ہیں رحمہم اللہ اجمعین۔

ان اقتباسات اور تفصیلات کے پیش کرنا مقصد یہ ہے کہ حضرت علامہ حافظ صاحب
غازی پوری رحمہ اللہ نے موضع اہلو کو اپنی تشریف آوری سے بارپا نوازا۔ ایک ایسے دور میں
جب فضا میں ہر طرف آزادی وطن اور جہاد کے دل نواز نغے گونج رہے ہوں، خدا کا رسی و
جان نثاری کا جذبہ ہر رگ وریشہ میں سمایا ہوا ہو، اللہ کی راہ میں جان و مال کو نثار کر دینا اور
لے صوفی صاحب کے مراد صوفی عبداللہ صاحب ہیں جو مولوی ولی محمد فتوحی والا اور مولوی فضل الہی کی تقریروں
سے متاثر ہو کر جماعت مجاہدین میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد مولوی فضل الہی کے ساتھ چندہ اکٹھا کرنے
کے لئے دورے کیا کرتے تھے ان کے قید ہو جانے پر اس خدمت کو تنہا انجام دیتے رہے۔ بعد میں چمر کڈ
جا کر وہاں کے مجاہدین کی خدمت کو خود پر لازم کر لیا۔ وہاں سے واپس آکر ^{۱۳۵۰} رجب ^{۱۹۳۸} میں لاٹھی چل
میں جماعت اہل حدیث کی ایک درس گاہ قائم کی۔ رفتہ رفتہ اس درس گاہ کا حلقہ فیض بہت وسیع
ہو گیا۔

صوفی صاحب سرگرم، خلص، پاکباز اور حرکت، عمل کا پیکر ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو

سرگزشت مجاہدین ^{۶۵۲}/_{۶۵۳}

حق کے خاندانوں کو دولت دنیا سے بے نیاز بنا کر جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آمادہ کرنا ہی سب سے بڑی سعادت ہو تو ایسے حالات میں حضرت حافظ صاحب غازی پوری جیسے مخلص، پاکیزہ اور مجاہد فی سبیل اللہ کا المودار مبارکپور جیسے مقامات میں بار بار تشریف لانا مصلحت سے خالی نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کی انہیں مساعی کا نتیجہ تھا کہ غازی محمد اسماعیل اپنے رفقاء کے ساتھ عازم میدان کارزار ہوئے۔ مبارکپور، المودار، لوطیا سے مستقل اعانتی رقبے عرصہ دراز تک مرکز مجاہدین کو بھیجی جاتی رہیں۔ حضرت غازی پوری رحمہ اللہ کے علاوہ ابھی میرے ہوش سنہلنے تک مولوی اسد اللہ صاحب روانوی مجاہدین سرحد کی مالی اعانت کے سلسلہ میں برابر مذکورہ مقامات کے دورے کیا کرتے اور محیر حضرات سے تعاون کی رقوم حاصل کر کے معینہ مقامات کو بھیجتے رہے ہیں۔ لیکن چونکہ اس وقت اس طرح کا ہر کام انتہائی بڑے ماری سے انجام پاتا تھا اس لئے آج ان کی تفصیلات سے پردہ اٹھانا آسان کام نہیں ہے۔

موضع الطولی اور دینی اعتبار سے بھی ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا

الموین علمی و دینی سرگرمیاں | مولانا عبداللہ صاحب جہاد والد آبادی نے ایک عرصہ تک اس بستی کو اپنا مستقر بنائے رکھا۔ موصوف الموین مقیم رہ کر یہاں اور اس سے متصل دوسری بستیوں میں عمل بالکتاب و السنہ کا بیج بونے رہے۔ آپ شیخ النکل فی النکل حضرت میاں سید نذیر حسین صاحب رحمہ اللہ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ دینداری اور تقویٰ شعاری میں آپ کی مثال کم ہی ملے گی، فرض نمازوں میں موضع المودار لوطیا کے عالمین بالحدیث کے اندامام کے پیچھے رکوع کے بعد جہری تحمید **رسینا للہ الحمد الخ** کا جو دستور ہے وہ آپ ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ بنگال میں بھی جہاں جہاں آپ مقیم رہے وہاں کے لوگوں میں جہری تحمید کا رواج انکس موجود ہے۔

ان کے علاوہ مولانا عبدالمجید مدنی مرحوم بھی یہاں تشریف لا کر فریضہ تبلیغ دین ادا فرما

چکے ہیں۔ حضرت مولانا سیف بنارسی مرحوم کی تبلیغی سرگرمیاں تقریباً یہیں سے شروع ہوئیں
آپ کی سب سے پہلی تقریر اس کے قریب موضوع چکیا میں ہوئی جسے مولانا سیف اپنے آخری
ایام تک موقع موقع سے یاد دلایا کرتے تھے۔

فتاویٰ نذیریہ میں بہت سے سوالوں کے جواب میں مجیب کا نام "العبد عبدالحق
اعظم گڑھی" یا "ابو عبدالحق اعظم گڑھی" مرقوم ہے۔ یہ مولانا عبدالحق صاحب موضع
الو کے باشندے تھے۔ تحصیل علم کے بعد سند فرائض کی خاطر حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ
کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مدت العمر کیلئے دہلی ہی کو اپنا مستقر بنالیا اور اپنے وطن
لوٹ کر واپس نہ آئے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ خانگی الجھنوں سے مجبور ہو کر انھوں نے
ایسا کیا تھا واللہ اعلم۔

میاں صاحب نور اللہ تحصیل علم کے شوق میں الو سے پایادہ دہلی گئے اور عرصہ
تک حضرت میاں صاحب دہلوی مرحوم کی خدمت میں حاضر رہ کر علمی تربیت و تعلیم
حاصل کرتے رہے۔ واپسی کے بعد ان سے قرب و جوار کے علماء و بزرگوں کی تائید
لاتے اس لئے مخالفت کے باوجود کسی کو ان سے گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

غرض کہ موضع الو اسی دور سے تحریک الجہاد اور تحریک آزادی وطن کا ایک
معتبر مقام رہا ہے جب ہندوستان میں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ

حاشیہ صلا کا لے

مولانا عبدالحق مدنی ایک عرب تاجر تھے جو قیمتی پتھروں اور موتیوں کی تجارت کرتے تھے۔ اس طرح الو
آئے تو یہاں محل بالکتاب والسز کا جذبہ و شوق دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور ایک عرصہ تک یہاں مقیم
رہ گئے۔ میرے والد محترم ان کے فیض یافتگان میں انک موجود ہیں۔

آج میرا صاحب نور اللہ موضع الو کے ایک بزرگ تھے جنکو علوم شرعیہ سے بڑا شغف تھا۔ تعلیم زیادہ نہیں مگر علمائے محبت
بہت مرغوب تھے ان کی فتویٰ میں وہ دہلی نشر لیتے تھے اور حضرت مولانا صاحب دہلوی مرحوم کی خدمت میں لے جاتے۔

کی زیر قیادت استخلاص وطن اور اچائے توحید و سنت کا شعور پورے شباب پر تھا۔
 اس طرح کی دینی اور اصلاحی تحریکیں مرور ایام کے باعث چاہے دھندلی پڑ جائیں
 لیکن ان کے اثرات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ فوراً مٹائے نہیں جاسکتے۔ حضرت مولانا ندووی
 صاحب رحمانی مرحوم نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور جس آب و ہوا میں آپ کی پرورش
 و پرداخت ہوئی وہ تحریک استخلاص وطن کا وہ پختہ ماحول اور اچائے کتاب و سنت کی وہ
 پاکیزہ اور عطر بیز آب و ہوا تھی جس میں لٹہیت، خلوص، ایثار، حق پسندی و باطل شکنی پوری
 طرح سرایت کئے ہوئے تھی۔ آپ کا گھرانہ عمل بالکتاب والسنہ کی روایت کو معلوم نہیں کب
 سے گلے لگا چکا تھا اس لئے یہ باتیں مولانا کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھیں اور آپ اپنی وضع
 پر اخیر عمر تک بڑی شدت سے قائم رہے۔

جن لوگوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ کے اندر ایمانی
 غیرت اور اسلامی حمیت کتنی زیادہ تھی؛ معمولی بات کو بھی آپ سنت کے خلاف دیکھنے
 کے روادار نہ تھے۔ حق گوئی میں بڑے بے باک اور جری تھے۔ حالات کتنے ہی مختلف ہوں
 اغیار کی کتنی ہی کثرت ہو، جمع خواہ کیسا ہی ہو حق کے اعلان میں کبھی آپ کو تردد نہ ہوا۔ سچی
 بات علی رؤوس الاشهاد کہتے اور کبھی اس کی پرواہ نہ کرتے کہ اس سے کسی کو خوشی
 ہوگی یا ناخوشی سے

کیوں کر خض و خاشاک سے دب جائے مسلمان

مانا کہ تب و تاب نہیں اس کے شر میں

مولانا کی زندگی کے اس پس منظر میں ہم مولانا کے حالات زندگی اختصار کے ساتھ

ہدیہ ناظرین کر رہے ہیں۔

ترجمہ مولف

ولادت ۶ فروری ۱۹۰۶ء مطابق ۱۰ رذی الحجہ ۱۳۲۳ھ کو ہوئی اور سانحہ ارتحال ۳۰ مئی ۱۹۶۵ء مطابق ۲۸ محرم ۱۳۸۵ھ روزیکشنبہ کو ۳ بجے دن میں پیش آیا والد کا نام عبدالشکور اور دادا کا نام شیخ جعفر علی تھا آپ کا گھرانہ یہاں کے مقتدر گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔

مولانا عراقی برادری سے تھے کسی زمانہ میں اس برادری کے لوگ **خاندانی حالات** تجارت پیشہ نیل سازی اور نیل کی کاشت کرانے میں مشہور تھے ان کے یہاں نیل سازی کے بڑے بڑے گودام اور کارخانے چلتے تھے۔ یہ لوگ زمینداروں کے بھی مالک ہوا کرتے تھے خود مولانا کے دادا شیخ جعفر علی مرحوم کے متعلق تحقیق سے معلوم ہوا کہ کسی وقت موضع الملوکی زمینداری میں پل حصہ کے مالک و زمیندار تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود مولانا کے والد شیخ عبدالشکور شہر اعظم گڑھ کے مشہور علاقہ دار قادربخش کی جین جیات تک ان کے علاقہ کے کارپرداز اور ان کی وفات کے بعد ان کے نابالغ لڑکے احسان اللہ کے مختار عام تھے اسی طرح شیخ عبدالشکور کے بھائی حاجی عبدالسلام مرحوم علاقہ رسٹرا ضلع بلیا کے رئیس امجد علی، امانت علی کے علاقہ کے کارپرداز تھے اور ان کا قیام موضع بھولی راستیشن چلکھ ضلع بلیا میں رہا کرتا تھا۔ مولانا کے والد شیخ عبدالشکور مرحوم کی تقریباً ۱۲ بیگمہ ذاتی زمین بھی اعظم گڑھ سے متصل واقع تھی جس کی پیداوار ابھی حال تک مولانا اور ان کے بھائی نصیر احمد کو ملتی تھی۔ زمین داریوں کے الٹا پھرنے کے دور میں وہ ساری زمین انھیں کاشتکاروں کے ہتھ چڑھ گئی جو اس پر کاشت کرتے تھے۔

مولد و منشا مولانا کا مولد و منشا "المو" ہے یہ موضع قصبہ مبارکپور سے سمت

مشرق ایک میل اور شہر اعظم گڑھ سے ۷۰ میل کی دوری پر ہے ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ قصبہ عرصہ دراز سے علم و فن کا گہوارہ رہا ہے اور یہاں بڑے بڑے علماء دین اور اساتذہ علم و فن گذرے ہیں گویا یہ جگہ اپنی ممتاز علمی خصوصیات کے اعتبار سے عرصہ دراز سے مرجع خلافت ہے۔

موضع الملو، مبارکپور سے ٹھیک مشرق میں واقع ہے یہاں کے توحید و سنت کے شیدائی اپنے دینی مسائل میں جس طرح مقامی اہل علم سے مستفیض ہوتے رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ فیض ان کو مبارکپور کے ممتاز ارباب فضل و کمال سے پہونچا ہے اور پہونچ رہا ہے۔ ایک میل کی مسافت کوئی مسافت نہیں ہے اس لئے اگر ایک جگہ کسی طرح کی کوئی مختلف بات پیش آجائے تو اس کے اثرات دوسری جگہ فوراً نمایاں ہو جاتے ہیں گویا یہ دونوں مقامات ایک دوسرے سے پوری طرح وابستہ ہیں۔

مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی مرحوم کی ابتدائی تعلیم مبارکپور میں ہوئی اس کے بعد آپ نے مدرسۃ الاصلاح سرلہ میو میں داخلہ لے لیا یہاں سے کچھ ہی دنوں کے بعد مدرسہ فیض عام میں داخل ہو گئے۔ مدرسۃ الاصلاح کی بہ نسبت فیض عام کے قیام کی مدت زیادہ ہے یہاں آپ کو صدر المدرسین حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمہ اللہ کی تعلیم و تربیت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحب مرحوم مسو کے ان برگزیدہ اعظم رجال میں ہیں جن کی وجہ سے مسو میں علم و فن کو زندگی ملی۔ آپ کی شان میں یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ

آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند

گویا دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے قیام کے اعلان تک آپ کی تعلیم آپ ہی کے ضلع (اعظم گڑھ) کے مختلف مقامات میں ہوتی رہی۔

دارالحدیث رحمانیہ دہلی کا قیام اشوال ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں مدرسہ دارالحدیث

رحمانہ دہلی کے قیام کا اعلان ہوا، اس وقت مولانا کی عمر ۱۵-۱۶ سال کی تھی آپ نے اسی سال دہلی جا کر دارالحدیث رحمانہ دہلی میں داخلہ لے لیا۔ اور اس ممتاز علمی مرکز کی ابتدائی زندگی سے لیکر آج تک اس سے وابستہ رہے آپ کے بقیہ تعلیمی ایام یہیں گزرے الّا یہ کہ شیخ عطار الرحمن مرحوم کے مشورے سے آپ نے معقولات کی تکمیل کے لئے تھوڑے دنوں تک رامپور، بدایوں میں قیام کیا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

دہلی کے مشہور تاجر جناب حاجی شیخ عبدالرحمان و عطار الرحمان برادران کو حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب محدث رحیم آبادی (صاحب حسن البیان) سے بڑی عقیدت تھی مولانا غلام رسول مہر کے حوالے سے ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ مولانا رحیم آبادی جب دہلی تشریف لاتے تو آپ کا قیام پھاٹک حبش خاں میں شیخ عبدالرحمن و عطار الرحمن مرحومین کے یہاں ہوا کرتا تھا۔

مولانا رحیم آبادی اپنے وقت کے بے مثال عالم، عظیم النظیر مناظر، جلیل القدر مقرر اور قادر الکلام خطیب و داعی تھے دوران قیام دہلی میں خطبہ جمعہ کے علاوہ عموماً مجالس و عظمت و تذکیر بھی منعقد ہوا کرتی تھیں اور فن سپہ گری کی تربیت کے لئے اکھاڑے بھی جیتے تھے مولانا کے صحبت یافتگان اور ہم جلسوں میں فن سپہ گری کا شوق اتنا غالب تھا کہ جس زمانہ میں دارالحدیث رحمانہ دہلی میں زیر تعلیم تھا (۳۹ تا ۳۷ھ کا زمانہ) اس کے مہتمم جناب شیخ عطار الرحمان مرحوم نے فن سپہ گری اور بنوٹ کے لئے باقاعدہ ایک استاد کا انتظام کر رکھا تھا۔ جو جماعت مجاہدین کی یادگار تھے۔ اور بعد نماز عصر طلباء کو دارالحدیث کے وسیع ہال میں بنوٹ و غیرہ کی عملی تعلیم دیتے تھے۔

بعض لوگوں کے بیان کے مطابق دارالحدیث رحمانہ دہلی کا قیام مولانا رحیم آبادی مرحوم کے ایمار سے عمل میں آیا تھا۔ لیکن اس مرکز علم و فن کی بنیاد آپ کی حیات مستعار میں نہ پڑ سکی اس لئے کہ... بعض وقائع نگاروں کے بیان کی رو سے آپ کی وفات

۱۳۳۶ھ میں ہوئی اور رحمانیہ کا قیام ۱۳۳۷ھ میں عمل میں آیا۔ بہر کیف اس بیان کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ ہی کی رہنمائی اس کے قیام کی اصل محرک ہوئی اور آپ ہی کے ارشاد کے مطابق الحاج شیخ عبدالرحمان مرحوم نے اسے قائم کیا جو آگے چل کر ملک میں تحریک اہلحدیث اور اچائے کتاب و سنت کا ایک مضبوط مرکز بن گیا، اور اس نے علم دین کی حفاظت کے لئے ملک میں اتنے جلیل القدر علماء پیدا کئے کہ جن سے تحریک اہلحدیث ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔

حضرت مولانا ندیم احمد صاحب رحمانی مرحوم اس عظیم علمی ادارے سے مہر سے لیکر لحد تک وابستہ رہے اور اس کی پوری تاریخ آپ کی نگاہوں کے سامنے مرتب ہوئی رہی رحمانیہ دہلی میں مولانا کے تحصیل علم کا مشغلہ سات سال تک جاری رہا یعنی ۱۳۳۹ھ میں آپ نے وہاں داخلہ لیا اور ۱۳۴۷ھ میں سند فراغت حاصل کی اپنے داخلہ کی بابت مولانا خود رقم طراز ہیں

”مدرسہ رحمانیہ دہلی کا افتتاح شوال ۱۳۳۹ھ میں ہوا اور اسی سال تقریباً دو مہینہ کے بعد ذی الحجہ میں مدرسہ میں لغز تعلیم داخل ہو گیا، ابتدا سے انتہا تک اپنی دینی تعلیم کا بیشتر حصہ یہیں مکمل کرنے کے بعد شعبان ۱۳۴۲ھ میں میں نے مدرسہ سے سند فراغت حاصل کی اور پھر اسی سال مدرسہ کی حیثیت سے مدرسہ کی خدمت پر مامور ہو گیا اور اب تک محمد القدر اسی درجے پر فائز

ہے۔ رحمانیہ کے قیام کی بابت مولانا کی تحریر کا اقتباس پیش کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ مولانا ابوبی امام خاں نوشہروی مرحوم کی بعض تحریروں میں کاتب کی لغزش سے دارالحدیث رحمانیہ دہلی کا سن ۱۳۴۲ھ تحریر ہو گیا ہے آگے چل کر یہ معمولی سی لغزش ایک تاریخی غلطی بن سکتی ہے اس لئے اس کی نشاندہی کر دی گئی ہے مولانا کی اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قیام رحمانیہ کے صرف دو ماہ بعد آپ نے وہاں داخلہ لیا۔

ہوں اس اٹھارہ سالہ زندگی میں شاید ایک آدھ سال میں مدرسہ سے غیر حاضر رہا
ورنہ اکثر حصہ اسی گلشنِ علم کی بلبلوں، باغِ حکمت کے پھولوں اور بیاضِ ملت
کی کاریروں میں گزرا ہے۔

(رسالہ محدث جولاہی ۱۹۳۹ء
جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں داخلہ کے وقت آپ کے
زیرِ درس عربی کی کون سی کتابیں رہی ہوں گی؟

بہر کیف دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں آپ نے جلیل القدر اساتذہ علم و فن کے
زیرِ تربیت اپنے تعلیمی مشاغل جاری رکھے اس وقت رحمانیہ میں جید علمائے درس و تدریس
اکٹھا تھے اساتذہ حضرت مولانا احمد اللہ صاحب پرتابگڑھی شیخ الحدیث دارالحدیث
رحمانیہ دہلی، جامع العقول والمنقول مولانا غلام محی صاحب پنجابی کانپوری، ادیب شہیر،
مولانا عبدالرحمن صاحب گرنسوی جیسی جیسی گرانمایہ اور سرآمد روزگار شخصیتیں مسندِ درس و
تدریس کی زینت تھیں۔ ان کے زیرِ سایہ تربیت پانے والا ہر جوہر قابلِ فضل و کمال کی جن
بلندیوں تک نہ پہنچ جائے تھوڑا ہے۔ حضرت الشیخ مولانا عبید اللہ صاحب مبارکپوری
منظرہ کائنات تکمیلِ رفقہ جہری ہے اور مولانا نذیر احمد رحمانی مرحوم کا لکھنؤ جہری یعنی حرفِ ایک
سال کے تفاوت سے دارالحدیث رحمانیہ دہلی نے ملک کو دو ایسے انمول جوہر دیے جو تقسیم
ہند کے بعد ملک کی تحریکِ الحدیث کی روح اور کتاب و سنت کی خدمت، اور دینِ خالص
کی ترویج و اشاعت میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا الموی مرحوم نے مسندِ درس
و تدریس منبھالی تو علمِ دین کی خدمت کیلئے ملک کے کونے کونے کو عللے وینے نہال
اور اسودہ کر دیا۔ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی نے تصنیف و تالیف کے میدان
میں قدم رکھا تو مرعۃ المفاتیح میں علم و معرفت کے وہ دریا بہائے جس سے برصغیر ہند
وپاک کے شائقینِ علم و دانش کے علاوہ عرب اور دوسرے ممالک کے لوگ بھی مستفیض

ہو رہے ہیں۔ خدا اس شرح کو جلد اتمام تک پہنچانے کے اسباب فراہم کر کے امت مرحومہ کی اصلاح و ہدایت کا سامان بہم پہنچائے۔

دارالحدیث رحانیہ دہلی کا یہ امتیاز تھا کہ امتحانات کے اندر رجعت
امتیازی شان میں اول آنے والے طلبہ کو نقد انعامات دئے جاتے اسی طرح

پہلے پورے مدرسہ میں ممتاز ہوتا یا سال کے اندر نماز باجماعت کی پابندی میں سبقت لے جانا اسے بھی انعامات سے نوازا جاتا حضرت مولانا الطوی مرحوم کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ آپ رحانیہ کے اندر جماعت میں ہمیشہ اول آتے اور انعامات حاصل کرتے رہے جس سال آپ نے وہاں سے تکمیل کی ہے آپ کو دارالحدیث کی طرف سے بخاری شریف کامل کے علاوہ مبلغ پچاس روپے نقد اور ایک جیسی گھڑی سے بطور انعام مشرف کیا گیا۔

مولانا تکمیل کے بعد جب دہلی سے اپنے وطن واپس آئے تو فراغت کی خوشی میں آپ کے والد محترم جناب شیخ عبدالشکور نے ایک جلسہ وعظ و تبلیغ منعقد کیا۔ اس جلسہ میں علامہ زماں مولانا عبدالرحمان صاحب محدث مبارکپوری رحمہ اللہ کے علاوہ آپ کے استاذ مولانا عبدالغفور صاحب جیراچپوری مرحوم اور مولانا ابوالقاسم سیف بناری مرحوم نے بھی شرکت فرمائی۔ احقر کی عمر اس وقت ۱۲ سال کی تھی اس کے باوجود اس جلسہ میں موجود تھا۔ جلسے کی کاروائی ۱۲ بجے رات تک چلتی رہی پھر شیخ الکل مولانا مبارکپوری کی دعاؤں پر اس کا اختتام ہوا۔

مولانا کی اوپر کی تحریر سے معلوم ہوا کہ شعبان ۱۳۴۶ھ میں فراغت کے بعد اسی سال شوال سے جب عربی مدارس کا نیا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے آپ نے مشہور زمانہ مدرسہ دارالحدیث رحانیہ دہلی میں مستند تدریس نبیالی اور آپ کے اوپر تعلیم و تدریس کے ذمہ داریاں ڈال دی گئیں اس وقت آپ عمر کی تیسویں منزل میں تھے۔

آپ کو معقولات سے فطری لگاؤ تھا اور اہل میدان میں آپ کی طبیعت کا جوہر

اچھی طرح کھلتا تھا اس لئے دارالحدیث رحمانیہ میں مسند تدریس سنبھالنے کے بعد مکتب احادیث کے ساتھ ساتھ نورالانوار اور رشیدیہ وغیرہ کی تعلیم بھی آپ کو سونپی گئی۔ لیکن عالیجناب شیخ عطاء الرحمن مرحوم کی جو اس وقت دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے مہتمم تھے یہ خواہش تھی کہ مولانا معقولات میں پوری دسترس اور کمال حاصل کر کے کیا رکتے۔ معقولات مروجہ کالوجہ سنبھال لیں۔ اس لئے آپ نے انھیں معقولات کی تعلیم کے لئے رامپور بھیج دیا۔

بدایوں میں تحصیل علم [مولانا نذیر احمد رحمانی رامپور اسٹیٹ میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی خدمت میں تشریف لے گئے جو اس وقت مدرسہ عالیہ رامپور کے پرنسپل اور خیر آبادی سلسلہ کے ایک نامور عالم تھے مگر وہاں ریاضی کی تعلیم نہ ہونے کے باعث آپ مدرسہ شمس العلوم بدایوں چلے آئے۔ یہاں جامع العلوم مولانا عبدالسلام صاحب خدیوہ افغانی معقولات و ریاضی میں بیگانہ روزگار تھے اور بڑے نظم و اہتمام سے فنون کی تعلیم ہوتی تھی یہاں ایک سال قیام فرما کر آپ نے معقولات و ریاضی کی بہت سی درسی اور غیر درسی کتابوں کی تکمیل فرمائی۔ شمس العلوم بدایوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ تمام طلبہ و اساتذہ افغانی تھے صرف مولانا کی ایک بستی ایسی تھی جو ہندوستانی ہو کر ان افغانیوں کی بستی میں مقیم تھی آپ نے یہاں کے دوران قیام کا ایک واقعہ ایک روز درس

۱۷ اگست ۱۳۳۷ء سے مارچ ۱۳۳۷ء تک میرا تعلق ”اخبار الہدیٰ، لہریا سرے، دہلی، کی ادارت سے تھا اپریل ۱۳۳۷ء میں دادالعلوم غنیمہ کے نام سے اس کا ایک خاص شمارہ شائع کیا گیا اس میں بہت سے علماء موجودین و مروجین کے ترجمے بھی شائع ہوئے تھے میری درخواست پر اسٹاذ ختم مولانا نذیر احمد رحمانی نے مجھے اپنی زندگی کے حالات پر مشتمل ایک خود نوشت یادداشت مرحمت فرمائی تھی اس کی روشنی میں نے موصوف کا ترجمہ ترتیب دیا تھا جو آپس کے ملاحظہ سے گذرنے کے بعد دارالعلوم غنیمہ شائع ہوا تھا۔ رامپور اور بدایوں کی تمام تفصیلات اسی سے ماخوذ ہیں۔

ہیں بیان فرمایا جو دلچسپ ہونیکے ساتھ ساتھ پر مذاق بھی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک روز بعد نماز عصر میں کتابوں کے مطالعہ میں مشغول تھا کہ کچھ افغانی لڑکے کمرے میں داخل ہوئے اور مجھے مطالعہ میں مشغول دیکھ کر انتہائی حیرت سے بولے۔ آپ اسوقت مطالعہ کر رہے ہیں؟

آپ نے کہا آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟

یہ سن کر ایک افغانی نے انتہائی جوش کے عالم میں کہا۔

”کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خاص امام اعظم رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جو شخص بعد عصر مطالعہ کرے وہ کند ذہن ہو جاتا ہے۔“ مولانا کو انکی اس گفتگو سے حیرت ہوئی۔ لیکن ان اکھڑ مزاجوں سے

الجمہت کون؟ اس لئے آپ نے کتاب بند کر دی اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ ان حالات میں

آپ نے ایک سال ان کی صحبت میں گزارا غنیمت تھی کہ مدرسہ شمس العلوم میں اساتذہ کی

تقریریں اردو میں ہوتی تھیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس مدرسہ کا اہتمام ملک کے

نامور لیڈر جناب عبدالماجد بدایونی کے سپرد تھا (موصوف بعد میں پاکستان منتقل ہو گئے) اور

جب کبھی وہ مدرسہ میں تشریف لاتے تو مولانا سے بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔

دستار بندی اور سند فراغت دیتے وقت تو انھوں نے آپ کو بہت سی دعائیں بھی دیں۔ آپ کو

مدرسہ کی جانب سے جو سند دی گئی اس میں چند وصیتیں بھی ہیں آخری وصیت میں آپ کو تلقین کی گئی

ہے کہ ولایتی تعل حسب استطاعتہ فی اشاعت الاسلام واجیاء سنن الدین والرد علی

الکفرۃ و اھواء اھل الضلال من النیاسرة والرافضة والنجدیة وغیر المقلدین۔

یعنی ہم ان کو وصیت کرتے ہیں کہ یہ اپنی حسب استطاعت اسلام کی اشاعت اور دین کی استوں

کے احیاء میں مشغول رہیں نیز پیچروں، رافضیوں، نجدیوں اور غیر مقلدوں کی جو گمراہ فرتے ہیں

برابر تردید کرتے رہیں۔

بدایوں میں بدعتوں کا خاصا زور ہے مولانا عبدالماجد خود اپنے حلقہ کے پیر تھے ان

حالات میں آپ نے اتنے دنوں کس طرح گذر کیا یہ مولانا ہی سمجھ سکتے تھے۔ رہا وصیت کا معاملہ

تو اکھڑ لکھنؤ نے آپ کو خیر توفیق اور وسعت بخشی تھی اس کے مطابق درس و تدریس اور

تقریر و تحریر کے ذریعہ اشاعت اسلام اور احیاء سنت کی خدمت انجام دیتے رہے، نجدیوں اور رافضیوں کے خلاف ایسے ٹھوس اور مدلل مضامین لکھے جن پر آپ کو قارئین نے مبارک باد کے خطوط لکھے جن میں سے بعض میری نظروں سے بھی گذرے ہیں۔ اسی طرح جامد اور غالی مقلدین پر بھی آپ پوری طرح اتمام حجت فرماتے رہے، وصیت میں نجدیوں اور غیر مقلدین کے بارے میں بڑی بے انصافی کی گئی ہے اس لئے قرآن کی ہدایت کے مطابق آئیں اصلاح ضروری تھی کہ فمن خاف من موص بنفا واثما فاصلم بینہم فلا اثم علیہ

بدایوں سے فراغت کے بعد آپ مستقل طور

دارالحدیث میں مراجعت اور سند تدریس سے دارالحدیث رحانیہ دہلی میں اپنی سند

تدریس پر واپس آگئے اور اکتوبر ۱۳۵۷ء کے انقلاب تک جب تک دارالحدیث قائم رہا آپ بھی اس سے برابر وابستہ رہے۔ رحانیہ کی ۲۷ سالہ زندگی میں سے اگر آپ کی طالب علمی کے سالہ زمانہ کو وضع کر دیا جائے تو گویا مستقل طور پر آپ نے ۲۰ سال تک دارالحدیث رحانیہ دہلی کی خدمت کی ہے، مشغلہ درس و تدریس کے علاوہ اس دوران میں آپ کے فرائض میں رحانیہ کے عظیم و جلیل القدر کتب خانہ کی دیکھ ریکھ اور اس کی نگرانی بھی تھی۔ علاوہ ازیں دارالحدیث کا مشہور ماہنامہ ”محدث“ بھی اس کے ایڈیٹر مولانا عبدالحلیم ناظم صدیقی کے انتقال کے بعد آپ کی ادارت میں آگیا۔ اس وقت سے اخیر تک آپ برابر اس کے مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ آپ کی ادارت کے زمانہ میں اس میں دوسرے اہل قلم کے بیش قیمت منہاجین کے علاوہ آپ کے اثر انگیز اور دل گداز ادارے اور مختلف مسائل پر عبققانہ مضامین نے محدث کی قدر و قیمت کو بہت بڑھا دیا۔ آپ کی ادارت

بے آپ کا انتقال ۲۲ اگست ۱۹۳۵ء کو ہوا یعنی دو سال دو مہینہ کے بعد محدث کی ساری نگرانی مولانا الطوی مرحوم پر آگئی یوں ناظم جو کم کی علالت کے دوران بھی آپ ہی ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

کے زمانہ میں۔۔ محدث۔۔ کے اندر فتاویٰ کے باب کا اضافہ ہوا۔ استفسارات کے جواب میں حضرت مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی مدظلہ العالی کی جامع اور پُرانہ تحقیق نگارش نے اس رسالہ کی افادیت کو اس قدر وسیع کر دیا تھا کہ ایک موقع سے مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی مرحوم جیسے صاحب علم اور اہل قلم کو فرماتے ہوئے میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ

”وہیں جب تک محدث کے استفسارات اور ان کے جوابات پڑھ نہیں لیتا مجھے نیند نہیں آتی۔“ مولانا کے زمانہ میں جہاں دارالحدیث رحمانیہ کے کتب خانہ میں بیش قیمت علمی نوادرات اور طویل الفہرستہ پاروں کا اضافہ ہوتا رہا وہاں رسالہ محدث نے بھی بڑی ترقی کی مولانا کی مشہور تصنیف ”رد عقائد بدعیدہ“ کی تخلیق و تصویب محدث کے دوران ادارت ہی میں عمل میں آئی تھی بعد میں مزید اضافے کے ساتھ آپ نے اسے کتابی شکل دیدی۔

تعلیمی امور میں مولانا کی ہمہ گیر انتظامی صلاحیتیں مسلم تھیں، طلباء کی اخلاقی تربیت اور تعلیم کی دیکھ بیکھ جس طرح دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں آپ کے سپرد تھی اسی طرح جامعہ رحمانیہ بنارس میں بھی ان امور میں آپ کو پورا اختیار حاصل تھا اور سچی بات یہ ہے کہ آپ نے ان امور کو جس دل سواری، خلوص اور لگن کے ساتھ انجام دیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ **سبحن یم اللہ احسن ما کانوا یعملون** علیہ السلام۔

یہ ستمبر ۱۹۳۸ء میں آپ کے مربی اور محسن **شیخ عطار الرحمن کی وفات اور نئی ذمہ داریاں** | **آخاب شیخ عطار الرحمن نے جب آخرت کا سفر اختیار کیا تو دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے فرزندوں اور ہمدردوں پر کیا گزری؟** اس کے بیان کرنے سے قلم کی زبان قاصر ہے محدث کے جولائی ۱۹۳۸ء کے شمارہ میں مولانا نے اپنی قلبی واردات کو جن الفاظ میں قلمبند کیا ہے آج بھی اسے پڑھ کر نگھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔ ہم نے دارالحدیث کے افتتاح کے سلسلہ میں اور محدث کا جو اقتباس پیش کیا

ہے وہ مولانا کی اسی تحریر کا ایک حصہ ہے مہتمم دارالحدیث رحمانہ دہلی کی وفات کے بعد مولانا الطوی مرحوم اور مولانا مبارکپوری مدظلہ پر نئی ذمہ داریاں عائد ہو گئیں موصوف کی وفات کے وقت میں رحمانیہ میں زیر تعلیم تھا اس حادثہ فاجعہ کے بعد دارالحدیث میں دو ایک روز تعلیم بند رہی اس کے بعد شیخ عبدالوہاب اور شیخ حبیب الرحمن (سپران جناب شیخ عطار الرحمن مرحوم) رحمانیہ تشریف لائے صبح آٹھ بجے کا وقت رہا ہو گا پورے ماحول پر اسی طاری تھی، طلباء اور اساتذہ یکساں غم و اندوہ کا شکار تھے ان کے آتے ہی مدرسہ کا گھنٹہ بجا اور رحمانیہ کا مہتر نفیس خاموشی کے ساتھ شیخ الحدیث کی درسگاہ میں سمٹ آیا مولانا نے غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی ایک اثر انگیز تقریر کی جس میں طلبہ اور اساتذہ سے مرحوم کی شفقت اور محبت کا ذکر تھا ان سے فرزندوں اور عزیزوں کی طرح مرحوم کے برتاؤ کی یاد تھی ان کی لغزشوں اور معمولی معمولی غلطیوں پر مرحوم کے عفو و درگزر کئے تذکرے تھے مرحوم کے لوازش اکر ام کے نہ بھلائے جانے والے واقعات کا اعادہ تھا۔ آپ کی وفات سے مدت اسلامیہ کو جو صد مہینہ تھا اس کے واضح اشارے تھے اور مرحوم کے حق میں دعاء مغفرت معنی مغفرت مولانا کی اس تقریر نے ہر شخص کو آبدیدہ کر دیا شیخ عبدالوہاب اور شیخ حبیب الرحمن کی آنکھوں میں نیرتے ہوئے آنسوؤں کا منظر اب تک میری نگاہوں میں گھوم رہا ہے۔

مولانا کی تقریر کے بعد شیخ عبدالوہاب نے گلوگیر اور بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا ”اب صبر و شکر کے سوا چارہ نہیں ہم یہاں اس لئے آئے ہیں کہ کل سے مدرسہ کی تعلیم سابقہ معمول کے مطابق شروع کر دی جائے۔ میں مدرسہ کے لئے اتنا وقت تو نہیں دے سکتا۔ جتنا والد مرحوم دیا کرتے تھے لیکن کوشش کروں گا کہ ہر روز کسی نہ کسی وقت آکر یہاں کے انتظامات کی دیکھ بھال کیا کروں سابقہ معیار اور انتظام میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہونے دیجائے گی۔ انشاء اللہ“

اس کے بعد دعاؤں پر اس جلسے کا اختتام ہوا اور دوسرے دن سے رحمانیہ معمول کے

مطابق اپنے کام میں لگ گیا لیکن شیخ عبدالوہاب اپنی کاروباری مصروفیات سے اتنا وقت نہ نکال سکے کہ ہر روز رحمانیہ تشریف لاتے تیسرے چوتھے دن تشریف لاتے اس لئے مدرسہ سے متعلق ساری ذمہ داریاں مولانا مبارکپوری مدظلہ اور مولانا ایلوی مرحوم پر آپڑیں اور آپ حضرات نے اس بار کو اس طرح اٹھایا کہ دارالحدیث رحمانیہ کے معمول میں کوئی فرق نہ آنے دیا و ما تقد مولانا نفسکم من خیر تجدوا عند اللہ ہونجیروا عظم اجرا۔

اگست و ستمبر ۱۹۴۶ء میں دہلی کا ہولناک انقلاب دہلی دورا بتلار و آزمائش کے مسلمانوں کیلئے قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا اس وقت دہلی کے مسلمان جس مصیبت سے گزر رہے اس کا ایک مختصر سا خاکہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی مشہور کتاب - ”انڈیا وینس فریڈم“ یا اس کے ترجمہ - ”ہماری آزادی“ (شائع کردہ جامعہ ملیہ دہلی) میں دیکھا جاسکتا ہے۔ دارالحدیث رحمانیہ دہلی بھی اس انقلاب سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس سلسلہ میں میں نے دارالعلوم نمبر کیلئے مولانا کی اپنی سوانح حیات سے متعلق عنایت کی ہوئی تحریر کی بنیاد پر جو مضمون مرتب کیا تھا اور جو مولانا کے حوالے کے بعد شائع ہوا تھا اس کا اقتباس یہاں درج کر رہا ہوں۔

اگست ۱۹۴۶ء میں جب ملک تقسیم ہوا اور اس کے نتیجے میں دہلی کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی تو اس زمانہ میں مولانا دہلی ہی میں تھے مدرسہ کا اچھا اچھا سال شروع تھا۔ تعطیل کلاں کے بعد آپ مدرسہ پہنچ چکے تھے کیونکہ طلباء کے داخلہ کا کام آپ ہی کے ذمہ تھا دوسرے مدرسین ابھی نہیں پہنچے تھے۔ ستمبر کے شروع ہی میں مختلف حلقوں سے گڑ بڑ کی خبریں ملنے لگیں یہاں تک کہ ستمبر کو رات شب میں خود مدرسہ پر جنوبی طرف سے ہندوؤں نے خشت بارش شروع کی۔ مدرسہ کے لوگوں نے بھی اپنی مدافعت کی۔ دیر تک محسوس ہوئی

رہی۔ مدرسہ کا بچا ملک بند تھا۔ آپ دوسرے لوگوں کے ساتھ مدرسہ کی بھرت
 پر تھے اور وہیں سے مدافعت کر رہے تھے۔ نعرہ نگیری کی صدا سنکر ملیٹری پہنچ
 گئی۔ اس نے مدرسہ کے باہر ہی سے کئی مرتبہ اشک اور گیس چھوڑی گولیاں چلائیں
 مگر احمد لنگر کوئی زخمی نہیں ہوا۔ جب ہنگامہ فرو ہو تو آپ عشاء کی نماز
 مکمل کر کے مسجد تشریف لے گئے جو مدرسہ سے قریب مگر اس کے احاطہ سے باہر
 تھی۔ آپ کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ یہ لوگ نماز سے جوں ہی فارغ ہوئے
 مسلح پولیس پہنچ گئی اور اس نے مسجد کو گھیر لیا۔ محلہ کے کچھ دوسرے آدمیوں کی
 گرفتاری بھی ہوئی۔ سب پولیس لاری میں بٹھا کر تھانہ پہنچایا گیا۔ تھانہ
 والے شہر کے ہنگاموں کی وجہ سے اس قدر مصروف تھے کہ ان کو ان اسیران
 بلا کے متعلق ضابطہ کی کوئی کارروائی کرنے کی فرصت ہی نہ ملی چنانچہ دوسرے
 دن ۸ بجے صبح کو ان لوگوں کے پتے وغیرہ لکھے گئے اور پھر یہ لوگ دو پہر کے
 بعد حوالات میں بند کئے گئے۔ سنا ہے کہ ۲۴ گھنٹے سے زیادہ حوالات
 میں رکھنے کا قانون نہیں ہے۔ لیکن یہ لوگ تین روز تک حوالات ہی میں
 رہے۔ حوالات کی لمبائی زیادہ سے زیادہ چار گز اور چوڑائی ڈھائی گز
 رہی ہوگی۔ شہر میں برابر گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور سب کو اسی میں لاکر بند
 کیا جا رہا تھا۔ گھرہ بالکل بھر گیا۔ ۲۴ گھنٹوں میں صرف ایک مرتبہ صبح کے وقت
 فصلے حاجت کیلئے باہر نکالا جاتا تھا۔ پیشاب کیلئے ایک مٹی کی چھوٹی سی
 ٹانڈر رکھی ہوئی تھی جو پیشاب سے بھر جاتی تھی تو سارا گھرہ گندہ اور متعفن ہو
 جاتا تھا۔ تین دن میں صرف ایک وقت حوالاتیوں کی چیخ پکار کے بعد
 پولیس نے انہیں چنے ایال کر کھانے کو دیا۔ طلبہ بیچارے صبح کے وقت جب
 گھرہ کھلتا تھا تو کچھ روٹیاں پہنچا جاتے تھے۔ مگر دوسرے حوالاتیوں کے
 گھرہوں سے کچھ نہیں آتا اس لئے وہ سب بیچارے بھی بھوکے تھے ابھی چند

روٹیوں کو ٹکڑے ٹکڑے بانٹ کر تسکین کر لیا کرتے تھے۔

”ایسی گندی اور بدبودار جگہ میں آپ کو لیٹنے کی ہمت نہ ہوتی جب نیند کے غلبے سے مجبور ہو جاتے تھے تو ایک کونے میں ٹیک لگا کر سہارا لے لیا کرتے تھے اور کچھ دیر تک غفلت ہو جاتی تھی۔ حوالاتیوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس سے پہلے جیل جا چکے تھے اور وہاں کی زندگی کا تجربہ رکھتے تھے انھوں نے آپ سے کہا کہ مولوی صاحب تھا نیدار سے کہنے کہ ہم لوگوں کو جیل بھیج دیا جائے وہاں آرام رہے گا چنانچہ سب لوگوں نے باتفاق اور باہر ارمطالہ کیا کہ ہم کو یہاں سے نکال کر جیل بھیج دیا جائے۔ اس کے بعد سب کو وہلی سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔“

”ایک مہینہ کے بعد جب عدالتیں کھلیں تو ان زندانیوں کا مقدمہ پیش ہوا۔ عدالت کے سامنے جب آپ اٹھ گئے تو اس نے آپ کا نام لے کر کہا کہ آپ پر چھپندہ دُور کے قتل کا الزام ہے۔ اتنا کہہ کر عدالت خاموش ہو گئی اور آپ بھی چپ رہے۔ دوسرے دن کی خاموشی کے بعد عدالت نے خود کہا ”لیکن پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس لئے میں آپ کو بری کرتا ہوں۔ تھکڑیاں کھول دی جائیں،“ چنانچہ آپ کے ہاتھوں کی تھکڑیاں کھول دی گئیں اور محبڑیٹ کے اشارہ سے آپ ایک کمرے پر بیٹھ گئے۔“

ربانی کے بعد جب آپ مدرسہ سپینچے تو معلوم ہوا کہ مہتمم صاحب مدرسہ اور اس کے کتب خانہ کو جامعہ ملیہ کے حوالہ کر کے مع اہل و عیال لکھنؤ چلے گئے۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد جامعہ کی لائبریری آئی اور کتابیں بھر بھر لگائی۔

اوپر کی تحریر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ذمہ داروں میں مولانا مرحوم ہی کی ایک ہستی ایسی تھی جو اس اجڑے اور لٹے ہوئے گلستانِ علم و فن پر آنسو بہاتی۔ ان شائد وضا

میں تپ کر مولانا کی امانت و دیانت اور نکھر گئی۔ آپ کا یہ حال تھا کہ پورے کتب خانہ کو از اول تا آخر جامعہ کے سپرد فرما دیا۔ اگر کسی نے کام کی کوئی کتاب یا کاغذ کا کوئی ٹکڑا رکھنا چاہا اور آپ کو اس کی خبر ہو گئی تو بڑی سختی کے ساتھ اس حرکت سے روک دیا۔ گویا اس وقت آپ ان اللہ یا مدد کمران تو دوا الامنت الی اہلہا کی پوری عملی تفسیر تھے۔

رہائی کے بعد دارالحدیث رحمانیہ کی خانہ ویرانی کو آپ کس دل و جگر سے دیکھتے؟ اس کا بچپن، شباب اور اس کی اخیر دور کی تمام بہاریں آپ کے سامنے گذری تھیں یہاں آپ نے اپنی عمری تعلیم کا ابتدائی دور بھی گزارا تھا، وسط دور بھی اور اخیر زمانہ بھی، اس کے ذرے ذرے سے آپ کو محبت تھی اس لئے اسیری سے رہائی کے بعد اپنے گھر میں اجنبی بن کر رہنا کیسے گوارا ہوتا۔ مجبوراً آپ نے دھڑکتے دل اور نمناک آنکھوں کے ساتھ اسے الوداع کہا اور گھر جانے کے لئے روانہ ہوئے۔ اللہ کی جانب سے آپ کا جسمانی اور ذہنی امتحان تو ہو چکا تھا مگر ابھی مالی امتحان باقی تھا۔ ایک دن سب سامان لیکر اسٹیشن پہنچے تو ریلوے افسران نے کہا کہ آگے کا راستہ محفوظ نہیں ہے ٹرینیں لوٹ لی جاتی ہیں اور مسافروں کو قتل کر دیا جاتا ہے اس لئے ٹکٹ نہیں ملے گا۔ مجبوراً مدد سوا پس آنے کے لئے ایک تانگہ پر سامان بار کیا اور اسٹیشن سے واپس ہوئے۔ تانگہ والا شاید گنڈوں سے مٹا ہوا تھا واپسی میں وہ آپ کو اسٹیشن سے کہنی باغ لایا جہاں گنڈوں نے آپ کو گھیر لیا اور چشم زون میں سارا سامان لوٹ لیگئے۔ اس طرح تباہی کی رہی سہی داستان پوری ہو گئی اور آپ کے پاس بدن کے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا۔

ایک مہینہ کے بعد جب ٹرینوں میں مسلمانوں کے لئے ڈبے مخصوص کئے گئے اور حفاظتی پولیس کا انتظام ہو گیا تب آپ نومبر ۱۹۴۶ء میں اپنے وطن واپس پہنچے۔

مولانا کو ایک دوسری آزمائش سے اس وقت گذرنا پڑا
ایک دوسری آزمائش | جب جامعہ رحمانیہ مدنی پورہ بنارس میں تدریسی خدمات

خدمات انجام دے رہے تھے۔ کئی دشمن کی غلط اطلاع پر حکومت نے آپ کو پاکستانی قرار
 دیکر آپ پر کسٹوڈین میں مقدمہ دائر کر دیا۔ حالانکہ متحدہ ہندوستان میں بھی آپ کو شہر
 کئی ان علاقوں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا جو آج پاکستان کے زیر نگین ہیں۔ تقسیم کے
 بعد پاکستان جانا تو بہت دور کی بات تھی مولانا پر اگر پاکستان جانے کا الزام ثابت
 ہو جاتا تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہوتا کہ آپ کا مکان جائیداد اور باغات سب کی
 مالک حکومت ہو جاتی اور نیلام پر چڑھا کر ابھینے اور پونے فروخت کر دیا جاتا اس کے
 علاوہ آپ پر وطن دشمنی کا داغ الگ سے لگ جاتا۔

اعظم گڑھ میں کسٹوڈین عدالت اندورن شہر ایک عظیم کوٹھی میں قائم تھی اس عدالت
 میں پبلک کیسوں کے خاص پیروکار ایک مشہور وکیل شاہ عبدالخالق مرحوم تھے مولانا کا کیس بھی انھیں
 کے سپرد تھا، حاکم ایک دیوبندی سندھی تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ جلاوطنی کی زندگی گزارنے
 کے باعث وہ اعصابی اور ذہنی تناؤ کا شکار ہے اور کسی مسلمان کے حق میں اس نے تعصب
 سے بری ہو کر حتیٰ والفاظ کے مطابق کبھی کوئی فیصلہ نہیں دیا۔

دہلی کی واپسی کے بعد سے تاریخ مقدمہ تک مولانا کو اپنے ہندوستان میں رہنے کا ثبوت
 دینا تھا یعنی ۱۹۵۳ء تک ہندوستان میں رہنے اور اس سے باہر نہ جانے کا ثبوت
 آپ کے ذمہ تھا۔ چھ سات سال کی طویل مدت یہ ثابت کرنا کہ اس پورے زمانہ میں آپ
 نے ایک دن کیلئے بھی ملک نہیں چھوڑا۔ کس قدر دردِ دوسری کی بات تھی؟ لیکن مولانا اس
 مشکل کے وقت بھی ثابت قدم رہے۔ آپ نے عدالت میں گیارہ سو سے زیادہ خطوط

منی آرڈر کی ابتدائی اور واپسی کی رسیدیں اور دوسرے ثبوت کے کاغذات اتنی دافر
 مقدار میں پیش کئے کہ حاکم کے ہوش اڑ گئے ان خطوط میں ملک کی مشہور ہستیوں سے لیکر

غیر معروف لوگوں تک کے خطوط تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک خط جب عدالت کو پڑھا کر سنایا گیا تو اس نے کہا کہ اس مقدمہ میں ثبوت کے جو کاغذات داخل کئے گئے ہیں ان سے ان چھ سات سالوں کی ملک کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں ان تمام اہم کو پڑھوں لیکن میں اردو سے ناواقف ہوں اس لئے اصل کے ساتھ ان تمام کاغذات کے انگریزی یا ہندی ترجمے بھی داخل عدالت ہوں۔

راقم الحروف کو بھی اس مقدمہ میں بطور گواہ پیش ہونا تھا اس لئے کہ مولانا مسٹر کو میں ایک سال تک دارالعلوم احمدیہ سلفیہ میں مقیم رہ چکے تھے۔ وہاں کا رجسٹر حاضری، رجسٹر قبض الوصول اور معائنہ کا وہ رجسٹر جس پر اسلامک اسٹڈیز صوبہ بہار کے رجسٹرار کے معائنہ کے وقت کے دستخط تھے سب داخل عدالت تھے اور میں اس وقت سلفیہ میں ملازم تھا۔ مولانا نے مہتمم سلفیہ کو لکھا کہ تاریخ مقدمہ سے دو روز پیشتر مجھے ان رجسٹروں کی تصدیق کیلئے بھیج دیں۔ اس طرح وہاں سے میں آیا۔ بنارس سے ماسٹر عبد الحمید صاحب جو بنوری جامعہ رحمانیہ کے بہت سے کاغذات لیکر پہنچے۔ اس طرح عدالت پر کاغذات اور گواہوں کی ایک بیلغہ ہو گئی اور حاکم جیران و ششدر ہو کر کہنے لگا کہ آج تک میرے سامنے ایسا کوئی کیس نہیں ہوا جس میں اتنے ثبوت پیش کئے گئے ہوں۔

حاکم نے اپنے فیصلہ میں مولانا کو ان پر لگائے گئے الزام سے بے باغ بری کوایا اور مولانا اس دوسری آزمائش سے بھی بحمد اللہ پوری طرح کامیاب ہو کر نکلے۔ زندگی کے یہ دو واقعات آپ کی زندگی میں بڑے دشوار گزار، پریشان کن اور اضطراب انگیز تھے لیکن جب خدا کی امداد شامل حال ہو تو دیکھتے ہوئے انگارے اور بھڑکتی ہوئی آگ بھی گلزار بن جاتی ہے۔ ان حالات میں جس طرح رحمت خداوندی نے آپ کی دستگیری کی اس پر بے اختیار دل سے اللہ کی تعریف اور اس کی سپاس گزاری کی دعائیں نکلتی ہیں۔

وطن کی واپسی اور بریکاری | نومبر ۱۹۴۷ء میں جب آپ دہلی سے وطن واپس آئے تو

تقریباً ایک سال تک گھر رہے۔ یہاں کوئی علمی مشغلہ نہیں تھا اس لئے یہ وقت بیکاری میں گذرا آپ کے برادر نسبی نے ہمدرد کی کھینچی لے رکھی تھی آپ کا بیشتر وقت اسی میں گذرتا تھا اور آخر ۱۹۶۸ء میں جناب ڈاکٹر سید محمد فرید صاحب مرحوم کی خواہش اور طلبہ پر آپ دارالعلوم احمدیہ سلفیہ تشریف لے گئے اور دسمبر ۱۹۵۹ء تک یہاں درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے پھر جنوری ۱۹۵۵ء سے جامعہ رحمانیہ بنارس تشریف لائے تو اخیر عمر تک اسی سے متعلق رہے۔ یہاں تک کہ ۲۰ مئی ۱۹۶۵ء کو جان جان آفریں کو منیپ دی۔

تعلیم کی خصوصیات مولانا کی زندگی علم دین کی خدمات کیلئے وقف تھی آپ کے تربیت یافتہ علماء ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں ان میں کتنے ایسے ہیں جن کے زور بیان اور خطابت کا سکھ ہر طرف جما ہوا ہے۔ کتنے ایسے ہیں جو صاحب قلم اور اچھے انشا پرداز و اہل تحریر ہیں۔ نہ معلوم کتنوں نے مسند درس و تدریس کو زینت دی رکھی ہے۔ کتنے صاحب مخراب و منبر ہیں کچھ صاحب تصنیف و تالیف بھی ہیں۔ یہ سب آپ کی لہبیت اور خلوص کا کرشمہ تھا کہ ۱۳ سال کی تدریسی زندگی میں آپ نے اتنے اہل علم اور صاحب فضل و کمال پیدا کئے آپ کی تعلیم کی خصوصیات میں یہ بات داخل تھی کہ طلباء کو ہمیشہ مطالعہ کی تاکید فرماتے، اگر طلباء دوران درس جاندار سوالات نہ کریں تو بڑے کبیوہ خاطر ہوتے اور یہ سمجھتے کہ یہ لوگ مطالعہ نہیں کرتے، ان کی عبارتوں پر خاص توجہ دیتے جمال نہیں کہ کوئی طالب علم غلط عبارت پڑھ کر آگے بڑھ جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت پر خاص نگاہ رکھتے راتوں کو ان کے مطالعہ اور کتب بینی کی نگرانی فرماتے۔ دوران درس اگر کسی طالب علم کے بارے میں یہ محسوس ہوتا کہ وہ استاد کی تقریر کی طرف دھیان نہیں دیتا تو سرزنش کے ساتھ ساتھ لبا اوقات اسے جسمانی سزا دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ہمیشہ یہ کوشش فرماتے کہ کتاب کا کوئی گوشہ نشہ نہ تشریح نہ رہ جائے اور طلباء

پوری طرح کتاب کو سمجھ کر سب سے اچھے۔ حدیث و تفسیر کے اسباق میں مذاہب اور ان کے مآر و ماخذوں کی تشریح کے ساتھ صحیح مذاہب کے دلائل ہمیشہ بیان فرماتے۔ طلباء کے لباس و وضع قطع اور نماز باجماعت کی حاضری پر ہمیشہ آپ کی نظر پڑا کرتی تھی اور ان باتوں کے لئے ہمیشہ انھیں تہناتیں کیا کرتے تھے۔ غرضیکہ مولانا ایک شیخ مری اور تہنات اندیش استاد کی حیثیت سے ہمیشہ طلباء کی نگرانی فرمایا کرتے اور ان کی فلاح و کامرانی میں برابر کوشاں رہتے۔

تقریر و تحریر آپ کی تقریریں بلا کی اثر انگیزی تھی جو بات کہتے دلوں میں اترتی جاتی زور و بیان ایسا کہ سننے والے دم بخود رہ جاتے۔ اظہار حق میں کبھی آپ نے ممانعت نہیں کی نہ تو طاعت گروں کی ملازمت کا ڈر اور نہ کسی کی خوشی اور ناخوشی کی پسند و نپیروں کے بھرے ٹھوں میں اظہار حق سے باز نہ رہتے۔ مدارس کی مسجد المجدین میں جب آپ نے پہلا خطبہ دیا تو مسجد پر اور سنجیدہ لوگ کہنے لگے کہ تقریریں تو بہت سی سنی ہیں لیکن مولانا کا انداز بیان جداگانہ اور نرالا ہے۔ ایسی تقریر زندگی میں پہلی بار سننے کا اتفاق ہوا ہے۔

مولانا لکھنؤ کی دینی تعلیمی مجلس کے ممبر تھے۔ علی میاں مولانا منظور نعمانی قاضی عدلیہ دہلی اور دوسرے نامور اہل علم کے ساتھ آپ بھی اس کی نشستوں میں شریک ہوتے رہے۔ بچوں کیلئے ابتدائی لفظ اب تعلیم کی ایسی کتابوں کی تصنیف کا مسئلہ درپیش تھا جو سب کے لئے قابل قبول ہوں۔ بات یہ چل رہی تھی کہ دنیات کی تصنیف کس ٹھنک سے کی جائے؟

کسی ممبر نے مشورہ دیا کہ دیوبندی عقائد کے مطابق انھیں لکھوایا جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ اس میں تمام مذاہب کی نمائندگی نہیں ہوتی اس لئے یہ کتابیں دوسرے اہل مذاہب کے لئے قابل قبول نہ ہونگی۔ اس پر یہ ترمیم پیش ہوئی کہ دوسرے مذاہب

کی باتیں حاشیہ پر لکھ دی جائیں ۔

مولانا نے فرمایا کہ سب سے بہتر یہ ہے کہ کتابیں قرآن و سنت کے مطابق لکھوائی جائیں اور بعد میں دوسرے مکتبہ فکر کی وضاحت اس کے حاشیہ پر کر دی جائے ۔ بالآخر بات اس پر ختم ہوئی کہ ہر مکتبہ فکر کو آزادی دیدی جائے کہ وہ اپنے مسلک کے مطابق اپنی کتابیں تصنیف کر کے داخل انصاب کر لے ۔

مولانا کی تحریر بھی بڑی دلگداز اور پراثر ہو ا کرتی تھی ۔ زیر نظر کتاب سے ناظرین آپ کے اندر تحریر کا بخوبی پتہ چلا سکتے ہیں ۔ اس کے علاوہ مولانا کی متعدد دیگر تصنیفات ہیں ۔ تراویح سے متعلق آپ کی معرکہ الا تصنیف ایسی مسکت دندان شکن اور پراز معلومات ہے کہ اس بحث کو آپ نے آخری حد تک پہنچا دیا ہے ۔

اس کے علاوہ ” رد عقائد بدعیہ “ اپنے موضوع پر ایک نرالی کتاب ہے جب آل انڈیا المذہب کا نفرنس میں بچوں کی درسی کتابوں کی تصنیف کا مسئلہ پیش ہوا تو یہ خدمت آپ کو سوچی گئی ۔ آپ نے ” چھن اسلام کے متعدد حصوں کو رمضان کی تعطیل میں مرتب فرما کر اسے کانفرنس کے حوالے فرما دیا ۔ اور احتیاط یہ کہ مصنف کی حیثیت سے آپ کا نام کہیں نہ آنے پلے ۔ جس زمانے میں آپ اس کی تصنیف فرما رہے تھے مجھ سے فرمایا کہ بچوں کے معیار کے مطابق کچھ نظمیں لکھوں تاکہ ان کو شامل کتاب کیا جاسکے ۔ میں نے چند نظمیں آپ کی خدمت میں پیش کیں ۔ فرمایا کہ اس کی زبان بچوں کے مستیاء کچھ بلند ہے لیکن مضائقہ نہیں ۔ دو نظموں کو آپ نے تیسرے حصہ میں شامل فرمالیا اس حصہ کے ابتداء کی حمد و نعت آپ ہی کی فرمائش پر لکھی گئی تھی ۔

مولانا کی تحریر حشو و زوائد سے پاک ہوا کرتی تھی ۔ جب کسی کی بات کی گروت کر تھے تو اس کے فرار کے تمام راستے مسدود ہو جایا کرتے ۔ تردید میں دلائل کے انہار لگا دیتے تھے اور تمام وللیں مستند اور معتبر ہوا کرتی تھیں ۔ حوالوں میں بڑی احتیاط

برتنے۔ کسی کی کوئی بات کسی دوسرے شخص کی تحریر سے ثبوت میں پیش کرنی ہوتی توجہ
 تک اصل مرجع سے اس کا مقابلہ نہ کر لیتے مطمئن نہ ہوتے ایک مرتبہ ایک بڑے مصنف
 کے پاس میں فرمایا کہ ان کے حوالوں پر مجھے اعتماد نہیں ہے۔ بار بار کے تجربوں کے بعد
 اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ تم بھی اصل سے مقابلہ کے بغیر ان کے حوالوں پر اعتماد نہ کرو۔
 غرضیکہ مولانا اپنی خصوصیات کے اعتبار سے یگانہ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔
 بھٹے بار بار فرمایا کہ جب کسی کے رد میں مجھے کوئی جوابی مضمون لکھنا ہوتا ہے تو جب
 تک تمام دلائل نہ لکھ لوں مجھے چین نہیں آتا۔ مختصر الفاظ میں ایسا ٹھوس، معقول اور
 دندان شکن جواب دیتے کہ آپ کی فادرا لکھامی پر حیرت ہوتی۔

حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق مولانا کے بہت سے قیمتی مضامین
 ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے دارالحدیث رحمانہ دہلی
 کا مائنامہ رسالہ محدث الحرم ۱۳۵۳ھ مطابق مئی ۱۹۳۳ء سے ستمبر ۱۹۳۴ء تک ہر شائع
 ہوتا رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں جب کاغذ کی نایابی شباب پر پہنچ گئی تو مجبوراً
 جنوری ۱۹۴۳ء سے اس کی اشاعت ملتوی کر دی گئی پڑی۔ پھر جب حالات کچھ سادہ کار
 ہوئے تو اپریل ۱۹۴۶ء سے اس کی اشاعت دوبارہ شروع ہوئی اس میں مولانا کے قلم
 سے جو مضامین شائع ہوئے ان کی جامعیت اور فادیت کا فیصلہ ناظرین خود فرما سکتے
 ہیں۔ دارالعلوم احمدیہ سلفیہ درمکنجہ میں قیام کے دوران آپ نے الہدیٰ کی خدمت
 بھی کی ہے اس میں کتنے مضامین ایسے ہیں جن پر موصوف کا نام نہیں ہے مثلاً
 ۱۴ مئی ۱۹۴۹ء کا اقتاجہ بعنوان ”تذکار شہیدان اور الحدیث“، یا ۱۶ مئی
 ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں فقہ شتر اکیت کے عنوان سے جو مضمون شروع ہوا ہے
 اور پانچ قسطوں میں اختتام پذیر ہوا ہے وہ بھی آپ ہی کا لکھا ہوا ہے۔

ملک کے دوسرے اخبارات و رسائل مثلاً ”زندگی“، رام پور اخبار ”مدینہ بخیر“

”مصحح ششہنیاں“ ”الصفات“ ”الہ آباد“ ”مرحوم“ ”المحدث“ ”امر تسر“ موجودہ“
 الیحدیث ”دہلی“ ”ترجمان“ ”دہلی“ ”الاعتصام لاہور“ ”اخبار“ ”محدثی“ ”مرحوم وغیرہ میں بھی
 وقتاً فوقتاً آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

انقلابِ اسلامی کے بعد جماعتِ اہلحدیث کا واحد تبلیغی ادارہ ”آل انڈیا
 جماعتی درود“ اہلحدیث کا نفرنس“ ”انخطاط کی زد میں آگیا۔ تقسیم کی وجہ سے جماعت
 کے بہت سے جید علماء ہندوستان سے کٹ گئے جو لوگ یہاں رہ گئے تھے ان میں سے
 بھی بہت سے لوگ ترک وطن کر کے پاکستان کے شہری بن گئے دہلی کا شہر جو جماعت
 کا علمی گہوارہ تھا تقریباً بل ذکر علماء سے خالی ہو گیا۔ یوپی اور بہار وغیرہ میں چند گنی چنی
 شخصیتیں رہ گئی تھیں۔ اس لئے کانفرنس بھی انخطاط کا شکار ہو گئی سالہا سال تک اسکی
 تمام سرگرمیاں موقوف رہیں بالآخر مولانا اور آپ کے کچھ رفقاء نیز حضرت مولانا عبدالباقی
 اردوی مظلہ کو کانفرنس کے احیاء کا خیال پیدا ہوا۔ کافی جدوجہد کے بعد اس کا دستور اساسی مرتب
 ہوا۔ ممبر سائیاں ہوئیں نئے انتخابات عمل میں آئے اور حرکت و عمل کے آثار پیدا ہوئے
 مولانا نے اس سلسلہ میں زبان و قلم اور دوا و دوش سے کانفرنس کی جو خدمتیں انجام دی ہیں
 ان کی تفصیلات ایک مستقل عنوان کی طالب ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ کو جماعت کا جتنا
 درد تھا۔ اور اجتماعی حیثیت سے عملی جدوجہد کے آپ جتنے خواہشمند تھے۔ اب وہ درد
 اور خواہش دوسروں میں بہت کم نظر آتی ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ ۳۷ مئی ۱۹۷۷ء کو جب ”صوبائی جمعیت اہلحدیث یوپی“ کا
 انتخابی اجلاس بنارس میں ہو رہا تھا عین کارروائی کے دوران مولانا کی خطرناک علالت
 کی اطلاع بذریعہ ٹیلیفون و ٹیلیگرام بنارس پہنچی اور مقامی و غیر مقامی تمام شرکاء
 انتخابی کارروائی کو تشنہ چھوڑ کر بسوں اور ٹرکیوں کے ذریعہ آپ کے وطن الطور و انداز
 ہو گئے۔ بالآخر اسی دن آپ کا وصال ہو گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کو مرکزی دارالعلوم کے قیام سے جو لگاؤ
مرکزی دارالعلوم اور نصاب تعلیم کمیٹی تھا اسکی عکاسی ہمارے جیلہ امکان سے باہر
 ہے نہ معلوم جمعہ کے کتنے خطبات میں آپ نے اس کی ترغیب و تحریص دلائی۔ اس کی ٹینگوں
 میں برابر شریک ہوتے رہے اس سے متعلق شائع ہونے والے تمام پوسٹر اشتہارات اور اعلانات
 آپ کی نگاہوں سے گذرتے۔

مولانا مرکزی دارالعلوم کی نصاب تعلیم کمیٹی کے کنوینر تھے اور سخت علمائے کرام کے باوجود
 اس کی پوری نشستوں میں شرکت فرمایا کرتے، تکلیف کی وجہ سے بیٹھنا دو بھر ہوتا لیکن تکلیف
 کے سہارے لیٹ کر اسکی کارروائی میں حصہ لیتے۔ اس طرح آپ کی سرکردگی میں دارالعلوم
 کا پہلا نصاب تعلیم مرتب ہوا۔

مولانا کی علالت بہت پہلے شروع ہوئی، بیماری کی پہلی تکلیف
علالت اور وفات اس وقت محسوس ہوئی جب آپ رمضان کی تعطیل میں گھر
 تھے۔ پھر کچھ افاقہ ہو گیا۔ تعطیل ختم کر کے جب آپ عازم بنارس ہوئے تو راستہ میں پھر یہ
 تکلیف عود کر آئی۔ ایک جانب کے پہلو میں شدید قسم کا درد اٹھتا جو آپ کو بے چین بنا دیتا
 سینکے اور مالش کرنے سے کمی پڑ جاتا کرتی تھی۔ بنارس میں یونانی اور ایلوپیتھک علاج بڑے بڑے
 ہوتا رہا۔ جامعہ رحمانیہ کے سرپرستوں نے مولانا کے علاج و معالجہ کے سلسلہ میں جو خدمات
 انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں اللہ ابھین اسکا اجر دے۔

علاج کے ساتھ ساتھ مرض بڑھتا گیا۔ جامعہ رحمانیہ کے طلباء اور اساتذہ بیشتر اوقات
 آپ کی خدمت میں حاضر رہتے اور آپ کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے۔ جب بیماری نے بہت
 طویل کھینچا تو لوگوں کی رائے ہوئی کہ آپ کو ہندو یونیورسٹی کے سرسندھ ہسپتال میں داخل
 کر دیا جائے۔ اس کے لئے ایک پرائیویٹ کمرہ لیا گیا اور مولانا کو کار کے ذریعہ وہاں پہنچایا
 گیا۔ ڈاکٹروں نے پہلے ہی سعاتہ میں شب بظاہر کیا کہ آپ کو کینسر کی شکایت ہے یہ سنکر

لوگوں کے ہوش اڑ گئے۔ بہر صورت وہاں علاج ہوتا رہا۔ ڈاکٹروں نے آپ کے آپریشن کی تجویز رکھی اور آخر وہ تاریخ آگئی جب مولانا کا آپریشن ہونا تھا۔ آپ کو آپریشن کے ٹھیکڑوں میں لیجا یا گیا اور گھنٹوں کے بعد واپس لایا گیا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد لوگوں میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ مقام ماؤنٹ کوکھول کو ڈاکٹروں نے آپ کا مرض دیکھا اور کسی عمل جراحی کے بغیر اسی طرح ٹانگے لگا دیئے۔ اس لئے کہ مرض لا علاج حد تک ترقی کر گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مولانا آپریشن کا زخم بھرنے تک ہسپتال کے نرسنگ ہوم میں زیر علاج تھے جب ڈاکٹروں نے جانے کی اجازت دیدی تو آپ دارالاقامہ منتقل ہو گئے نقاہت اور کمزوری حد سے زیادہ تھی کچھ دنوں دارالاقامہ میں رہنے کے بعد آپ اپنے وطن آنے کے لئے پریشاں ہو گئے۔ آپریشن سے لیکر گھر آنے تک آپ کو آپ کے مرض کی اطلاع نہیں دی گئی کہ مبادا آپ کی پریشانی بڑھ جائے۔ ویسے ملاقات کیلئے انہوں نے مختلف حضرات کی زبانی آپ کو معلوم ہو گیا کہ میرا مرض ڈاکٹروں نے کینسر بتایا ہے اور بغیر کسی عملی جراحی کے مجھے ہسپتال سے رخصت کیا گیا ہے۔ ہسپتال کی ایمبولنس کار کے ذریعہ آپ کو راتوں رات بنارس سے گھر لایا گیا اور چند ہی دنوں کے بعد آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا اللہ اعلم

مولانا نے اپنی زندگی میں تین شادیاں کیں پہلی شادی کاٹھ ترلوں شادی اور اولاد ہوئی جس کا ریلوے اسٹیشن بلنہرا روڈ ہے جو بھٹنی کی لائن میں سو سے تین چار اسٹیشن آگے ہے اس شادی سے مولانا کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو سات آٹھ سال کی ہو کر انتقال کر گئی اس بیوی کے انتقال کر جانے کے بعد دوسری شادی بھوجا پور ہوئی۔ جو ضلع غازی پور کا ایک موضع ہے اور اس کا اسٹیشن پیسری ڈیہ ہے اس شادی سے بھی ایک لڑکی تھی جس کا نام زیب النساء تھا لیکن یہ بچی بھی کم عمری ہی میں انتقال کر گئی یہ بیوی خوش آئند شامانہ ہو سکی اس لئے مولانا نے طلاق دیکر اسے علیحدہ کر دیا۔ تیسری شادی گاؤں میں شیخ عبدالرحمن کی لڑکی صاحبہ خانوں سے ہوئی جو اب تک بقید حیات ہیں ان

مولانا کی تین اولاد ذریعہ اور لڑکیاں ہیں لڑکوں کے نام علی الترتیب آفتاب احمد، ہلال اور نہال احمد ہیں بڑی لڑکی کا نام عابدہ خاتون اور چھوٹی کا ریشہ خاتون ہے۔ آفتاب احمد سونائے بھنجی میں ایک جگہ ملازم ہیں اور نہال احمد تحصیل جانش کیلئے دوکاندار ہیں مصروف۔ البتہ ہلال احمد جاسو اسلامیہ مدینہ منورہ سے فراغت کے بعد جامعہ ہی کے تبلیغی مشن پر پیجیر یا رافریقہ میں مامور ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں مولانا کا صحیح جانش بنائے۔ آمین

زید و تقویٰ حق کوئی و بیباکی پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ مولانا بڑی شدت کے ساتھ سنت کی پابندی فرماتے تھے۔ کتاب و سنت کی خلاف کوئی بات گوارہ نہ کرتے فرائض و احکامات و سنن کی رعایت میں ہمیشہ سبقت فرماتے ہیں دسیوں سال سے زیادہ سفر و حضر میں آپ کی خدمت کی ہے اور آپ کے ساتھ رہا ہوں بلکہ فارسی کے کچھ حصہ کی تعلیم سے لیکر عربی کی تکمیل تک مجھے آپ کی شاگردی کا فخر حاصل ہے جامعہ رحمانیہ بنارس میں مذریعی خدمات انجام دیتے وقت بھی میں مولانا ہی کے سایہ عاطفت میں رہا۔ اس لئے میں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ آپ کے اندر ایمانی حرارت اور دینی گرمی اتنی زیادہ تھی کہ لوگ آپ کے سامنے جاتے گھبراتے تھے آپ کی شخصیت بڑی پرواقار تھی، گم کوئی عادت میں داخل تھی مگر حجب کوئی ناگواریات دیکھتے یا سنتے تو خاموش نہ رہ سکتے اور کھل کر اس کی مذمت کرتے اتباع حق ہی ایک مسلمان کی سب سے بڑی سعادت ہے اس لئے مولانا جیسا استقی اور پرہیزگار مشکل سے ملیگا۔

مولانا کی حق کوئی و بیباکی کے بہت سے واقعات ہیں ان تمام کی تفصیل طوالت کا سبب ہوگی اس لئے صرف ایک بات کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں۔ مولانا حفظ الرحمن کے انتقال پر بنارس میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ صدر مولانا عبدالمبین صاحب مرحوم رئیس بنارس تھے مقررین میں ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگ تھے اس لئے یہ جلسہ ہر فرقہ کا نمائندہ جلسہ تھا۔

ایک مقرر نے مولانا حفظ الرحمن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جنگ آزادی سے متعلق دارالعلوم دیوبند کی طرف کچھ غلط باتوں کا انتساب کیا۔ اس کے بعد مولانا کی باری تھی آپ نے جنگ آزادی کی پوری تاریخ ادھر لکھ رکھی، اور اچھی طرح واضح کر دیا کہ فرط عقیدت میں لوگ کتنی غلط بیانی کر رہے ہیں؟

آپ کی تقریر سے جلسہ کی فضا بدل گئی اور لوگوں کو جنگ آزادی کی صحیح تاریخ معلوم ہو گئی یہ تقریر ریکارڈ ہو کر اب تک اصحابِ مدنِ پورہ کے پاس محفوظ ہے۔

مولانا نے جس ماحول میں پرورش پائی، اور آپ کی زندگی پر جو باتیں اثر انداز ہوئیں اسکا لازمی نتیجہ تھا کہ حق پسندی، صدق شعاری آپ کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ایسی حالت میں یہ تہمت اور اتنا بڑا الزام کہ ”ہندوستان کی تحریک آزادی اور ملک کی سیاسی زندگی میں جماعتِ اہلِ حدیث کا کوئی گوارا یا کوئی حصہ نہیں ہے“، کس طرح برداشت کر سکتے تھے یہ پخت آپ کی غیرت کھیلے ایک کھلا پوچھ گچھ تھی اس لئے آپ نے اس الزام کو دفع کرنے کے لئے قلم اٹھایا۔ موجودہ کتاب مولانا کے اسی جواب کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ناظرین کو رام خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ الزام دینے والوں کی باتیں کتنا وزن ہے؟

دارالحدیث رحمانیہ دہلی اور اس کے مہتمم جناب شیخ عطاء الرحمن مرحوم اس تحریکِ جہاد و حریت وطن کے علمبرداروں میں تھے۔ اس لئے مولانا کی روح کو یہاں سے بھی ہی غلطی اور مولانا اس میدان کے مجاہد بن گئے۔

مولانا کی ہستی ایک مستقیم ہستی تھی اگر آپ کی زندگی اور صحت کچھ دنوں اور ساتھ دیتی تو معلوم نہیں آگے آپ دین و ملت کی کتنی خدمتیں انجام دیتے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ واغسلہ بالماء والثلج والبرد۔

(آزاد رحمانی)

۲۵ جولائی ۱۹۷۲ء
۲۵ رجبی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى تَحَرُّ
الانبياء والمرسلين مُحَمَّدٍ وَاٰلِهِ وَصَحْبِهِ وَاَتْبَاعِهِ الْجَمْعِينَ، اَمَّا بَعْدُ
متحدہ ہندوستان کی سب سے پہلی وہ انقلابی تحریک جس کی بابت یہ کہنا
بالکل صحیح ہے کہ وہ اپنے نصب العین اور مقاصد کے لحاظ سے صحیح معنی میں دینی
بھی تھی اور سیاسی بھی۔ وہ ہر سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل الشہیدین کی تحریک جہاد
وتجدید دین۔ یہ تحریک اب کافی متعارف ہو چکی ہے۔ اس پر اخبارات اور رسائل
میں بھی مضامین لکھے گئے ہیں اور کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ کسی نے بسط و تفصیل
سے لکھا ہے اور کسی نے تلخیص و اختصار کے ساتھ۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس تحریک کے قائدین میں بھی اور اس کے متبعین و
معاونین میں بھی احسان اور اہل حدیث دونوں مسلک کے افراد شامل تھے لیکن
اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس تحریک کو چلانے اور اس کو ایک عرصہ
تک باقی رکھنے کیلئے اہل حدیثوں کی جانی اور مالی قربانیاں ایک نمایاں شان رکھتی
ہیں۔ بالخصوص بالاکوٹ میں شہادت کا حادثہ (۱۲۶۶ھ میں) پیش آجانے کے
بعد تو اس کے جھنڈے کو اونچا رکھنے کی سعادت جن بزرگوں کو حاصل ہوئی وہ
صادق پور رپٹنہ کے اہل حدیث ہی تھے۔ یہاں تک کہ انگریز حکومت کے

دور استبداد میں جب اس تحریک کا ظاہری سطح پر باقی رکھنا دشوار ہو گیا تو وہ اہلحدیث ہی تھے جن کے سینوں میں اس کے شرارے سلگتے رہے۔ انھوں نے کبھی بھی اس تحریک سے کئی طور پر اپنا تعلق منقطع نہیں کیا۔ وہ نہایت خفیہ طریقہ پر سرحد کے پار بقیۃ السلف مجاہدین کو برابر ہر قسم کی امداد پہنچاتے رہے اس کے علاوہ بھی انگریزی حکومت کے خلاف ملک میں جب کبھی کوئی شورش برپا ہوئی اور کوئی سیاسی تحریک چلائی گئی تو اہلحدیث اپنے تناسب آبادی کے لحاظ سے برابر اس میں شریک ہوتے رہے۔ متحدہ ہندوستان کی کوئی ایسی انقلابی تحریک نہیں بتائی جاسکتی جس میں اہلحدیث افراد شامل نہ رہے ہوں۔ مگر تاریخ کے ساتھ یہ بے الضافی اور تنگ نظری دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اہلحدیث کی جہادی اور سیاسی خدمات کو چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ متعصب تاریخ نگار ان کا ذکر نہیں کرتے، بلکہ نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ کہنے والوں نے برملا کہہ دیا کہ:-

”۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے لیکر اب تک اہلحدیث کے علماء و مشائخ نے سیاست اور عملی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ نہ سیاست سے ان کے دم تا این دم ان کو کوئی لگاؤ ہے۔ بہت عرصہ ہوا جماعت اہلحدیث سیاست سے الگ ہو چکی ہے، اس کو بالاکوٹ سے آج کچھ بھی لگاؤ اور نسبت نہیں رہ گئی ہے“ (اخبار اہلحدیث دہلی بابت یکم دسمبر ۱۹۶۱ء)

میں نے اس مکروہ اور غلط الزام کے خلاف اخبار میں پرزور احتجاج کیا اور جواب میں ”اہلحدیث اور سیاست“ کے عنوان سے مسلسل کئی قسطوں میں

مضامین لکھے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان مضامین کے حق میں بہت سے اہل علم اور اصحاب ذوق حضرات نے صدائے تحسین بلند کی۔ زبانی اور خطوط کے ذریعہ میری حوصلہ افزائی کی۔ اور مطالبہ کیا کہ یہ مضامین کتابی شکل میں مرتب کر کے شائع کئے جائیں، چنانچہ اس مشورے کے بعد میں نے اخبار میں اس مضمون کی اشاعت بند کر دی اور کتابی ترتیب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

— ک —

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۵

المحدث اور سیاست

اخبار اہل حدیث دہلی بابت یکم دسمبر ۱۹۷۱ء میں ”دسفر مالیر کوئٹہ پنجاب“ کے عنوان سے مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی جھنڈا انگری کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے دہلی کے مشہور محلہ بھائک جٹش خاں کی مسجد محتسب میں ایک کشمیری فاضل سے اپنی ملاقات اور کشمیری صاحب کے گہرے تاریخی انکشافات اور قیمتی علمی افادات سے مستفیض ہونے کا تذکرہ بڑے شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ کشمیری فاضل نے مولانا جھنڈا انگری کی معرفت جماعت اہل حدیث کے نام اپنا ایک مہینہ نام بھی بھیجا ہے جسکو بڑی سعادت مندی کے ساتھ ہمارے عزیز محترم مولانا جھنڈا انگری نے اخبار المحدث کے ذریعہ جماعت کو پہنچایا ہے۔ مولانا جھنڈا انگری لکھتے ہیں۔

۱۰۔ اپریل کی شب میں مسجد محتسب میں جماعت اہل حدیث کے ایک ممتاز اور بالبصیرت عالم و ممبر پارلیمنٹ مولانا عبدالرحمن صاحب کشمیری سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے خاکسار سے جماعتی حالات پر بہت دیر تک بہت دلچسپ باتوں کا سلسلہ قائم رکھا۔

جلہ فرمایا کہ آج کے موجودہ بے عمل اہلحدیث افراد کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شیخی اڑاتے ہوئے بالاکوٹ سے اپنی نسبت کی من تر لیا سنا تے رہیں۔۔۔۔۔ مولانا کشمیری نے کہا کہ سرخیل جماعت سید الطائفہ مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی نے بھی سیاست سے کنارہ کشی کر لی۔ انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد پر دستخط نہیں کئے۔۔۔۔۔ اور ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی میں مولانا نے ایک میم کی جان بچائی تھی اور اس کے معاوضہ میں ان کو کئی کئی بار انعام ملا۔ یہ بھی فرمایا کہ یہ تمام حالات اشاعت السنہ میں موجود ہیں۔ سرخیل علماء مولانا سید نذیر حسین کے وقت سے لیکر اب تک آپ کے علماء و مشائخ نے سیاست اور عملی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا۔۔۔۔۔ نہ سیاست سے از آں دم تا ایں دم کوئی لگاؤ ہے۔ کہنے لگے میرا پیغام پہونچا دیا جائے کہ جماعت اہلحدیث بہت عرصہ ہوا سیاست سے الگ ہو چکی ہے، اسکو بالاکوٹ سے اور سیاست و عملی اقدام سے آج کچھ بھی لگاؤ اور نسبت باقی نہیں رہ گئی ۴

ہم نے اس پیغام رسانی کی خدمت کو مولانا جھنڈا نگری کی سعادت مندی اس لئے کہلے کہ انھوں نے کشمیری صاحب کے اس ”پیغام“ کو جماعت اہلحدیث تک پہونچا دینے ہی پر اکتفا کر لینا مناسب نہیں سمجھا، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری سمجھا کہ اس کے آخر میں اپنا تائبہ دی و تصدیقی دستخط بھی ثبت فرمادیں، چنانچہ لکھتے ہیں۔

” ممکن ہے ماحول کی عدم مساعدت کا عذر کیا جائے لیکن بہر حال یہ

صحیح ہے کہ میدان سیاست و معرکہ بالا کوٹ جیسے عملی اقدام سے جماعت
الہدیت ایک عرصہ سے علحدہ ہو چکی ہے۔

ہم چونکہ کشمیری صاحب کے متعلق اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں کہ وہ الہدیت ہیں
اس لئے ان کے تاثرات اور ارشادات کی بابت تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوا لیکن اپنے
عزیز بھائی مولانا جہنڈا نگری کی اس تائید و تصدیق کو پڑھ کر افسوس ضرور ہوا۔ اور کسی کا
یہ شعر یاد آیا ہے

خندہ اہل جہاں کی مجھے پروا کیا تھی

تم بھی سنستے ہو مرے حال پہ رونا یہ ہے

ہم نہیں کہہ سکتے تھے مولانا جہنڈا نگری کن اطلاعات کی بنا پر مخترم ممبر پارلیمنٹ موصوف کو
”جماعت اہل حدیث کا ممتاز اور بال بصیرت عالم“ سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف
انگریزی تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے مسلک کی بابت برابر اسکا اظہار کرتے رہتے ہیں
کہ ”میں الہدیت نہیں ہوں“ ابھی تین چار مہینے پہلے (ستمبر ۱۹۶۱ء میں) آل انڈیا الہدیت
کانفرنس کی مجلس عاملہ کی ایک ٹینگ میں شرکت کیلئے میرا دعویٰ جانا ہوا تھا۔ میرے
ساتھ رفیق مکرم حضرت مولانا عبید اللہ صاحب مبارکپوری مدظلہ العالی بھی تھے
پھاٹک جلسہ خاں میں ایک اہل حدیث رئیس کے مکان پر تمام ممبران عاملہ ناشتہ پر
دعوت تھے، وہیں ممبر پارلیمنٹ موصوف بھی تشریف لائے تھے اور مولانا مبارکپوری
سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے صاف صاف فرمایا کہ ”میں الہدیت نہیں ہوں“
اس کے علاوہ درایت بھی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ سکولر حکومت کی پارلیمنٹ کا ممبر
ہوتے ہوئے موجودہ حالات میں الہدیت کہلانا گوارہ بھی کیسے کریں گے ؟

جبکہ اس جماعت میں نہ جہاد کی روح ہے اور نہ سیاست میں عملی اقدام کی جرأت۔ وہ تو شاید پارلیمنٹ میں اپنے ”مجاہدہ عزام“ کی تکمیل ہی کیلئے تشریف لے گئے ہیں۔ اللہ ان کی مدد فرمائے۔

میں جانتا ہوں کہ باوجود انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کے مذہبیات کے متعلق بھی موصوف کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ عربی کتابوں کے اردو ترجمے انھوں نے خوب پڑھے ہیں۔ بہت سی عربی کتابوں کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ ان کا اردو ترجمہ ہوا ہے یا نہیں۔ لیکن وہ پوری بصیرت کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ کب ہوا ہے اور کس نے کیا ہے۔ مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا بڑا شوق ہے۔ براہیسی کتابوں کی جستجو اور تلاش میں رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ بلاشبہ قابل قدر اور لائق احترام ہیں۔ اگرچہ عربی کی استعداد اتنی نہیں کہ عربی کتابوں سے براہ راست خاطر خواہ استفادہ کر سکیں تاہم مذہب سے شغف اور شوق مطالعہ کی فراوانی کا یہ اثر ہے کہ بعض مسائل کی واقفیت میں وہ ہم سے بہت آگے ہیں۔ مگر ساتھ ہی مجھے اس حقیقت کا اظہار کرنے میں بھی کوئی تاثر نہیں ہے کہ ہندوستان کی تحریک اہلحدیث کی بابت موصوف کے خیالات ہرگز صحیح نہیں ہیں۔ اور اطلاق و عمومیت کے ساتھ ان کا یہ الزام لگانا کہ عرصہ ہوا جماعت اہلحدیث سیاسیات سے عملاً الگ ہو چکی ہے، واقعتاً کے بالکل خلاف ہے۔ ہم فاضل کشمیری کے اس تاثر پر کیا تعجب کریں کہ شیخ الیکل حضرت مولانا سید نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ انگریز کے خلاف نہ تھے، جبکہ کہنے والوں نے

”ہندوستان نے ہیری مراد غیر منقسم ہندوستان ہے۔ اس لئے ملک کا وہ حصہ جسکو آج ”پاکستان“

کہا جاتا ہے وہ بھی اس میں داخل ہے۔ یہ نکتہ آئندہ بھی ملحوظ خاطر رہے۔“

خود حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت بھی کہہ دیا کہ وہ انگریزوں کے مخالف نہیں تھے ان کی تحریک جہاد انگریزوں کے خلاف نہیں بلکہ صرف سکھوں کے خلاف تھی۔ مولانا ابوالحسن علی میاں نے ”سیرت احمد شہید“ میں اسکا رد کیا ہے اور مولانا غلام رسول تمہرنے تو ”جماعت مجاہدین“ کا پہلا باب خاص اسی بحث پر لکھا ہے اور ”سید احمد شہید“ کی پہلی جلد میں اس تحریک کے مقصد اور نصب العین پر بڑی مبسوط گفتگو کی ہے

اہل حدیث کی مجاہدانہ خدشا اور تاریخ پر ظلم
کو چھپانے کی ناروا کوشش | خالص دینی اور اسلامی
تحریک کی تاریخ کی بات

جس کا ماضی نہایت شاندار اور درخشاں ہے مختلف قسم کی ریشہ دوانیاں برابر جاری ہیں۔ اس تحریک کی اصلی دعوت اور اس کے حق پرست داعیوں کے خلاف انگریز مورخوں کی غلط بیانیوں اور علماء اہل بدعت کی افترا پردازیوں کا تو شکوہ نہیں کہ ان سے اس کے علاوہ کسی چیز کی توقع ہی کب تھی؛ لیکن اس وقت جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ حق و انصاف کے خون کی چھینٹیں ان کے دامن پر بھی ہیں جو آج ہندوستان میں تمام مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور تاریخی حقوق کے تحفظ کا دعویٰ رکھتے ہیں۔

جمیعت علماء ہند کے ایک بڑے عہدہ دار اور ممتاز رکن جناب مولانا سید محمد میاں نے ”علمائے ہند کا شاندار ماضی“ لکھا ہے اور تقریباً ایک ہزار صفحات میں پھیلا کر لکھا ہے۔ اس کا تبصرہ حصہ ”علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے“ کے عنوان سے

معنون کیا گیا ہے۔ جس میں ۱۸۵۴ء کے بعد سے ۱۹۴۶ء تک کے علماء کرام کی خدمت اور ان کے سیاسی حالات کا تذکرہ ہے۔ لیکن تنگ نظر علم اور عصیت کا یہ حال ہے کہ تاریخ ہند کے اس طویل دور میں علماء دیوبند کی چند مخصوص شخصیتوں کے سوا ہمارے مولانا کی نگاہ میں نہ تو کوئی اہلحدیث عالم و عالم حق تھا اور نہ اس کا کوئی کارنامہ و مجاہدانہ کارنامہ، علمائے صادق پور کا جو حال لکھا ہے اس میں اس بات کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی نوع سے انکا اہلحدیث ہونا ظاہر نہ ہو سکے۔ یاد ہو گا کہ نومبر ۱۹۵۵ء میں نجد و حجاز کے ولی جلالۃ الملک سعود بن عبدالعزیز ہندوستان تشریف لائے تھے اور سترہ روز اس ملک میں قیام کیا تھا اس اثناء میں مختلف مقامات کا دورہ کیا، اور متعدد جماعتوں نے ان کی خدمت میں سپاسنامے پیش کئے۔ آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس نے بھی ان کا استقبال کیا تھا اور صلی کے لال قلعہ میں ان کی خدمت میں ایک مختصر سا سپاسنامہ بھی پیش کیا تھا۔ جمعیتہ علماء ہند نے جو سپاسنامہ پیش کیا تھا اس کی بابت مدیر ”الجمیۃ“ نے ستمبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ اس ”سپاس نامہ میں نہ صرف اعلیٰ حضرت کا خیر مقدم ہی کیا گیا بلکہ ہندوستان، مسلمانان ہند اور جمعیتہ علماء ہند کی پوری تاریخ بھی پیش کر دی گئی۔ مگر یہ ”پوری تاریخ“ کیا ہے؟ وہی مولانا محمد میاں کی مذکورہ بالا کتاب ”شاندار ماضی“ کا پورا چربہ اور بس۔ بالفاظ دیگر ہندوستان کی مسلمانان ہند کی، اور جمعیتہ علماء ہند کی، ”پوری تاریخ“ میں جماعت اہلحدیث اور علماء اہل حدیث کا کوئی حصہ ہی نہیں۔ بتائیے یہ تاریخ کے ساتھ بے انصافی اور ظلم نہیں تو کیا ہے؟ حالانکہ جمعیتہ علماء کی تاسیس اور اس کی ترقی میں

۱۰

اکابر اہل حدیث کی خدمات کو بھی بہت کچھ دخل ہے جیسا کہ ہم آگے بتائیں گے۔
 یہاں یہ تاویل بھی نہیں کی جاسکتی کہ یہ جمعیت کے کسی فرد کی انفرادی حرکت ہے کیونکہ
 یہ سپاسنامہ ادارہ کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔

دیوبندی ہی مکتب فکر کے ایک مشہور عالم مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی
 گذرے ہیں۔ ان کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد یکم ستمبر ۱۹۵۷ء کے اخبار ”نوائے پاکستان“
 لاہور میں ان کا ایک خط شائع کیا گیا تھا جو انھوں نے فروری ۱۹۵۳ء میں کسی صاحب
 کو تحریر فرمایا تھا۔ اس خط میں مولانا مرحوم نے سید ابوالاحمد خاں مرزا غلام احمد
 قادیانی، عنایت اللہ مشرقی، سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریکوں کا ذکر کیا ہے
 اسی کے ساتھ وہ اہل حدیث کو بھی گھسیٹ لائے ہیں اور فرماتے ہیں:-

ایک بات کہتے کہتے ڈر لگتا ہے مگر حقیقت حال کو چھپا یا نہیں جاسکتا
 کہ اہل حدیث کے نام سے جو تحریک مدرا سے شروع ہوئی تھی اسکا
 مقصد بھی اس وہابی تحریک کو ختم کرنا تھا جبکہ حضرت سید احمد شہید
 بریلویؒ اور حضرت اسماعیل شہیدؒ نے شروع کیا تھا جسکا مقصد مذمت
 کو انگریزی اقتدار سے پاک کرنا تھا..... (الاعتصام، ستمبر ۱۹۵۷ء)

جس زمانے میں یہ خط شائع ہوا تھا اسی زمانے میں اس کے متعدد جوابات الاعتصام اور
 ماہنامہ ”حقیق“ وغیرہ جماعتی پرچوں میں دیئے گئے تھے۔ اس محولہ بالا اشاعت میں
 ہی الاعتصام نے لکھا ہے:-

افسوس ہے مرحوم آج اس دنیا میں نہیں اور یہ خط ان کی موت کے ایک
 عرصہ بعد شائع کیا گیا ہے ورنہ ہم ان سے ادب کے ساتھ پوچھتے کہ

الحدیث کی وہ کون تحریر تھی جو مدراس سے اٹھی تھی، اور جس کا مقصد حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تحریک کو ختم کرنا تھا؟ یوپی، میں اہل حدیث کی کثیر تعداد تھی، بہار اور بنگال میں بشمار اہل حدیث تھے۔ دہلی اور پنجاب میں وسیع تعداد میں اہل حدیث تھے اور وہ سب کے سب انگریز کے مخالف تھے، انھوں نے نہ صرف یہ کہ حضرات شہیدین کی تحریک کی مخالفت نہیں کی، بلکہ ان کی حمایت میں ہمیشہ انگریزی اقتدار کے ساتھ ٹکراتے رہے۔ کالا پانی ان سے آباد ہوا، پھانسیوں پر یہ لٹکے سرحد پار انھوں نے انگریز کے خلاف دست بدست جنگ لڑی اور حضرات شہیدین کی تحریک جہاد کو پوری ہمت و جرات سے جاری کئے رکھا، لیکن آج آپ فرماتے ہیں یہ انگریز کے ساتھ تھے۔ فرمایا جلتے کس دور میں انھوں نے انگریز کا ساتھ دیا؟ اور کب انھوں نے مدراس سے کوئی تحریک جاری کی؟

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عصر حاضر کے ایک ممتاز فاضل ہیں، کسی زمانے میں وہ اہل حدیث سے بہت قریب تھے، مگر اب وہ دیوبندیت سے کافی متاثر ہیں ان کے اسی تاثر کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء قریب قریب دارالعلوم دیوبند کا ضمیمہ بن کر رہ گیا ہے۔ اب اس کے اساتذہ اور طلبہ میں ذہن و فکر کی وسعت نہیں باقی رہی جو کبھی ندوہ کا امتیازی نشان تھا فقہی اعتبار سے اب یہاں بھی عصبيت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ اہل حدیث طلباء کے ساتھ اساتذہ کا سلوک مشفقانہ اور ہمدردانہ نہیں ہے۔ اسی لئے اہل حدیث طلبہ وہاں انبساط

اور انشراحِ قلب کے ساتھ نہیں رہتے بلکہ ذہنی طور پر وہ اپنے اندر ایک قسم کی گھٹن اور اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ مولانا علی میاں کے ذہنی انقلاب کا ایک نمایاں اثر ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ عام مجالس میں ہندوستان کے علماء کی بنی اصلاحی، علمی، سیاسی خدمات کا جب تذکرہ کرتے ہیں تو علمائے اہلحدیث کے خدمات کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک دور تھا کہ ہندوستان میں مذہبی مناظروں کی خوب دھوم تھی، عیسائیوں اور آریوں کے ساتھ بڑے اہم اور معرکے کے مناظرے ہوئے ہیں۔ جن کے متعلق بعض علمائے احناف کی خدمات بھی بلاشبہ قابلِ قدر ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علمائے اہلحدیث کی خدمات بھی اس سلسلے میں وزن رکھتی ہیں، بالخصوص مولانا شانار الترامترسریؒ تو اس میدان کے شہسوار ثابت ہو چکے ہیں۔ زبانِ خلق نے آپ کو ”شیرِ پنجاب“ کا لقب دیا۔ ایسے بھی موقعے آئے ہیں جہاں علمائے دیوبند کی موجودگی میں مولانا امترسریؒ ہی کو مناظر بنایا گیا اور مولانا نے بڑی کامیابی کے ساتھ ان مورچوں کو فتح کیا ہے۔ مگر حیرت ہے اور انتہائی حیرت ہے کہ مولانا علیؒ میاں اس سلسلے میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رحمت اللہ کبر الہوی وغیرہ کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن مولانا امترسریؒ ان کو یاد نہیں آئے۔

ان کے ایک عربی مضمون کا ترجمہ قاضی محمد اسلم صاحب سیف فیروز پوری نے کیا جو ”الاعتصام“ لاہور کی متعدد اشاعتوں میں ”برصغیر پاک و ہند میں اسلامی دعوت کے مختلف دور“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کی آخری قسط ۸ جنوری ۱۹۵۷ء کے ”الاعتصام“ میں شائع ہوئی ہے اس میں علی میاں نے ان تمام دینی

تحریکوں اور دعوتوں کا ذکر فرمایا ہے جو گزشتہ سو سال یعنی ۱۸۵۷ء سے لیکر ہمارے اس زمانے تک برصغیر پاک و ہند میں اٹھیں اور ان سے عوام کو فائدہ پہنچا۔
 اسمیں مدارس اور اداروں کا ذکر بھی ہے اور افراد کے نام بھی ہیں۔ مگر داد دینی چلپیے
 علّٰی میاں کے کی اس "احتیاط" کی کہ اس دور کی مختلف علمی اور سیاسی مساعی کے
 کسی حصہ میں بھی اہلحدیث کے کسی شخص یا ادارہ کا ذکر انہوں نے نہیں آنے دیا۔
 "الاعتصام" نے اپنی ۱۵ جنوری ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں اس کے خلاف احتجاجے
 ادارہ لکھا ہے جس میں تفصیل سے اپنی شکایات علی میاں کی خدمت میں پیش کی ہیں
 اور اہلحدیث کی دینی، اصلاحی اور سیاسی خدمات کی طرف اشارات بھی کیے ہیں۔
 ایک کتاب "ہندوستانی مسلمان" کے نام سے منظر عام پر آئی ہے۔ مجلس تحقیقات
 و نشریات اسلام لکھنؤ نے اسکو شائع کیا ہے۔ مختلف اخبارات اور رسائل نے
 اس پر تبصرے لکھے ہیں۔ رسالہ معارف اعظم گڑھ کے تبصرہ نگار مولانا حافظ
 جیب اللہ صاحب ندوی نے اس کی بابت لکھا ہے کہ یہ "کتاب مولانا سید
 ابوالحسن علی ندوی کی چند عربی تقریروں کا مجموعہ ہے جسے محمود الحسن صاحب ندوی
 نے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس کتاب میں گیارہ ابواب ہیں جنہیں ہندوستانی
 مسلمانوں کے علمی، فکری اور تمدنی اثرات و کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔"
 معارف نے اسکی بابت اپنی رائے بھی لکھی ہے اور آخر میں بتایا ہے کہ کتاب
 میں بعض ضروری باتیں چھوٹ گئی ہیں۔ چھوٹی ہوئی باتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے
 اس نے لکھا ہے۔

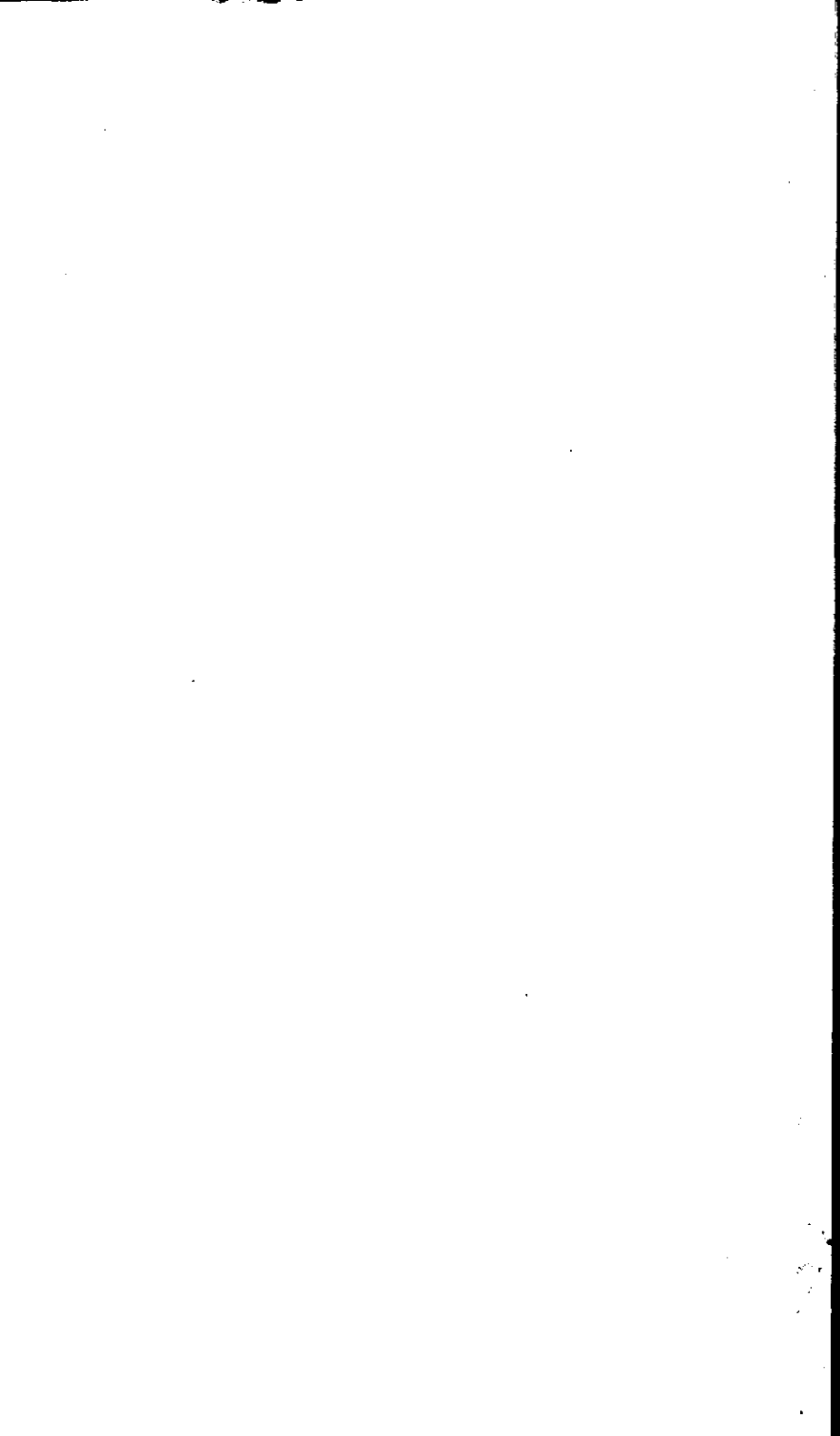
”دینی و علمی مراکز کے تذکرہ میں انجمن ترقی اردو اور جماعت اہلحدیث

۱۴

اور انکے اداروں کا ذکر نہ کرنا تعجب نیز معلوم ہوا، حالانکہ سید صاحب کے بعد اس تحریک کو واقعی اسی جماعت کے افراد نے زندہ رکھا.... (معنا)
بابت ماہ دسمبر ۱۹۶۱ء

اس شکوے کیساتھ ہمیں یہ اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ محترم مولانا علی میاں اہل حدیث کے ساتھ یہ بے انصافی صرف عام مجالس ہی میں ردوار کھتے ہیں۔ اہلحدیث کی مجلسوں اور اداروں میں جب کبھی وہ تشریف لے جاتے ہیں تو وہاں کھل کر اہلحدیث کے بزرگوں کی اصلاحی، تبلیغی اور سیاسی خدمات کا اعتراف اور اعلان کرتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ بنارس کی دفعتہ تشریف لائے اور مدینہ پورہ کی جامع مسجد اہلحدیث میں ان کی تقریر ہوئی تو انھوں نے علمائے صادق پور، مولانا عبداللہ غزنوی، مولانا عبدالجبار غزنوی مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری وغیرہ کے متعلق بڑی اثر انگیز تقریر کی یہی بات مدیر الاعتصام نے بھی لکھی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

” غالباً دسمبر ۱۹۵۶ء کی بات ہے کہ مولانا ابوالحسن لاہوری تشریف لائے تو طلباء جامعہ سلفیہ کی طرف سے دارالعلوم تقویتہ الاسلام میں ان کے اعزاز میں عصر نہ دیا گیا تھا۔ جمیں جماعت کے متعدد ارکان اور شہر کے معززین شریک ہوئے تھے۔ مولانا کی خدمت میں ایک سپانامہ بھی پیش کیا گیا تھا جمیں ان کی خدمات کا ذکر تھا۔ اس سپانامہ کے جواب میں مولانا نے جو تقریر ارشاد فرمائی تھی اس میں پوری وضاحت سے اہلحدیث کی دینی خدمات کا ذکر فرمایا تھا۔ اور خاندان غزنویہ و لکھویہ اور دیگر معروف اہل علم کی صفات الفاظ میں تحسین کی تھی اور کہا تھا کہ ان کا قلبی



”واقعہ یہ ہے کہ ان چاروں خصوصیتوں کی جامعیت کے بغیر کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا، اور بڑی سے بڑی تحریکیں ان کے بغیر کسی طرح کے ٹھوس نتائج پیدا نہیں کر سکتیں، جو ان کو ہوا، طبیعتوں کو بدلنا، رسموں کو پھیر دینا، اور قلوب کو حرارت ایمانی سے بھر دینا نہ تو اعلانات سے ہوتا ہے اور نہ کسی دوسری چیز سے۔ یہ اسی جامعیت سے ہوتا ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے **هُدًى بِاللَّيْلِ** رہبان وباللہامر فہما سان لوگوں میں جب تک یہ جھلک نظر نہ آئے کچھ نہیں ہو سکتا،“

”سید صاحب کی جماعت کے اندر دعوت و عزیمت کا خاص وہی اہتمام تھا جو کئی سو سال پہلے کے مسلمانوں کا امتیاز تھا۔ اصحاب صادقوں کے حالات پڑھیں جو واقعات الہامیوں میں لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے یہ لوگ بڑے بڑے اہل قلوب سے کسی طرح کم نہ تھے۔ مولانا نے بعض بزرگوں (مولانا یحییٰ علی صادق پوری) کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انھیں قید و بند کی زندگی بھی گزاری پڑی۔ وہ قی خانوں میں بند رکھے جاتے تھے۔ لیکن وہ وہاں اس طرح رہتے تھے کہ پہرہ کیلئے جو پہرہ بیدار مقرر ہوتے جب ان کے تبادلہ کا وقت آتا تو وہ روتے ہوئے رخصت ہوتے تھے۔ ایک روز انہیں متفرقون خیرام اللہ الواحد القہل کے عنوان پر ایسی پُر اثر تقریر فرمائی کہ اپنی ڈیوٹی ختم کر کے کسی طرح پہرہ دار جانے پر راضی نہ ہوتا تھا جب رخصت ہوا تو بے اختیار رو رہا تھا۔ جیل خانہ میں دوسرے قیدیوں کے اندر بھی ان لوگوں نے دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔“

”و ایک بلوچ تھا جو بڑا سرکش اور شریر تھا، اتفاق سے اس کا بستر مولانا کے بستر

کے قریب پڑ گیا، معلوم نہیں ایک رات اس پر کیا اثر ڈالا کہ بے اختیار روتا جاتا تھا سید صاحب کے حالات پڑھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس پران کا سایہ پڑ گیا وہ سدھر گیا، یہ حضرات اتباع سنت کے عامل تھے۔ علاوہ ازیں ایک رنگ مولانا ولایت علی کا تھا اور ایک رنگ مولانا کرامت علی کا تھا۔ مگر دعوت و عزیمت میں سب لوگ متفق تھے اور اندر سے سب کے قلوب منصبع لبصغۃ اللہ تھے،

”یہ ایک بڑا سانحہ ہے کہ اب کچھ کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں اور جو مجموعہ تیار ہوا تھا وہ باقی نہیں ہے کسی نے عقیدہ توحید کو لے لیا تو کسی نے اعلا کلمۃ اللہ کو۔ اگر کہیں نعرہ جہاد ہے تو سنت کی جزئیات کا تتبع نہیں۔ اب کسی میں پہلے جیسا کامل نمونہ نظر آئے ایسا بہت کم ہے،“

”وہر جماعت اپنے آئیڈیل پر زندہ رہتی ہے آپ کو کبھی خود کو نمونہ بنانا چاہیئے۔ آپ نے یہ مثل تو سنی ہو گی کہ ایک من علم کیلئے دس من عقل کی ضرورت ہے۔ یہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اگر ایسا نہ ہو تو طبیعتوں میں توازن قائم نہیں رہتا۔ اور جب کوئی قدم اقام کیا جائے تو کمزوری آ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کی عفت میں جو توازن قائم ہوا اگر اس طرح کا توازن نہ ہو تو تعلق مع اللہ کی کیفیت وہ نہیں ہوتی جو ہونی چاہیئے۔ جس طرح کوئی شخص روزمرہ کی غذا کھائے تو قوت ہاضمہ کا جائزہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ معمول کے خلاف کوئی اعلیٰ قسم کا میوہ کھائے تو پہلے اسے اپنی قوت ہاضمہ کا جائزہ لینا چاہیئے کہ یہ غذا ہضم بھی ہوتی ہے یا نہیں“

”سید شہیدؒ کی جماعت نے ہندوستان میں اسلام کی بقا و استحکام کیلئے جو بیڑہ اٹھایا اس میں ضرورت تھی حافظ عبد اللہ صاحب غازی پوری اور مولانا عبدالعزیز صاحب

محدث رحیم آبادی جیسے لوگوں کی، کہ انھوں نے نماز کے جملہ احکام و مسائل کو قرآن و سنت سے براہ راست اخذ کیا۔ رفع یدین کا بھی التزام کیا اور تہجد کا بھی۔ اگر آج ہم رفع یدین کا اہتمام کرتے ہیں تو تہجد کا اہتمام کیوں نہیں کرتے، رفع یدین تو ایسی چیز ہے جسے ہر شخص دیکھ سکتا ہے لیکن ان کی تہجد گزاری اور اچائے لیل ایسی چیز ہے جسے کسی نے نہیں دیکھا، پس اس طرح کا توازن جب تک نہیں ہوگا کوئی کام نہیں ہو سکتا تہجد پر اتنی بڑی بڑی بحثیں ہوتی ہیں، مگر نہ اسے آٹھ رکعت دلے پڑھتے ہیں اور نہ تیرہ رکعت والے۔ جب پڑھنے کا وقت آتا ہے تو سب آرام سے سوتے رہتے ہیں۔ یہ عدم توازن صرف یہیں نہیں ہے بلکہ تمام جماعتوں میں ہے۔ میں یہاں انھیں باتوں کو کہوں گا جو یہاں کی مناسبت سے ہوں۔ رفع یدین کی بحث میں تو اختلاف ہو سکتا ہے جن کے یہاں ثابت ہے، ثابت ہے جن کے یہاں یہ ثابت نہیں ان کے یہاں اس کا نسخ ثابت ہے لیکن لولا اَنْ اُشْتُ عَلَى اُمْتِي لَا مَرْتَبَهُمُ بالسواك میں تو کوئی اختلاف نہیں کرتا۔

”مولانا شیروانی کی زبان سے ایک واقعہ سنا ہے کہ مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی علی الحیاة تھے، روزانہ قرآن کا درس دیتے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی ان کی زندگی میں ایک مرتبہ امرتسر تشریف لے گئے۔ مولانا شبلی اگرچہ علوم و فنون میں درک رکھتے تھے مگر ان چیزوں سے انھیں زیادہ شغف نہیں تھا، جب مولانا غزنوی کے درس سے واپس آئے تو کہنے لگے کہ یہ شخص جب اللہ کہتا تھا تو دل چاہتا تھا کہ سراسر اس کے قدموں پر رکھ دوں۔ یہ تھا ان لوگوں کے تعلق مع اللہ کا حال“

”ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب کے یہاں کچھ مہمان

اُسے تھے، مہمان بیٹھے ہوئے تھے، بیچ میں پارٹیشن تھی، وہ صاحب پوچھنے لگے کہ فلاں کے بعد کون بیٹھا ہوا تھا؟ جواب ملا کہ فلاں تھا، انھوں نے پوچھا کہ اس کے بعد؟ جواب ملا کہ فلاں تھا۔ علی ہذا القیاس انھوں نے دریافت کیا کہ اخیر میں کون تھا؟ تو معلوم ہوا کہ مولانا عبد الجبار صاحب تھے۔ وہ کہنے لگے کہ اسی لئے دل بے اختیار ادھر کھینچا جا رہا تھا۔ ”مسلمانوں میں کہنے لسانی وغیرہ کا جو توازن پہلے تھا اب باقی نہیں ہے کم از کم اسے معیار کے طور پر نہیں اپنانا ہے۔ اس بارے میں تو بہت وسیع القبلی کی ضرورت ہے آپ کو سوچنا چاہیے کہ اگر نماز رہ گئی تو جو شخص جس طرح چاہے گا نماز پڑھے گا۔ لیکن اگر اسلام اور ایمان ہی باقی نہ رہا تو نماز کہاں رہ سکتی ہے اور اس کے اندر یہ اختلافات کہاں جائیں گے۔ اسی لئے اس وقت سب سے بڑی ضرورت اسکی ہے کہ اسلام اور ایمان باقی رہے۔“

بیچ پوچھے تو دوسروں کی بے انصافیوں کا شکوہ کرنے کا ہسکو حق بھی

اپنا شکوہ

انہیں ہے جبکہ خود ہم نے اپنے آپ کو بھلا رکھا ہے۔ یہ ہمارا کام تھا کہ ہم اپنے اسلاف کے تذکار کو باقی رکھتے اور ان کی صحیح تاریخ سے دنیا کو روشناس کراتے تاکہ ایک طرف اگر دشمنوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا تو دوسری طرف اپنے نوجوانوں کے ”داغ بوائے سینہ“ کو بھی تازہ رکھا جاتا جیسا کہ کسی نے کہا ہے

تازہ خواہی داشتن گروا غبائے سینہ را

گلے کا ہے باز خواں این قصہ پارینہ را

لیکن ہم اپنی بے شعوری کا ماتم کریں یا اپنی بد قسمتی کا رونا روئیں کہ ہیں آج تک بھی اسکی ضرورت کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔ ابھی حال کی بات ہے کہ میں نے حضرت

۲۰

مولانا جیکم عبدالغفور صاحب صا دو قبوری رہنمہ کو ایک خط لکھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس خط کو یہاں نقل کر دوں، میں نے لکھا تھا.....
 ”مولانا المکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بڑی دلسوزی کے ساتھ آپ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں امید ہے آپ اسکی اہمیت محسوس فرمائیں گے اور اسکو شرف قبولیت بخشیں گے آپ سے زیادہ اس حقیقت کو کون جان سکتا ہے کہ حادثہ بالاکوٹ کے بعد اس مقدس دینی اور انقلابی تحریک کی قیادت کا بار آپ ہی کے نزرگوں نے اپنے کندھوں پر اٹھالیا تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ ان مردانِ بانی اٹھے پوری دیانتداری کے ساتھ اس کا حق ادا کر دیا۔ یہ بھی آپ سے مخفی نہیں ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ تحریک حالات کے دباؤ کی وجہ سے ظاہری سطح پر باقی نہیں رہی تھی، لیکن اندرونی طور پر کبھی بھی ختم نہیں ہوئی۔ مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی اور ان کے جانباز رفقاء کے سینوں میں اس کے شرارے باقی رہے۔ دھلی، یوپی، بہار، اور بنگال وغیرہ کے اہلحدیثوں نے اس کے لئے جانی اور مالی ہر طرح کی بڑی بڑی قربانیاں دیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک مدت تک اس تحریک کی سربراہی آپ بھی فرماتے رہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد اب اس تحریک کا تعلق سرحد پار کے لوگوں سے باقی نہیں رہا ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ جنگ آزادی کی تاریخ میں اس تحریک کے پچھلے قریبی دور کا کہیں کوئی ذکر نہیں آتا۔ بلکہ اس کے برخلاف ہم کو طعنہ دیا جا رہا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے سے لیکر آج تک اہلحدیث کے علما و

شاخ نے انگریز کے خلاف سیاست میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا اور غلی جہاد سے بالکل الگ رہے۔ اس پر دیکھنے سے متاثر ہو کر خود ہمارے نوجوان بھی اپنے اسلحہ سے بظن ہو رہے ہیں اور احساس کمتری کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ اب جبکہ ملک آزاد ہو چکا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کے ان کارناموں کو منظر عام پر نہ لے آئیں جو انگریز کی مخالفت میں انھوں نے انجام دیئے تھے۔

پس جناب والا کی خدمت میں میری پُر زور درخواست ہے کہ کم از کم مولانا رحیم آبادی اور اپنی قیادت کے دور کی تاریخ اس طرح مرتب کرنے کا کوئی انتظام فرمائیں جس کے مطالعہ سے ہم ہو جائے کہ یہ تحریک اپنے پچھلے قریبی دور میں کن مراحل سے گزری اور کن کن افراد اور مقامات نے اس میں حصہ لیا؛ الٰہی دیت کے علاوہ دوسرے مکتب فکر کے مسلمانوں نے اس کام سے کس حد تک دلچسپی لی؛ اگر آپ کی موجودگی اور نگرانی میں یہ اہم تاریخ مرتب ہو جائے تو مسلمانوں بالخصوص اہلحدیث کے حق میں مفید ثابت ہوگی اور آپ کے باقیات صالحات میں اس کا شمار ہوگا۔

والسلام

حاکم ازندیر احمد رحمانی - بنارس ۱۹ دسمبر ۱۹۶۲ء

یہ خط مولانا کی خدمت میں بذریعہ ڈاک بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد حکیم فروری ۱۹۶۳ء کے اخبار اہلحدیث دہلی میں شائع بھی کر دیا۔ اخبار میں شائع کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ جماعت کے عام افراد کے علاوہ مولانا کے حلقہ ارادت کو خاص طور پر اسکی اطلاع ہو جائے۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ نہ مولانا نے میری اس درخواست کو قابل اعتناء سمجھا اور نہ ان کے اراد مندوں میں سے کسی صاحب

نے اسکی طرف کوئی توجہ مبذول کی۔ حالانکہ بنگال اور بہار میں خراسانی تحریک کے نام سے جو نظام قائم ہے اور اس نظام کے تحت انگریزی حکومت کے زمانے میں عشر اور زکوٰۃ کی جو بے شمار رقیں وصول کی گئیں ان کی بابت عوام سے یہی کہا گیا کہ یہ ساری رقیں سرحد پار ”مجاہدین“ کو بھیجی جا رہی ہیں، مجاہدین سے ”ہی کی خدمت کا جذبہ تھا جسکی بنا پر اہلحدیث اس نظام سے وابستہ رہے۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم ہندوستان کی تحریک اہلحدیث کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

اس تحریک کی ہمہ گیر تاثیر یہ بھی تھی کہ وہ ”جہاد“ جسکی آگ اسلام کے مجسمہ میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی وہ پھر بھڑک اٹھی۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ گذرا کہ وہابی اور باغی مترادف لفظ سمجھے گئے اور کتنوں کے سر قلم ہو گئے، کتنوں کو سولیوں پر لٹکنا پڑا۔ اور کتنے پابجولاں دریائے شور عبور کر دیئے گئے یا تنگ کوٹھڑیوں میں انھیں بند ہونا پڑا۔ اور اب پردہ کیسا! صاف کہنا ہے کہ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کے زندگی تک تحریک کے علم برداروں میں یہ روح کام کر رہی تھی۔ انہوں نے ”کنز قبیلہ“ مجنوں کے نمائندہ ”مقدمہ تراجم علمائے حدیث ہند“

مولانا رحیم آبادی کی زندگی تک جو ”روح“ کام کر رہی تھی اسی ”روح“ کو بانی رکھنے کیلئے امارت اور سرداری کا نظام چلایا گیا اور اسی کا نام ”خراسانی تحریک“ رکھا گیا اسی خراسانی تحریک کے سلسلے کے ”امیر“ ہیں مولانا حکیم عبدالغفور صاحب صاحب قیوری اسی لئے میرے نزدیک اس نظام کی تاریخ مرتب کرنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ

اسی پارٹی پر عائد ہوتی ہے، اسی احساس کی بنا پر میں نے مولانا موصوف کو مذکورہ بالا خط لکھا تھا۔

مولانا رحیم آبادی کی وفات کے بعد جو لوگ اس تحریک کے علم بردار بنے ہیں۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگر سید صاحب کا یہ اظہار افسوس کہ ”از قبیلہ مجنوں کسے نہ ماند“ (مجنوں کے قبیلے کا اب کوئی باقی نہیں رہا) آپ کے نزدیک صحیح نہیں ہے اور آپ درحقیقت ”قبیلہ مجنوں“ سے تعلق رکھتے ہیں تو اس کے جواب میں خاموش کیوں ہیں؟ انگریز کے زمانے میں خاموش رہ جانے کے بعد مصلحت تو خیر کچھ سمجھ میں آسکتی ہے مگر ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے بعد خاموش رہنے کے تو کوئی معنی نہیں ہیں۔ اب تو ملت اور جماعت کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ اپنی انقلابی کوششوں اور سیاسی کارگزاریوں کی ایک ایک بات منظر عام پر لائی جائے۔ بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ معاندین الٹا پر دہیکنڈہ کر کے ہمیں بدنام کر رہے ہیں اور ہمارے اکابر کے وقار کو گرا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

—————۴—————

www.KitaboSunnat.com

ہندوستان میں تحریک اہل حدیث

اس تحریک کی عمارت اصول کے لحاظ سے ٹھیک انہیں بنیادوں پر قائم ہے جن پر خود اسلام کی بنیاد کھڑی ہے اس لئے اس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اسلام کی۔ لیکن میرا موضوع محدود ہے مجھے صرف ہندوستان کی تحریک اہل حدیث پر (اور وہ بھی سیاسی خدمات کے نقطہ نظر سے) ایک سرسری نگاہ ڈالنی ہے۔ اس لئے اسکی عمومی تاریخ سے قطع نظر کرتے ہوئے میں اپنے موضوع کے حدود میں رہ کر ہی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

تحریک اہل حدیث اور اس کی دعوت کے
تحریک کا اجمالی تعارف | تعارف، اور اس کے اثرات اور کارناموں کے متعلق ہم اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے ہندوستان کے ایک ایسے عالم کی تحریریں کے کچھ اقتباسات پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جنکی علمی جلالت اور تاریخی بصیرت کا لوہا دنیا مان چکی ہے وہ ہیں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم، سید صاحب لکھتے ہیں۔

لے ہندوستان سے میری مراد غیر منقسم ہندوستان ہے اس لئے ملک کا وہ حصہ جو آج پاکستان کے نام سے موسوم ہے وہ بھی اس میں داخل ہے ۱۲، منہ

ہندوستان پر اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہوئی کہ عین تنزلی اور سقوط کے آغاز میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے وجود نے مسلمانوں کی اصلاح و دعوت کا ایک نیا نظام مرتب کر دیا تھا، اور وہ "سجوع الی دین السلف الصالح" ہے اس دعوت نے ہندوستان میں فروغ حاصل کیا۔ اور گویا سی حیثیت سے وہ ناکام رہا۔ تاہم نظری و مذہبی و علمی حیثیت سے اسکی جڑیں مضبوط بنیادوں پر قائم رہیں۔ جنکو ہندوستان کا سیاسی انقلاب بھی اپنی جگہ سے ہلانہ سکا۔

اس تحریک کا اولین اصول یہ تھا کہ اسلام کو بدعات سے پاک کر کے علم و عمل میں سلف صالحین کی راہ پر چلنے کی دعوت مسلمانوں کو دی جائے اور مسائل فقہیہ میں فقہائے محدثین کے طرز کو اختیار کیا جائے۔

اسی زمانے میں اور نجد میں اس تحریک کی تجدید کا خیال پیدا ہوا جسکو

عہ یہاں سید صاحب ہی کی طرف سے ایک حاشیہ ہے جس میں وہ فرماتے ہیں "لوگوں نے اس کو بھی مختلف غیر مسئلہ بنا رکھا ہے کہ وہ فقہ میں کیا تھے؟ حضرت شاہ صاحب نے اپنے سوانح حیات "الجزء اللطیف" کے آخر میں اپنے کو خود ہی بتا دیا ہے کہ وہ کہا تھے فرماتے ہیں :- "و بعد ملاحظہ کتب مذاہب اربعہ و اصول فقہ ایشاں و احادیث کہ متمسک ایشاں است قرار داد خاطر بعد و نور غیبی روش فقہاء محدثین افتاد" (یعنی مذاہب اربعہ کی فقہ اور ان کی اصول فقہ کی کتابوں اور ان احادیث کے غائر مطالعہ کے بعد جن سے وہ حضرات اپنے مسائل میں استناد فرماتے ہیں نو غیبی کی مدد سے فقہاء محدثین کا طریقہ دل نشیں ہوا)

ساتویں صدی کے آخر اور آٹھویں کے شروع میں علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم نے مصر و شام میں شروع کیا تھا۔ اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ائمہ مجتہدین کی منہج تقلید اور بے دلیل پیروی سے آزاد کر کے عقائد و اعمال میں اصل کتاب و سنت کی اتباع کی دعوت دی جائے۔ مولانا اسماعیل شہیدؒ کے عہد میں یہ تحریک ہندوستان تک بھی پہنچی اور خالص دلی الہی تحریک کے ساتھ آکر منظم ہو گئی۔ اسی کا نام ہندوستان میں اہلحدیث ہے (مقدمہ سندھی افکار پر ایک نظر)

سید صاحب کے اس بیان کے مندرجہ ذیل چند فوائد خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔
(الف) ہندوستان میں جس دینی تحریک اور دعوت و مسلک کا نام ”اہلحدیث“ ہے وہ خالص دلی الہی تحریک ہے۔ بالفاظ دیگر ہندوستان میں اس تحریک کے داعی اول حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ ہیں۔

(ب) اس تحریک کا اولین اصول اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ اسلام کو بدعات سے پاک کیا جائے اور مسلمانوں کو منہج تقلید اور ائمہ مجتہدین کی بے دلیل پیروی سے آزاد کر کے عقائد و اعمال میں اصل کتاب و سنت کی اتباع کی دعوت دی جائے۔

(ج) اس تحریک کو فروغ اور عروج مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں حاصل ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ کی پیدائش ۱۱۶۱ھ اور وفات

۱۱۶۲ھ میں ہوئی۔ اس لحاظ سے آپ کی ولادت ہندوستان کے مشہور وینڈر بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے چار سال پہلے ہوئی۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اب تک ہندوستان کتاب و سنت کی روشنی سے یکسر محروم تھا۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ تقلید جاد کے بندھنوں سے آزاد ہو کر فقہائے محدثین کے طریق پر براہ راست کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو متمسک قرار دینا۔ اس ذہن و فکر کی بنیاد حضرت شاہ صاحب ہی نے ڈالی ہے۔ اسلئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان میں مسلک اہل حدیث اور تحریک اہل حدیث کے سب سے پہلے مؤسس اور داعی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ ہی ہیں۔ شاہ صاحب موصوف نے اپنی تصانیف میں تقلید اور عمل بالحدیث کے مسلک کو خوب نکھارا ہے۔ بالخصوص حجتہ اللہ البالغہ میں تو حجت ہی تمام کر دی۔ اسی لئے بقول مولانا عبید اللہ سندھی حضرت شاہ اسماعیل شہید نے یہ کتاب اپنے چچا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ سے پڑھی تو اس کا عملی نمونہ نیکر میدان میں آگئے۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں۔

جب مولانا محمد اسماعیل شہید نے حجتہ اللہ امام عبدالعزیز سے پڑھی تو اپنے جد امجد کے طریقہ پر عمل شروع کر دیا۔ انھوں نے اپنی ایک خاص جماعت بھی تیار کی جو حجتہ اللہ البالغہ پر عمل کرے۔ یہ لوگ شافعیہ کی طرح رفع یدین اور آمین بالجہر کرتے تھے جیسا کہ سنن میں مروی ہے۔ اس سے دہلی کے عوام میں شورش پھیلتی رہی مگر حرب دلی اللہ کا کوئی عالم مولانا اسماعیل شہید اور ان کی جماعت

پر معترض نہ ہو سکتا تھا۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک طبع ثانی ص ۱۰۹
یہ ان کی شہادت ہے جو مولانا اسماعیل شہید کی ”خاص جماعت“ والی حدیث
سے سخت ناراض ہیں اس لئے کہنا چاہیے کہ یہ الفضل ما شہدت بہ الاعداء
کی مصداق ہے۔

شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کی تحریروں سے تفقید جامد پیرا نکارا، اور کتابے
سنت کے ساتھ براہ راست تمسک کی تاکید کے متعلق بکثرت اقتباسات
پیش کئے جاسکتے ہیں، لیکن اختصار کے خیال سے یہاں صرف ایک عبارت
نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

”و سب انسان منکم یبلغہ حدیث من احادیث نبیکم فلا یعلل
بہ ویقول انما علی علی ہذا فلان لا علی الحدیث ثم
احتال بان فہم الحدیث والقضاء بہ من شان اکمل المہر
وان الائمة لم یکنوا من تخفی علیہم ہذا الحدیث نہا ترکوا
الالوجہ ظہر لہم فی الدین من نسخ او مرجوحیۃ اعلما وانہ لیس
من الدین فی شیء ان امنتہم بنبیکم فاتبعوا خالف مذہبا و
واقفہ، کان مرضی الحق ان تشتغلوا بکتاب اللہ وسنتہ رسولہ
ابتداء، فان سئل علیکم الاخذ بہما فیہما ونعمت وان قصرت
انہما مکم فاستعینوا برأی من معنی من العلماء ما ترکوا الحق و
اصح واوفق بالسنة انتہی (تفہیمات الہیہ ص ۲۱۲ جلد اول)

ترجمہ: تم میں بہت سے ایسے آدمی ہیں جن کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کی حدیثوں میں سے کوئی حدیث پہنچتی ہے لیکن وہ اس پر عمل نہیں کرتے۔ بلکہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا عمل فلاں امام کے مذہب پر ہے حدیث پر نہیں ہے۔ اس کے لئے وہ حیلہ بیان کرتے ہیں کہ حدیثوں کا سمجھنا اور ان کے مطابق فیصلہ کرنا ماہرین اور باکمال اماموں کا کام ہے ہمارے امام ایسے نہ تھے جنکو یہ حدیثیں نہ معلوم رہی ہوں۔ اس لئے جب رجان بوجھکر انہوں نے اس حدیث کو چھوڑ دیا ہے تو ضرور اس کی کوئی وجہ ہے۔ یا تو یہ حدیث منسوخ ہے یا مرجوح ہے۔ (شاہ صاحب اس حیلہ کے جواب میں فرماتے ہیں) خوب جان لو کہ (تمہارے) اس (حیلہ) کا دین سے کچھ بھی لگا نہیں ہے۔ اگر تم اپنے نبی علیہ السلام پر ایمان لائے ہو تو ہر حال میں ان کی اتباع کرو۔ خواہ ان کی بات کسی امام کے مذہب کے موافق ہو یا مخالف۔ (یہ بھی جان لو کہ) اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبی علیہ السلام کی سنت کے ساتھ سب سے پہلے مشغولیت اختیار کرو۔ اگر قرآن اور حدیث کو خود سمجھ لو تو اس سے بہتر کیا ہے اور اگر تمہاری سمجھ اس سے قاصر ہو تو گذشتہ علماء کی راہوں سے مدد لو ان میں سے جس کی بات کو حق پاؤ اور سنت کے موافق دیکھو اسکو لے لو۔

اس اقتباس میں شاہ صاحب نے کتاب و سنت کے ساتھ جس طرح کا اشتغال اختیار کرنے کو اللہ تعالیٰ کی "پسندیدہ بات" قرار دیا ہے۔ اور قرآن و حدیث

کے ساتھ جس طریق عمل کو اختیار کرنے کی مسلمانوں کو دعوت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اہلحدیث ٹھیک اسی بات کے قائل ہیں اور اسی کو اپنا مسلک جانتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی کی دعوت دیتے ہیں اس لئے بلاشبہ شاہ صاحب اہلحدیث مسلک کے داعی، مؤسس اور مقتدا تھے۔

شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کا ان کے بعد ان کے سعادند

مولانا اسماعیل شہیدؒ اور
تحریر اہلحدیث کی قیادت

پوتے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ پر ایسا گہرا رنگ چڑھا کہ ہزاروں مخالفتوں کے

باوجود وہ دن بدن شوخ ہی ہوتا گیا۔ سید احمد شہید علیہ الرحمۃ کے ہاتھ پر لاریت و جہاد کی بیعت کر چکے ہیں اس کے باوجود اپنے مسلک پر پختگی کے ساتھ قائم ہیں سید شہیدؒ فقہی فروعات میں عملاً حنفی ہی تھے۔ مگر شاہ شہید کی دعوت سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی جماعت (اہلحدیث) کے سرپرست بن گئے ایک انگریز ریسرچر جس اوکسلے کا بیان ہے۔

”سید احمد بریلوی کی جماعت دو مختلف اور متضاد گروہوں سے مرکب تھی۔ جنہیں متحد رکھنے میں وہ مدت العمر ساعی رہے ان میں سے ایک گروہ کے سرور مولوی عبدالحی اور مولوی کرامت علی جوہر پوری تھے جو اہل سنت کا طریقہ رکھتے تھے۔ اور دوسرے گروہ کے سرور مولوی اسماعیل تھے جو چاروں اماموں کی تقلید سے آزاد تھے اور براہ راست حدیث کو اپنا ماخذ قرار دیتے تھے۔ خود سید صاحب عمل کے اعتبار سے حنفی تھے مگر اسی کے ساتھ مولوی اسماعیل کی جماعت کی سرپرستی کرتے تھے جو اپنے کو محدثی سے کہتے تھے“ (رہن مستقبلین)

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے بیان کا ایک اقتباس اور نقل ہو چکا ہے جس میں انھوں نے صاف صاف تسلیم کیا ہے کہ ”مولانا شہید نے ایک خاص جماعت تیار کی تھی جو حجۃ اللہ البالغہ پر عمل کرے۔ یہ لوگ شافعیہ کی طرح رفع یدین اور آمین بالجہر کرتے تھے۔“

یہی بات مولانا سندھی نے ایک دوسرے مقام پر بھی کہی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:-

”مولانا شہید نے حجۃ اللہ پڑھنے کے بعد اس پر عمل کرنے والی ایک جماعت بنائی تھی یہ لوگ رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرتے“

شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک ص ۱۳۰

تقلید شخصی کی بابت شاہ شہیدؒ کیا عقیدہ رکھتے تھے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل عبارت سے ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ قد غلا الناس فی التقليد ولتعصبوا فی التزام تقلید شخص معین حتی منعوا الاجتماع فی مسئلہ ومنعوا تقلید غیر اصامہ فی بعض المسائل وهذا ہی الداء العضال الی اهلك الشیعہ ففعلوا ایضاً اشرفوا علی هلاک وتنویر العینین ص ۳۴

ترجمہ ”لوگوں نے تقلید کے بارے میں غلو کیا ہے اور کسی ایک شخص کی تقلید کا التزام کر کے تعصب برتا ہے۔ یہ لوگ کسی ایک مسئلہ میں بھی اجتہاد کو جائز نہیں سمجھتے اور اپنے امام کے علاوہ کسی دوسرے امام کی بات ماننے سے منع کرتے ہیں۔ یہی وہ خطرناک اور مہلک مرض ہے جس نے شیعوں کو ہلاک کر دیا پس یہ لوگ بھی ہلاکت ہی کے کنارے کھڑے ہیں۔“

اسی ”تنویر العینین“ میں شاہ شہید دوسری جگہ لکھتے ہیں کیفند مجوزہ التزام
تقلید شخص معین مع تکرر الرجوع الی الروایات المنقولۃ عن النبی صلی اللہ علیہ
لہ الصریحۃ الدالۃ خلاف قول الامام المقلد (ص) یعنی کسی خاص
شخص کی تقلید کو اپنے اوپر لازم کر لینا، کیسے جائز ہوگا جبکہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی صاف اور صریح احادیث ہم کو ملتی ہیں جو امام کے
قول کے خلاف ہیں۔“

ان اقتباسات سے صاف واضح ہے کہ مولانا اسماعیل شہیدؒ اہلحدیث
مقلد تھے۔

کسی زمانے میں دیوبند سے ایک سالہ
رسالہ المفتی کا ایک غلط جواب | ”المفتی“ کے نام سے شائع ہوا تھا

اس میں مولانا اسماعیل شہیدؒ کے عقیدہ اور مسلک کے متعلق ایک فتویٰ شائع ہوا
ہے مفتی صاحب نے مولانا شہید کو حنفی مقلد بتایا ہے۔ سوال و جواب اصل
الفاظ میں درج ذیل ہیں۔

”مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کو غیر مقلدین یہ کہتے ہیں کہ وہ غیر مقلد تھے
دریافت طلب امر یہ ہے کہ حقیقت میں وہ غیر مقلد تھے یا حنفی تھے؟
جیسا کہ بعض علماء دیوبند کہتے ہیں۔ اگر حنفی المذہب تھے تو اسکے
ثبوت میں ان کی کوئی تصنیف اردو یا بدرجہ مجبوری فارسی کی
ہو جس سے ثابت ہوتا ہو کہ حنفی المذہب تھے۔ آپ پیش کر سکتے
ہیں۔ اگر وہ خلاف خواستہ غیر مقلد ہیں تو ان کی تصانیف کو دیکھنا

کیسا ہے۔ اور علماء دیوبند ان کی بہت حمایت کرتے ہیں اگر وہ غیر مقلد ہیں تو ان کی حمایت کرنے سے کیا فائدہ، جھکو ایک شخص نے تقویۃ الایمان کا حوالہ دکھایا ہے جمیں ایک فیصل ہے بیان ”در رد تقلید“ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض دیگر تصانیف مولانا مرحوم موجود ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اہل حدیث تھے۔ وہ پافٹ طلب امر یہ ہے کہ یہ دعویٰ ان کا صحیح ہے یا غلط؟ اور ان کی تصنیف علاوہ ”تقویۃ الایمان“ کے اور ”صراط مستقیم“ اور ”منصب امامت“ کے دوسری بھی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ الحمد پیش تھے؟

”منصب امامت“ اور ”صراط مستقیم“ کے مسائل سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ حنفی المذہب ہونا؟

مہربانی فرما کر کے چاروں باتوں کا جواب دیا جائے کیونکہ ان کے متعلق متضاد حالات مشہور ہو رہے ہیں

حضرت مولانا اسماعیل شہید حنفی المذہب عالم ربانی اور بزرگ

الجواب تھے۔ اور رد بدعات میں بہت زیادہ سماعی تھے۔ ہر دینی کام

میں جہاں بھی غلط دیکھتے تھے اس کا رد فرماتے تھے۔ مسئلہ تقلید میں بھی ہندستان

میں افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے جیسا کہ غیر مقلدین نے تقلید میں تفریط

کی، اور تقلید کو شرک، مقلدین کو مشرک قرار دیا۔ ائمہ سلف پر طعن و تشنیع

کو شیوہ بنالیا۔ اسی طرح بعض مقلدین نے تقلید میں غلو اور افراط سے کام

۳۳

لیا کہ ائمہ مجتہدین کو چھوڑ کر ہر پیر و فقیر کی تقلید شروع کر دی خواہ اس کا فعل قول شریعت کے دائرہ میں ہو یا نہ ہو۔

تقویۃ الایمان میں چونکہ تمام رسوم بدعیہ پر رد لکھا گیا ہے اس لئے اس غلو اور افراط فی التقليد کو بھی منع فرمایا گیا ہے۔ اسی کے متعلق یہ فصل لکھی گئی ہے جیسا کہ خود تقویۃ الایمان کی عبارت مندرجہ ذیل سے معلوم ہوتا ہے۔

”سو سننا چاہیے کہ اکثر لوگ مولویوں اور درویشوں کے کلام اور کام کو سن کر سند پکڑتے ہیں (الی قولہ) ان مولویوں اور درویشوں کے قول و فعل کے خلاف کوئی آیت یا حدیث پڑھے تو اس کا انکار اور اس کے مطلب میں تکرار کر نیکی موجود ہے۔“ اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت شہید مطلقاً تقلید کو منع نہیں فرماتے بلکہ صرف اس غلو اور افراط کو روکتے ہیں کہ ائمہ دین مجتہدین سے گذر کر ہر کس ناکس کی تقلید اختیار کر لی جائے چنانچہ اسی فصل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کی خود ہدایت فرمائی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

”تو ایسی بات پر یعنی جہیں کوئی نص صریح قرآن و حدیث و اجماع میں موجود نہ ہو مجتہدوں کے قیاس صحیح کے موافق عمل کرے، پر وہ مجتہد بھی ایسا ہو کہ جس کا اجتہاد امت کے اکثر عالم مسلمانوں نے قبول کیا ہو جیسے امام اعظم اور امام شافعی اور امام مالک اور امام احمد الخ فقط والہ تعالیٰ اعلم درسالہ المفتی رلیو بند بابت ماہ ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۰ھ ص ۳۸۳

رسالہ ”المفتی“ کا یہ سوال و جواب اخبار المحدثات امرتسر جلد ۳۷ ص ۷۱

دیابت ۳۷ ص ۷۱ مطابق ۱۳ مارچ ۱۳۷۲ھ سے ماخوذ ہے۔ اس جواب

میں مفتی صاحب نے عبارتوں کے نقل کرنے میں جو خیانت کی ہے اس کا پردہ فاش کرنے سے پہلے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مفتی صاحب نے اہلحدیث پر یہ غلط الزام لگایا ہے کہ انہوں نے لا ائمہ سلف پر طعن و تشنیع کو شیوہ بنالیا ہے؛ بلکہ یہ انہیں کے اکابر کا شیوہ ہے۔ ثبوت کیلئے ”انتقادِ صحیح بحباب ذیل رکعات تراویح“ از ص ۲ تا ص ۳۳ ملاحظہ کیجئے۔ اس کتاب میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا خلیل احمد بہار پور رح، مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد حسن سنبل، ان سب حضرات کی کتابوں سے وہ عبارتیں نقل کر دی گئی ہیں جن میں صرف طعن و تشنیع کے فقرے ہی نہیں ہیں بلکہ بعض ایسی گندی اور فحش گالیاں تک موجود ہیں جن کو پڑھ کر شرارت اور انسانیت پانی پانی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اہلحدیث کے متعلق مفتی صاحب کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ وہ ہر قسم کی تقلید کو ”شُرک“ قرار دیتے ہیں۔ اہل حدیث اُسی تقلید کو ”شُرک“ قرار دیتے ہیں جس کو خود مولانا شہیدؒ نے بھی شرک ہی فرمایا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ مولانا شہید کا یہ ارشاد مقبولۃ الایمان کی اُسی فصل میں موجود ہے جس کے حوالہ سے مفتی صاحب نے اپنے جواب میں عبارتیں نقل کی ہیں۔ چنانچہ مولانا شہیدؒ فرماتے ہیں۔

اور جیسے خدا کے حکم کو ماننا دیکھتے ہی اور کسی مولوی درویش کا حکم ماننا شرک ہے۔ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی اتَّخَذُوا اٰجِبَارَہُمْ وَرَبَّہَا نَحْمَدُہٗ اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ وَ مَا اَمْرُہَا

الا لیعبدواللہما قحدا الا اللہ الا ہو سبحانہ عما یشرکون ۛ

اس آیت کا ترجمہ کرنے کے بعد فائدہ کے ذیل میں لکھتے ہیں

یعنی اللہ کو تو بڑا مالک سمجھتے ہیں اور اس سے چھوٹے اور مالک ٹھہراتے ہیں۔ عیسیٰ مسیح پیغمبر اور مولوی اور درویش کہ ان کا بھی حکم اپنے اوپر واجب اور فرض سمجھتے ہیں جیسا اللہ کا حکم، حالانکہ اس بات کا ان کو حکم نہیں ہوا۔ اور اس سے ان پر شرک ثابت ہوتا ہے اور اللہ نرالا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ نہ چھوٹا، نہ بڑا، نہ عیسیٰ مسیح پیغمبر، نہ مولوی، نہ درویش، بلکہ سب اسکے بندے ہیں خود مملوک، پھر یہ کہاں سے خود حاکم و مالک ہو گئے کہ اپنی مائے سے مسئلہ بتادیں۔ اور خدا کے حکم اور قرآن میں اپنے حکم کو دخل دیں۔

تقریبۃ الایمان کی چوتھی فصل میں مولانا شبید لکھتے ہیں۔

”اللہ کے نزدیک پہنچنے کی راہ بندوں تک رسول ہی کی ٹھہرتی ہے، جو کوئی کسی امام کی یا مجتہد کی یا غوث و قطب کی یا مولوی و مشائخ کی..... بات کو اور ان کی راہ و رسم کو رسول کے فرمانے سے مقدم سمجھے اور آیت و حدیث کے مقابل میں پیر و استاد کے قول کی سند پکڑے... مسوائی باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے۔“ بلکہ اصل حاکم اللہ ہے اور پیغمبر خبر دینے والا ہے۔ پھر جو کسی کی بات اس کی خبر کے موافق ہو تو مانئے اور جو موافق نہ ہو تو نہ مانئے۔“

تقلید کی اسی صورت کو اہل حدیث شرک کہتے ہیں۔ ہر قسم کی تقلید کو وہ شرک نہیں کہتے اور نہ ہر مقلد کو مشرک قرار دیتے ہیں۔ مفتی دیوبند کا یہ بہتان ہر ذرا با مفتی دیوبند کا یہ دعویٰ کہ مولانا شہید حنفی المذہب عالم تھے اور تقویۃ الایمان میں رد تقلید کی جو فصل لکھی گئی ہے وہ ہر کس و ناکس کی تقلید سے روکنے کیلئے لکھی گئی ہے۔ اس کا ائمہ مجتہدین کی تقلید کا رد کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ ان ائمہ کی تقلید کرنے کی تو خود مولانا شہید نے اسی فصل میں ہدایت فرمائی ہے :- ”تو اس کے جواب میں ہم سب سے پہلے اپنے قارئین ہی کو تکلیف دینا چاہتے ہیں کہ ان کے پاس اگر ”تقویۃ الایمان“ مع تذکیر الاخوان“ موجود ہو تو مہربانی کر کے وہ براہ راست اس بحث کو اس کتاب میں پڑھیں۔ تاکہ ان کو پورا اندازہ ہو جائے کہ اس موقع پر مفتی دیوبند نے اپنے سائل کو کیا فریب اور مغالطہ دیا ہے۔

تذکیر الاخوان رجوع تقویۃ الایمان کے دوسرے حصہ کا ترجمہ ہے، میں ایک عنوان ہے :- ”الْفَصْلُ السَّادِسُ فِي سَدِّ دُبَابِ عَنِ التَّقْلِيدِ“ (فصل چھٹی تقلید کی بدعت کے رد کے بیان میں) اسی فصل میں شاہ شہید نے اس مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ سات صفحات میں یہ بحث پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور حدیثیں اس سلسلہ میں انھوں نے ذکر کی ہیں یہ کتاب سب کے پاس موجود نہ ہوگی اس لئے کچھ اقتباسات ہم یہاں اس سے نقل کر دیتے ہیں جس سے مفتی دیوبند کے اس فریب کا حال معلوم ہو جائے گا کہ اس فصل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کا رد ہے یا نہیں؟ نیز شاہ شہید نے ائمہ کی جس تقلید کی ہدایت فرمائی ہے اسکی حقیقت کیا ہے؟

اپنے دعوے کے ثبوت میں مفتی دیوبند نے عبارت کا جتنا ٹکرا پیش کیا ہے یہ بہت ناقص اور نامکمل ہے اس سے شاہ شہید کا مقصد پوری طرح ادا نہیں ہوتا اس کے ساتھ اس کے بعد والی عبارتوں کے ملانے سے پورا مطلب حل ہوتا ہے مندرجہ ذیل اقتباس پڑھئے۔

”کوئی ان مولویوں و درویشوں کے قول و فعل کے خلاف آیت اور حدیث پڑھے تو اس کا انکار اور اُس کے مطلب میں تکرار کرنے کو موجود ہو جاتے ہیں اور ایمان کے جاتے رہنے کا کچھ لحاظ نہیں کرتے۔ اور اصل بات یہ ہے کہ حاکم مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس کے حکم کو ماننا چاہیے اس کے سوا اور کسی کا حکم نہ مانے اور رسول کا حکم ماننا بھی خدا ہی کا حکم ہے۔ خود پیغمبر بھی حاکم نہیں، پھر اور کوئی مجتہد اور فقیہ اور مولوی، مفتی، قاضی، ملا، طالب علم اور غوث قطب اور ولی اور پیر، شہید اور پیر زادے، خادم، مجاور، مرید تو کس گنتی اور شمار میں ہیں“

دیکھئے مولانا شہیدؒ نے مولوی، ملا، مفتی، قاضی، شہید، پیر، ولی وغیرہ کے حکم کو جس درجے میں رکھا ہے اسی درجہ میں مجتہد اور فقیہ، کے حکم کو بھی شمار کیا ہے اس لئے یہ تاویل کرنا کہ تقویۃ الایمان کی اس فصل کا تعلق صرف مولویوں اور درویشوں کی تقلید سے ہے۔ ائمہ مجتہدین کی تقلید سے نہیں ہے یقیناً باطل ہے۔ اسی فصل میں اور اسی سلسلہ بحث میں مولانا شہیدؒ کی یہ صاف و صریح ہدایت موجود ہے۔

”غرضیکہ مسلمانوں کو چاہیے کہ جب تک مسئلہ قرآن و حدیث سے

ثابت نہ ہو تب تک مجتہد کی پیروی و تقلید نہ کرے، اور تحقیق کی فکر میں رہے اور کوشش کرے، محض تقلید ہی پر خاطر جمع کر کے نہ بیٹھ رہے۔ پھر جب قرآن و حدیث سے خلاف مجتہد کا.....

ثابت ہو جاوے تو اسکے موافق عمل کرے پھر تقلید حرام ہے۔
بتائیے اگر مجتہدین کی جادہ تقلید کی تردید اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتی ہے، صاف صاف فرماتے ہیں کہ کسی امام اور مجتہد کی تقلید پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ رہے۔ تحقیق کی فکر میں رہے۔ قرآن و حدیث میں مجتہد اور امام کی بات کی دلیل تلاش کرے اگر اس کی بات قرآن و حدیث کے موافق ہو تو مانے اور اگر خلاف ثابت ہو تو اس کی بات چھوڑ دے۔ ایسی صورت میں اس مجتہد اور امام کی تقلید کرنا حرام ہے۔

اب خود فیصلہ کیجئے کہ مولانا شہیدؒ حنفی المذہب، عالم اور مقلد تھے یا المحدث اور غیر مقلد تھے؟ نیز یہ بھی فیصلہ کیجئے کہ تقویۃ الایمان کی اس فصل کا تعلق اگر مجتہدین کی تقلید سے ہے یا نہیں۔ اسی فصل کے ذیل میں آگے چل کر لکھتے ہیں:-

”یہ عجب حیرت کی بات ہے کہ آپ صرف و نحو و لغت و منطق و بیان و معانی و اصول و تفسیر و حدیث سب علم پڑھکر حقیقت کو دریافت نہ کریں کہ یہ مسئلہ کس آیت اور کس حدیث سے نکلا ہے؟ اور کہاں سے لکھا ہے؟ اور بنا اس مسئلہ کی کس بات پر ہے؟ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اپنی آنکھیں بھینچ کے بند کر لے اور

۴۰

اندھے کی طرح اوروں کی آواز کے پیچھے چلے۔ مسائل فقہی انھیں لوگوں کے واسطے ہیں جو قرآن و حدیث کا مطلب سمجھ نہیں سکتے اور جو عالم اصول اور تفسیر اور حدیث و لغت و نحو جانتا ہو اسکو یہی چاہیے کہ ہر مسئلہ کو اصول کے قواعد کے موافق قرآن و حدیث کے مقابل کرے اگر موافق پاوے تو عمل کرے اور اگر مخالف پاوے تو اسکو رد کرے اور نہ مانے پھر کسی کا قول ہو خواہ امام کا خواہ مشائخ کا۔ کیا تعجب ہے کہ اس امام و مشائخ کو غلطی ہو گئی ہو اس واسطے کہ سوائے پیغمبر کے کوئی معصوم نہیں۔ اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے کہ المجتہد غلطی یعنی مجتہد کبھی خطا بھی کر جاتا ہے تو واقف کار پر فرض ہے کہ اس خطا کو مٹا کر درست کر دے۔

اس اقتباس کو بار بار پڑھئے اور اندازہ کیجئے کہ ”المفتی“ کے محیب نے انصاف و دیانت کا کس طرح خون کیا ہے۔ اور اپنے سائل کو کیا مغالطہ اور دھوکہ دیا ہے؟

اب آئیے ہم آپ کو بتائیں کہ مولانا شہیدؒ نے ائمہ مجتہدین کی تقلید کی جو ”ہدایت“ فرمائی ہے اسکی حقیقت کیا ہے؟ مفتی دیوبند نے اپنے دعوے کے ثبوت میں جو عبارت نقل کی ہے وہ ناقص ہے پوری عبارت پڑھئے تو حقیقت واضح ہو۔ مولانا شہیدؒ فرماتے ہیں۔

”اور جو مسئلہ قرآن میں مفصل مذکور نہیں اس کا حال حدیث سے دریافت کرے اور جو حدیث میں بھی صریح بیان نہ ہو وہ پیغمبر خدا

۴۱

صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابوں کے اجماع سے دریافت کر کے اس اجماع کے موافق عمل کرے اس واسطے کہ حدیث کی رو سے صحابہؓ کے اجماع کی پیروی کرنے کا حکم ثابت ہے، پھر جو مسئلہ اجماع سے ثابت نہ ہو یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کے وقت میں ایسا واقع نہ ہوا ہو جو اس پر وہ حکم ٹھہرا کر اجماع کرتے تو ایسی بات پر مجتہدوں کے قیاس صحیح کے موافق عمل کرے پھر وہ مجتہد بھی ایسا ہو کہ جس کا اجتہاد امت کے اکثر عالم مسلمانوں نے قبول کیا ہو جیسے امام اعظم اور امام شافعیؒ اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ اور قیاس بھی فاسد نہ ہو۔

غور کیجئے مولانا شہید نے یہ ”ہدایت“ نہیں فرمائی ہے کہ اس زمانے میں چاروں اماموں میں سے کسی ایک امام کے قول ”ہی کو حجت اور سند مانے اور ہر شرعی مسئلہ میں انھیں کے ”قول“ کی اتباع اور پیروی کرے جیسا کہ حنفی مذہب کی کتابوں میں لکھا ہے، بلکہ مولانا شہید کی ”ہدایت“ تو یہ ہے کہ ہر شرعی مسئلہ کا حکم پہلے قرآن پاک سے دریافت کرے اگر قرآن میں وہ مسئلہ مذکور نہ ہو تب حدیث سے اسکا حال دریافت کرے اگر حدیث میں بھی اسکا صریح بیان نہ ہو تب صحابہ کے اجماع سے دریافت کرے۔ اگر صحابہ کے اجماع سے بھی اس مسئلہ کا حکم معلوم نہ ہو اس لئے کہ صحابہ کے زمانے میں کوئی ایسا واقعہ پیش ہی نہ آیا تھا تب ایسی مجبوری کی صورت میں مجتہدوں کے قیاس پر عمل کرے۔ مگر اس کے لئے بھی مولانا شہید نے دو قیدیں بیان کی ہیں ایک یہ کہ وہ قیاس صحیح ہو فاسد نہ ہو اور دوسری یہ کہ وہ مجتہد ایسا ہو جس کے اجتہاد کو اکثر مسلمانوں

اور عالموں نے قبول کیا ہو۔ اس موقع پر مولانا شہید نے چاروں اماموں کے ناموں کو بطور مثال کے پیش کیا ہے۔ یہ نہیں کہا ہے کہ اجتہاد انہیں چاروں پر ختم ہو گیا ہو اور ان چاروں کے علاوہ کسی دوسرے مجتہد کا اجتہاد نہ صحیح ہو سکتا ہے اور نہ قابل قبول۔

اب پوچھئے ان سے جو یہ کہتے ہیں کہ مولانا شہید نے ائمہ مجتہدین کی تقلید کی ہدایت فرمائی ہے کیا ان حضرات کے نزدیک بھی ائمہ کی تقلید کی ہی ہوتی ہے؟ کیا اس زمانے میں کسی عالم کے لئے ان کے نزدیک بھی یہ درست ہے کہ وہ براہ راست قرآن مجید اور حدیث اور اجماع صحابہ سے شرعی مسائل کو دریافت کرے یعنی استنباط کرے؟ کیا یہ بھی کہتے ہیں کہ ائمہ مجتہدین کے قیاسی مسائل کو قرآن اور حدیث سے مقابلہ کر کے جانچنا چاہیے کہ یہ قیاس صحیح ہو یا فاسد؟ اگر صحیح ثابت ہو یعنی قرآن اور حدیث کے موافق ہو تو قبول کرے اور اگر خلاف ہو تو رد کر دے۔ اگر یہی وہ تقلید ہے جس کے علماء دیوبند قائل ہیں۔ تو ہم ہزار بار اسکو خوش آئند کہتے ہیں۔ ہم ہرگز اس تقلید کے مخالف اور منکر نہیں ہیں۔ اس تقلید کا قائل ہونے کی وجہ سے اگر مولانا شہید حنفی المذہب عالم ہو سکتے ہیں تو پھر دنیا کا کوئی اہل حدیث عالم ایسا نہیں ہے جسکو ”حنفی المذہب“ نہ کہا جاسکے۔

یہ گفتگو تو ”تقویۃ الایمان“ کی عبارت پر ہوئی۔ اب مولانا شہید کی دوسری کتابوں کا حال سنئے! قارئین کو یاد ہو گا کہ رسالہ ”المفتی“ کے رسائل نے مولانا شہید کے حنفی المذہب ہونے کا ثبوت ان کی دوسری کتابوں سے بھی طلب کیا

۴۳

تھا لیکن منقہ دیوبند نے اس کے جواب میں خاموشی اختیار کی ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ منقہ صاحب کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ مگر الحمد للہ ہمارے پاس اس کا جواب موجود ہے اور وہ جواب یہ ہے کہ مولانا شہید کی دوسری کتابوں سے بھی ان کا اہلحدیث ہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے رسالہ ”تنویر العینین“ کے حوالے سے دو عبارتیں ہم اوپر نقل کر چکے ہیں جنہیں مولانا شہید نے بڑے واضح الفاظ میں تقلید شخصی کے التزام کی مذمت کی ہے۔ اسی رسالہ میں مولانا شہید نے رفع یدین و نزاعی کے بارے میں لکھا ہے یتاب فاعلہ یعنی نمازیں رفع یدین کرنا ثواب کا کام ہے۔ آج کوئی حنفی عالم ہے جو رفع یدین کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتا ہے۔ مولانا شہید صراط مستقیم میں لکھتے ہیں۔

در اعمال، اتباع مذاہب اربعہ کہ رائج	احمال میں مذاہب اربعہ کی اتباع جو
در تمام اہل اسلام است بہتر و خوب	تمام اہل اسلام میں رائج ہے بہتر اور خوب
است لیکن علم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم	ہے لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کو کسی
را منحصر در علم یک شخص از مجتہدان نہ	ایک ہی مجتہد کے علم میں منحصر نہ جانے
داند بلکہ علم نبوی منتشر در آفاق گردید	کیونکہ علم نبوی سارے جہان میں پھیلا
است بموجب مقتضیات وقت	ہے اور مقتضائے وقت کے مطابق ہر آدمی
بہر ہر کس رسیدہ و بعد ازاں کہ کتب	کو پہنچا ہے۔ البتہ کتابوں کی تصنیف
مصنفہ شدہ جمعیت آن علوم ظاہر	کے بعد اجتماعی حالت ان علوم سے
گشتہ۔	ظاہر ہوئی۔

۴۴

پس در ہر مسئلہ کہ حدیث صحیح صریح
غیر منسوخ یا بد اتباع پیچ مجتہد در ان نہ
کند و اہل حدیث را مقتدائے خود شناسد
و بہ دل محبت ایشان دارد و تعظیم ایشان
لازم شد و کہ حاملان علم پیغمبر اند و بنوع
فائدہ مصاحبت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
حاصل کردہ مقبول جناب رسالت مآب
گشتہ اند و مقلدان تعظیم و توقیر مجتہدان
بخوبی می دانند محتاج آگاہی بران نیستند
(ص ۲۹)

پس جس مسئلہ میں حدیث صحیح صریح
غیر منسوخ پاوے اس میں کسی مجتہد
کی پیروی نہ کرے اور اہلحدیث کو اپنا
مقتدا جانے اور دل سے ان کی محبت
کرے ان کی تعظیم کو ضروری سمجھے کیونکہ
وہ لوگ علم پیغمبر کے حامل ہیں اور ایک
طرح سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت
کا شرف حاصل کر کے مقبول رسالت مآب
ہوئے ہیں اور مقلدین مجتہدوں کی تعظیم و
توقیر کو خوب جانتے ہیں بتلنے کے محتاج
نہیں ہیں۔

ان حوالوں سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ مفتی دیوبند نے اپنے
جواب میں دیانتداری سے کام نہیں لیا ہے اور ان کا یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے کہ
مولانا اسماعیل شہید علیہ الرحمۃ مقلد تھے اور حنفی المذہب عالم تھے اور انھوں نے
اکثر مجتہدین کی تقلید کی ہدایت فرمائی ہے۔ بلکہ اسکے برخلاف یہ ثابت
ہو چکا ہے کہ حضرت مولانا شہید اہلحدیث مسلک کے پیرو تھے اور اسی مسلک
پر چلنے کی انھوں نے لوگوں کو ہدایت بھی فرمائی ہے۔ مولانا شہید کی کتابوں
کے مزید حوالے مطلوب ہوں تو مولانا امام خاں نوشہروی کی کتاب "تراجم
علمائے حدیث ہند" ملاحظہ کیجئے۔ کچھ حوالے گزر چکے ہیں اور کچھ آئندہ آئیں

گئے جن سے معلوم ہوگا کہ مولانا شہید ہی کی دعوت سے ہندوستان میں اس تحریک کو فروغ ہوا۔ اور بالواسطہ یا بلاواسطہ انھیں کے فیض یافتہ مجاہدین اور سپروکار خالصین کی مساعی جلیلہ سے یہ تحریک پورے ملک میں پھیلی۔ اس لئے اس تحریک کی قیادت کا سہرا حضرت شہید ہی کے سر ہے۔

اس تحریک کے ثمرات و اثرات

اس تحریک نے ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا اثر کیا اور اسکی بدولت انھیں کس کس نوع کی اصلاح ہوئی اسکا حال جاننے کیلئے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا مندرجہ ذیل بیان پڑھئے سید صاحب فرماتے ہیں:-

اہل حدیث سکے نام سے ملک میں اسوقت بھی جو تحریک جاری ہے حقیقت کی رو سے وہ قدم نہیں صرف نقش قدم ہے۔ مولانا اسماعیل شہید جس تحریک کو لیکر اٹھے تھے وہ نقشے کے چند مسائل نہ تھے بلکہ اہم کبریٰ، توحید، خالص اور اتباع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی تعلیمات تھیں، مگر افسوس کہ میلان بکھل گیا اور باقی جو رہ گیا ہے وہ گزرے ہوئے پانی کی نقطہ لکیر ہے۔ "بہر حال اس تحریک کے جو اثرات پیدا ہوئے اور اس زمانہ سے آج تک دورادوار کی ساکن سطح میں اس سے جو جنبش ہوئی وہ بھی ہمارے لئے بجائے خود مفید اور لائق تشکر ہے۔ بہت سی بدعتوں کا استیصال ہوا، توحید کی حقیقت نکھاری گئی، قرآن پاک کی تعلیم و تفہیم کا آغاز ہوا، قرآن پاک سے براہ راست

۴۶

ہمارا رشتہ دوبارہ جوڑا گیا۔ حدیث نبوی کی تعلیم و تدریس اور تالیف و اشاعت کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ساری دنیائے اسلام میں ہندوستان ہی کو صرف اس تحریک کی بدولت یہ دولت نصیب ہوئی۔ نیز فقہ کے بہت سے مسئلوں کی چھان بین ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگوں نے غلطیاں بھی ہوئی ہوں) لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دلوں سے اتباع نبوی کا جو جذبہ گم ہو گیا تھا وہ سالہا سال تک کیلئے دوبارہ پیدا ہو گیا۔ مگر افسوس ہے کہ اب وہ بھی جا رہا ہے۔

اس تحریک کی ہمہ گیر تاثیر یہ بھی تھی کہ وہ ”جہاد“ جس کی آگ اسلام کے محبت میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی وہ پھر بھڑک اٹھی یہاں تک کہ ایک زمانہ گزرا کہ وہابی اور باغی مترادف لفظ سمجھ گئے اور کتنوں کے سر قلم ہو گئے کتنوں کو سویلوں پر لٹکنا پڑا اور کتنے پابجولاں دریائے شور عبور کر دیئے گئے یا جنگ کو ٹھڑیوں میں اٹھیں بند ہونا پڑا۔ اور اب پروہ کیا! حیات کہنا ہے کہ مولانا عبدالعزیز رحمہ آبادی کی زندگی تک تحریک کے علمبرداروں میں یہ روح کام کر رہی تھی۔

افسوس کہ قبیلہ مجنوں کے نمائند

علامہ اہلحدیث کی تدریسی و تصنیفی خدمت بھی قدر کے قابل ہو پچھلے عہد میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے قلم اور مولانا سید

نذیر حسین دہلوی کی تدریس سے بڑا فیض پہنچا۔ بھوپال ایک زمانہ تک علماء اہل حدیث کا مرکز رہا۔ قنوج، ممبھوان اور اعظم گڑھ کے بہت سے نامور اہل علم اس ادارہ میں کام کر رہے تھے۔ شیخ حسین عربی مبنی ان سب کے سرخیل تھے اور دہلی میں مولانا سید نذیر حسین صاحب کی مسند درس بھی ہوئی تھی اور جوق جوق طالبین حدیث مشرق و مغرب سے انکی درسگاہ کا رخ کر رہے تھے ان کی درسگاہ سے جو نامور اٹھے ان میں سے ایک مولانا ابراہیم صاحب آرومی تھے جنہوں نے سب سے پہلے عربی تعلیم اور عربی مدارس میں اصلاح کا خیال قائم کیا اور مدرسہ احمدیہ کی بنیاد ڈالی اس درسگاہ کے دوسرے نامور مولانا شمس الحق صاحب مرحوم ر صاحب عون المعبود، ہیں جنہوں نے کتب حدیث کی جمع اور اشاعت اپنی دولت اور زندگی کا مقصد قرار دیا اور اسمیں وہ کامیاب ہوئے اس درسگاہ کے تیسرے نامور حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری ہیں جنہوں نے درس و تدریس کے ذریعہ خدمت کی اور کہا جاسکتا ہے کہ مولانا سید نذیر حسین صاحب کے بعد درس کا اتنا بڑا حلقہ اور شاگردوں کا مجمع ان کے سوا کسی اور کو ان کے شاگردوں میں نہیں ملا۔ اس درسگاہ کے ایک اور نامور تربیت یافتہ ہمارے ضلع (اعظم گڑھ) میں مولانا عبدالرحمن صاحب مرحوم مبارکپوری تھے جنہوں نے تدریس و تحدیث کے ساتھ ساتھ جہاد

۴۸

ترسڈی کی شرح تحفۃ الاحوذی (عربی) لکھی۔

اس تحریک کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ مدت کا رنگ طبعیتوں سے دور ہوا۔ اور یہ جو خیال ہو گیا تھا کہ اب تحقیق کا دروازہ بند اور نئے اجتہاد کا راستہ مسدود ہو چکا ہے رفع ہو گیا اور لوگ از سر نو تحقیق و کاوش کے عادی ہونے لگے۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے دلائل کی خو پیدا ہوئی اور قبل و قال کے مکرر گڑھوں کی بجائے ہدایت کے اصلی سرچشمہ مصفا کی طرف راہی ہوئی۔“

(مقدمہ تراجم علمائے حدیث ہند)

سید صاحب کے اس بیان سے مندرجہ ذیل چند فوائد حاصل ہوتے ہیں:-

(الف) ہندوستان میں تحریک المجددیت کی قیادت مولانا اسماعیل شہید علیہ الرحمۃ نے فرمائی تھی را اگرچہ بقول سید صاحب ”سیلاب نکل گیا اور باقی جو رہ گیا ہے وہ گزرے ہوئے پانی کی نقطہ لکیر ہے“ تاہم یہ تو ثابت ہوا کہ اس تحریک کا ماضی شاندار ہے اور یہ ”لکیر“ اسی گزرے ہوئے سیلاب کی نشانی ہے۔ اس لئے آج جو لوگ اس ”لکیر“ کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں وہ در حقیقت مولانا شہید کی ایک نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں۔ خذلہم اللہ)

(ب) دینی خدمات اور ملی اصلاحات کی جو مختلف النوع کوششیں کامیاب ہوئیں۔ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ساری دنیائے اسلام میں ہندوستان ہی کو صرف اس تحریک کی بدولت یہ دولت نصیب ہوئی۔

(ج) اس تحریک کی ہمہ گیر تاثیر یہ بھی تھی کہ وہ ”جہاد“ جس کی آگ مسلمانوں کے

۴۹

سینوں میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی وہ پھر بھرپور اٹھی۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ گزرا کہ وہابی اور باغی مترادف سمجھے گئے۔ سید صاحب کے اس ارشاد سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ جس زمانے میں ”وہابی“ کو باغی کہہ کرادف سمجھا جاتا تھا اُس وقت ”وہابی“ سے مراد اہلحدیث تھے۔ اس عنوان پر تفصیلی گفتگو انشاء اللہ ہم آئندہ اپنے موقع پر کریں گے)

(۷) مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی رالتونی ^{۱۳۳۶ھ} ۱۹۱۸ء کی زندگی تک اس تحریک کے علمبرداروں میں جہاد کی روح کام کر رہی تھی یہ صریح تکذیب و تردید ہے ان لوگوں کی جو یہ کہتے ہیں کہ ^{۱۳۵۷ھ} ۱۹۳۷ء سے اہلحدیث عملی جہاد سے الگ ہیں)

(۸) علمائے اہلحدیث نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی جو خدمت انجام دی ہے وہ بھی قدر کے قابل ہے۔

(۹) اس تحریک کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ قرآن پاک اور احادیث رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سمجھنے اور سمجھانے کے بارے میں ذہن و فکر پر جو جمود طاری ہو گیا تھا اور مدت سے طبیعتوں پر جو زنگ بیٹھ گیا تھا وہ دور ہو گیا۔ یہ خیال رفع ہو گیا کہ اب تحقیق کا دروازہ بند اور نئے اجتہاد کا راستہ مسدود ہو چکا ہے۔ اسی تحریک کا یہ فیض ہے کہ تقلیدی اور آراء الرجال الرجال کی قیل و قال کے مکرر گر گڑھوں سے نکل کر ہدایت کے اصلی مرکز پر مصفا کی طرف واپسی ہوئی۔

سید صاحب کا دوسرا بیان | یہی مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم

سیرت سید احمد شہید، کے مقدمہ میں لکھتے ہیں ۔

تیرہویں صدی میں جب ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں شہرکانہ رسوم اور بدعات کا زور تھا، مولانا اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد بریلوی کی بنیاد پر کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی، یہ وہ وقت تھا جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندوستان پر سانگہریزوں کا قبضہ تھا۔ ان دونوں بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھایا اور مسلمانوں کو جہاد کے دعوت دی، جسکی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائی سے لیکر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی اور لوگ جوق جوق اس علم کے نیچے جمع ہونے لگے۔ اس مجددانہ کارنامہ کی عام تاریخ لوگوں کو یہیں تک معلوم ہے کہ ان مجاہدوں نے سرحد پار ہو کر سکھوں سے مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ حالانکہ یہ واقعہ اس کی پوری تاریخ کا ایک باب ہے

اسی تحریک نے اپنے پیروؤں میں للہیت، خلوص، اتحاد، نظم، سیاست اور تنظیم کا جو جو ہر پیدا کر دیا تھا۔ اس کے سمجھنے کے لئے کتاب سیرت سید احمد شہید اکاچو تھا باب کافی ہے۔ بنگال کی سرحد سے لیکر پنجاب تک اور نیپال کی ترائی سے لیکر دریائے سندھ کے ساحل تک اسلامی جوش

و عمل کا دریا موجیں مار رہا تھا اور حیرت انگیز وحدت کا سماں
 آنکھوں کو نظر آرہا تھا۔ سید صاحب کے خلفاء ہر صوبہ اور
 ولایت میں پہنچ چکے تھے اور اپنے اپنے دائرے میں
 تجدید۔ اصلاح اور تنظیم کا کام انجام دے رہے تھے بشرکات
 رسوم منائے جا رہے تھے۔ بدعتیں چھوڑی جا رہی تھیں۔
 نام کے مسلمان کام کے مسلمان بن رہے تھے۔ جو مسلمان نہ
 تھے وہ بھی اسلام کا کلمہ پڑھ رہے تھے رکھتے ہیں کہ اس تحریک
 سے چالیس ہزار غیر مسلم مسلمان ہوئے (شراب کی بوتلیں توڑی
 جا رہی تھیں۔ تاڑی اور سیندھی کے خم لٹھکائے جا رہے تھے
 بازار کی فواحش کے بازار سرد ہو رہے تھے اور حق و صداقت
 کی بلندی کیلئے علماء حجروں سے اور امراء ایوانوں سے نکل
 کر میدانوں میں آ رہے تھے اور ہر قسم کی ناچاری، مغلی اور
 غربت کے باوجود تمام ملک میں اس تحریک کے سپاہی پھیلے
 ہوئے تھے اور مجاہد تبلیغ اور دعوت میں لگے تھے ۛ

سید صاحب مرحوم کی تحریروں کے ان اقتباسات سے ہندوستان
 کی تحریک الہدیت اور پہلی دینی انقلابی تحریک (حکمی قیادت مولانا
 اسماعیل شہید اور سید احمد شہید نے فرمائی تھی) کے اثرات اور فوائد کا
 جو اجمالی نقشہ سامنے آتا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف
 نوع کے تھے۔ اور اپنی جگہ بڑے اہم اور بے حد مفید تھے۔ لیکن ہمارا

موضوع بحث محمد وہ ہے اس لئے اپنے موضوع کے لحاظ سے ہم اس تحریک کے علمبرداروں کے اوصاف حمیدہ میں سے صرف ان کے جوش جہاد کا کچھ حال مستقل عنوان کے تحت یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری لکھتے ہیں

جوش جہاد اور شوق شہادت

رج کے بعد سید احمد صاحب جب وطن واپس آگئے تو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سفر

جہاد کی تیاری کرنے لگے۔ مولانا محمد اسماعیل شہید اور مولوی عبدالحی صاحب وغیرہ علماء کو واسطے بیان کرنے مضامین ترغیب جہاد اور جہاد کے اطراف ہندوستان میں روانہ کر دیا گیا۔ اس وقت سید صاحب کے مکان پر بجائے مراقبہ و مشاہدہ اور توجہ دہی کے فضیلت ہجرت اور جہاد کا بیان اور تلوار و ہندوق کی صفائی اور قواعد و چاندیاری اور گھوڑ دوڑ ہوا کرتی تھی۔ اب بجائے صوفی و درویش کے ہر شخص سپاہی بن گیا۔ تسبیح کے عوض ہاتھ میں تلوار اور فراخ جبہ کی جگہ چیت اور خاق اور پچیدار سر بند لباس ہو گیا۔ جن لوگوں نے آپ کے تابعین کو پہلے بصورت درویشانہ ادب و لباس و وضع پایا نہ دیکھا تو ان کو سخت حیرت ہوئی تھی

ان دنوں میں جو کوئی تحفہ تحائف آپ کیلئے لیکر آتا تو اکثر ہتھیار یا گھوڑے ہوتے تھے۔ انہی دنوں میں شیخ فرزند علی صاحب غازیپور زامیمہ سے دو نہایت عمدہ گھوڑے اور بہت سی وردی کے کپڑے

مع ضلع غازیپور ریلوئی سٹیشن ایک قصبہ کا نام "زمانیہ" ہے

اور چالیس جلد قرآن مجید تحفہ لیکر آئے۔ اور سب سے عجیب تحفہ جو شیخ صاحب لیکر آئے وہ امجد نام کا ان کا ایک نوجوان بیٹا تھا جسکو انھوں نے مثل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے راہ خدا میں نذر کر کے سید صاحب کے حوالہ کر دیا اور عرض کیا کہ اسکو اپنے ساتھ لے جائیے اور تیغ کفار سے اسکی قربانی کرایئے۔ (سوانح احمدی ص ۱۶۶)

شیخ فرزند علی کی یہ نذر اللہ نے قبول کی، ان کے صاحبزادے شیخ امجد علی سکھوں سے لڑتے ہوئے بالاکوٹ کے معرکہ میں شہید ہوئے۔ ملاحظہ ہو، "سید احمد شہید" جلد دوم ص ۲۴۲۔ اور جماعت مجاہدین ص ۲۵۵۔
 مولانا خرم علی بلتوری جن کے متعلق مؤلف "تراجم علمائے حدیث ہند" نے لکھا ہے کہ "ابتداءً روش عام کے مطابق غالی مقلد تھے مگر جب قسمت نے یادری کی اور مولانا اسماعیل شہید کی مصاحبت نصیب ہوئی تو اتباع سنت کا رنگ چڑھ آیا۔ یہ بھی مجاہدین میں شامل تھے اور فضائل جہاد کی آیات و احادیث فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں بہ طریق مثنوی نظم کر دی تھیں۔ یہ نظمیں عام طور پر پڑھی جاتی تھیں۔ نظم ہی میں ان کا ایک "رسالہ جہاد یہ" ہے یہ پورا رسالہ ۵۷ اشعار پر مشتمل ہے اس میں سے چند منتخب اشعار بطور نمونہ کے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ یہ رسالہ مہر صاحب نے سید احمد شہید جلد دوم میں درج کر دیا ہے

بعد تحمید خدا، نعمت رسول اکرم
 واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمع بلا
 ہو تو قرآن و احادیث میں خوبی جہاد
 جو مسلمان رہتی میں لڑنا خطہ سب
 جو رہتی میں ہوئے ٹکڑے نہیں مرتے ہیں
 زندگی بھر کے گناہ شہداء ملتے ہیں
 قنبر قبر و غم صور و قیام محشر
 حق تعالیٰ کو مجاہدہ بہت بھاتے ہیں
 اے مسلمانوں سنی تم نے جو خوبی جہاد
 مال و اولاد کی جو رد کی محبت چھوڑ
 مال و اولاد تری قبر میں جانے کے نہیں
 گورہے جیتے تو گھر بار میں پھر آؤ گے
 ایک دن تجھ سے یہ دنیا کا مزہ چھوٹے گا
 دوستو جب تمہیں مرنا ہی مقرر ٹھہرا
 موت کا وقت معین ہے تو سن اے غافل
 جب تلک موت نہیں ہر تو نہیں مرتے ہیں
 راہ خدا میں جہاد کے جذبہ صادق ہی کا یہ ثمرہ تھا کہ سخت سے سخت
 حالت کو بھی یہ حضرات خوش اور خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر لیتے تھے
 ان کے صبر و قناعت کا ایک واقعہ سنئے۔

یہ رسالہ ہے جہاد یہ کہ لکھتا ہوں قلم
 اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
 ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا اسے کر لیا
 روحانہ خلد بریں ہو گیا ما جیب اس پر
 بلکہ وہ جیتے ہیں جنت میں خوشی کرتے ہیں
 کیوں نہ ہو، راہ خدا ان کے تو سر کھٹے ہیں
 ایسے صدیوں سے شہیدوں کو نہیں کچھ بچا
 مثل دیوار جو صف باندھ کے جم جا رہا ہے
 چلو اب اسکی طرف مت کرو گھر بار کو یاد
 رہ مولیٰ میں خوشی ہو کے شبابی روڑو
 تجھ کو دوزخ کی مصیبت سے بچانے کے نہیں
 اوروں گے مارے تو جنت میں چلے جاؤ گے
 لشکر موت ترا ملک بدن لوٹے گا
 پھر تو بہتر ہے کہ جان دیکھے مور راہ خدا
 پھر بھلا موت سے ڈرنے سے تجھے کیا حاصل
 موت جب آئی تو گھر میں بھی نہیں بچتے ہیں
 راہ خدا میں جہاد کے جذبہ صادق ہی کا یہ ثمرہ تھا کہ سخت سے سخت
 حالت کو بھی یہ حضرات خوش اور خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر لیتے تھے
 ان کے صبر و قناعت کا ایک واقعہ سنئے۔

مولوی محمد جعفر صاحب ایک جنگ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

اس لڑائی کے بعد بوجہ تنگی خرچ غازیوں پر سوائے بے خانمائی کے فاقہ کشی کی سخت تکلیف تھی سردی کا موسم تھا ملک میں برف پڑ رہی تھی۔ غازیوں کے پاس نہ ہونے کو مکان تھانہ اوڑھنے کو کپڑا اور نہ کھانے کو کوئی چیز تھی۔ اکثر چار چار فاقے کھڑے کے بیڑ کر کسی دن کسی گاؤں میں دعوت ہو گئی۔ یا کسی درخت کے پتیاں ابال کر اور نمک ملا کر بھوک کو دبا دیا۔ مگر اس پر بھی بوجہ جوش ایمانی ہر ایک غازی نہایت شاداں اور فرحانہ اور صابر و شاکر تھا رسولِ احمدی علیہ السلام

مولانا غلام رسول مہر ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

غازیوں کی لہیت و اخلاص کا اندازہ شیخ محمد اسحاق گورکھپوری کے واقعہ سے ہوگا۔ شیخ صاحب کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے ان کے لئے معاش کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لیکن حمیت دین کے جوش میں وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ایک مرتبہ مولانا شاہ اسماعیل نے وعظ میں وَالَّذِينَ آمَنُوا اسْتَدْحَبُوا لِلّٰہ کی تفسیر بیان فرمائی۔ شیخ محمد اسحاق مجلس وعظ کے بعد اپنے حجرے کا دروازہ بند کر کے لیٹ گئے۔ کھانے میں بھی شریک نہ ہوئے۔ سید صاحب نے پاس بٹھا کر کیفیت پوچھی

تو صرف اتنا عرض کیا "میری کم نصیبی ہے کہ آپ جیسے شیخ کامل کی صحبت میں بھی گمراہ ہی رہا" پھر سید صاحب نے مولانا سے وعظ کا موضوع دریافت کر کے شیخ اسحاق سے بات چیت فرمائی۔ اس وقت شیخ نے عرض کیا مولانا کے وعظ سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ جس دل میں خدا کی محبت ماسوا پر غالب نہ ہو وہ ایمان کی لذت سے محروم ہوتا ہے۔ میرے دل سے بیوی بچوں کا خیال جدا نہیں ہوتا۔ کئی تدبیریں کر چکا ہوں لیکن ناکام رہا۔ اگر ہو سکے تو یہ خیال دل سے نکال دیجئے۔

مولانا نے پوچھا آیا یہ ممکن ہے کہ بیوی بچوں کی محبت کے جوش میں لشکر اسلام کو چھوڑ کر وطن چلے جاؤ؟ شیخ نے کہا یہ ممکن نہیں۔ مولانا نے فرمایا "پھر میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے دل میں خدا و رسول کی محبت بیوی بچوں کی محبت پر غالب ہے اسکے بعد شیخ نے کھانا کھایا۔ (سید احمد شہید جلد دوم ص ۶۶)

ان کی شہادت کا واقعہ بھی شہداء بالا کوٹ کے ذکر کے سلسلے میں مہر صاحب نے خاص طور سے بیان کیا ہے لکھتے ہیں۔

"شیخ محمد اسحاق گورکھپوری کا بایاں ہاتھ جنگ مایا میں بیکار ہو چکا تھا۔ وہ بندوق نہیں چلا سکتے تھے۔ تلوار سے بھی حسب دلخواہ کام نہیں لے سکتے تھے۔ جنگ بالا کوٹ میں انہیں گنڈاسا دے دیا گیا۔ یورش کے آغاز ہی میں ان کے دائیں ہاتھ پر گولی

لگی اور وہ بھی بیکار ہو گیا۔ اسوجہ سے وہ یہ کہتے ہوئے قصبے کی جانب لوٹ پڑے کہ میں تو اب دعا کے قابل رہ گیا ہوں۔ آہستہ آہستہ قصبے میں تو زیادہ خون بہنے سے ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ جب بیکہ جنوبی سمت سے بالاکوٹ میں داخل ہوئے تو شیخ غریب اللہ گورکھپوری نے انہیں ساتھ لے جانا چاہا۔ انہیں ہوش نہ آیا۔ اٹھا کر لے جانے کی کوئی صورت نہ بنی۔ شیخ غریب اللہ دست بنے کے نالے سے ہو کر باہر نکل گئے۔ شیخ محمد اسحاق وہیں بے ہوش پڑے رہے اور اسی حالت میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ (سید احمد شہید جلد دوم ص ۴۲۶)

ان کے مزید حالات جاننے کے لئے مہر صاحب کی کتاب "جماعت مجاہدین" کا دسواں باب ملاحظہ ہو۔

"عبدالمجید خاں آفریدی جہاں آباد در رائے بریلی کے باشندے تھے۔ مجاہدین کی اس جماعت میں شریک ہو کر سرحد پہنچے جو سید صاحب کے ساتھ گئی تھی اور جسے مجاہدین کا ہراول بھٹا چاہیے۔ وہاں سب سے پہلی جنگ اکوڑہ خٹک میں پیش آئی چونکہ سکھوں کا لشکر بہت بڑا تھا اور آنے جانے میں پندرہ سو میل کا فاصلہ طے کرنا تھا اس لئے انہیں لوگوں کو منتخب کیا گیا جو قوی اور توانا تھے۔ عبدالمجید خاں ان دنوں بخاریں مبتلا رہنے کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئے تھے اس لئے ان کا نام فہرست میں شامل نہ کیا گیا انہیں جب یہ کیفیت معلوم

ہوئی تو بیتاب ہو کر سید صاحب کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا:-

حضرت! میں کوئی ایسا بیمار تو ہوں نہیں کہ چلنے کی طاقت نہ ہو۔ اور یہ پہلا معرکہ ہے جس میں جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد رکھی جائے گی۔ میرا نام ضرور شامل فرما لیجئے تاکہ سبقت کی فضیلت سے محروم نہ رہ جاؤں۔

عبدالمجید خاں کی بیتابی دیکھ کر سید صاحب نے ان کی درخواست قبول کر لی اور دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہمت میں برکت دے چنانچہ یہ جنگ میں گئے اور خاصی کمزوری کے باوجود انتہائی مردانگی دکھائی۔ چودہ آدمی ان کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ پھر ان کی تلوار ٹوٹ گئی ایک دوسرے مجاہد نے جنگ کے پاس دو تلواریں تھیں اپنی ایک تلوار ان کو دیدی۔ عبدالمجید خاں نے اس سے بھی کئی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا پھر خود بھی جام شہادت نوش کر کے، عشاء تک تھکے بدن و خون کے انعام یافتہ لوگوں میں شامل ہو گئے۔ جماعت مجاہدین ص ۱۲۳۶

مقام سمتہ کے افغانیوں نے چند غلط الزامات اور بے بنیاد بیگانیوں کی بنا پر خفیہ سازش کر کے ایک رات مجاہدین پر حملہ کر دیا اور بہتوں کو ناحق قتل کر دیا۔ حد یہ کہ بعض عشائر اور فوج کی نماز کی حالت میں شہید کئے گئے۔ انکی مظلومانہ شہادت کا حال سن کر ایک دردمند کی آنکھوں

سے آئسو جاری ہو گئے تو مولوی خدابخش صاحب رام پوری نے (جو ان مجاہدین میں شامل تھے) کہا۔

ما برائے ہمیں شہادت از مقام ہم شوق شہادت ہی لے کر دور دور دست آمدہ ایم کسانیکہ شہید شدند بہ مراد خود رسیدند کسانیکہ باقی اندہ ہمیں ارادہ دارند اللہ تعالیٰ امام مارا سلامت دار و انشا اللہ سامان جہاد باز مجتمع خواهد گردید ہمارے امام کو سلامت کھے انشا اللہ پھر جہاد کا سامان جمع ہو جائے گا۔

(جماعت مجاہدین ص ۸)

سر سید احمد خاں مرحوم مولانا اسماعیل شہید کے حالات میں لکھتے ہیں۔
 ”بموجب ارشاد سید اصفیاء یعنی پیر طریق بدلی (سید صاحب) کے اس طرح سے تقریر و وعظ کی بنا ڈالی کہ مسائل جہاد فی سبیل اللہ بیشتر بیان ہوئے اور یہاں تک آپ کے صیقل تقریر سے مسلمانوں کا آئینہ باطن مصفا اور مجلہ ہو گیا۔ اور اس طرح سے راہ حق میں سرگرم ہوئے کہ بے اختیار دل چاہنے لگا۔ سران کا راہ خدا میں فنا ہو اور جان ان کی اعلائے لوائے محمدی میں صرف ہو“ (جماعت مجاہدین ص ۸)

سید صاحب اور مولانا اسماعیل کی شہادت کے بعد جب اس تحریک کی قیادت کا بار مولانا ولایت علی عظیم آبادی نے سنبھالا تھا، اس وقت بھی

لوگ جوش جہاد اور شوق شہادت میں برابر مدت و راز تک سرحد پار پہنچتے رہے۔ اسوقت سرحد میں ان مجاہدین کا ٹھکانہ ستھانہ میں تھا اور ہندوستان میں ان کا مرکز پٹنہ تھا۔ ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے۔

صوبہ متحدہ کے ایک انگریز کارخانہ دار نیل کا بیان ہے کہ اسکے دیندار مسلمان ملازم اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جز ستھانہ کی مرچ کیلئے علیحدہ کر کے رکھ لیتے تھے۔ جو لوگ زیادہ جبری تھے وہ تھوڑے بہت زمانہ کیلئے ستھانہ جا کر خدمت کرتے تھے۔ جس طرح ہندو ملازم اپنے بزرگوں، رپرکھوں، کے شرادہ کیلئے چھٹی مانگتے تھے اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہہ کر چند ماہ کی رخصت لیتے تھے کہ انھیں فریضہ جہاد ادا کرنے کیلئے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا ہے۔ (روشن مستقبل ص ۱۰۲)

ان اصحاب صدق و صفا اور جان نثاران راہ خدا کے جوش جہاد اور شوق شہادت کے مزید واقعات جو ہمارے لئے دوسری حیات ہیں، آئندہ صفحہ میں خاص خاص لوگوں کے تذکرے کے ذیل میں انشاء اللہ آئیں گے۔ فی الحال ہم اسی اجمالی تذکرہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مختصر اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈال دی جائے کہ یہ جوش جہاد کس کے خلاف تھا؟

جوشِ جہاد کس کے خلاف ؟

سید صاحب اور مولانا اسماعیل شہید کی تحریک جہاد کے متعلق بعض علماء کی تحریروں نے یہ غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ وہ صرف سکھوں کے خلاف تھی سید صاحب انگریزوں سے لڑنا نہیں چاہتے تھے اور نہ انگریزی اقتدار اور تسلط سے ان کو کوئی تشویش اور پریشانی تھی انگریزوں کے قبضہ سے اس ملک کو آنا دکرانا سید صاحب کے مقصد جہاد میں داخل نہ تھا سکھوں نے پنجاب میں مسلمانوں کی زندگی تنگ کر رکھی تھی ان پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے نہ جان محفوظ تھی نہ مال نہ عزت نہ آبرو مسجدوں میں اذان تک نہیں دی جاسکتی تھی ان مظالم کے خلاف سید صاحب اور مولانا شہید نے جہاد کی تحریک شروع کی۔ ان کا اور ان کے رفقاء کا جوش جہاد صرف سکھوں کے خلاف تھا۔

اس مسئلہ پر مولانا غلام رسول تہرنے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے دلائل اور قرائن سے استدلال و استنباط کرنے کے علاوہ خود سید صاحب کے مکتوبات سے واضح الفاظ میں ثابت کیا ہے کہ مذکورہ بالا خیال قطعاً غلط ہے مہر صاحب نے لکھا ہے کہ :-

”میں جہاں تک تحقیق کر سکا ہوں سب سے پہلے سر سید احمد خاں مرحوم نے سید صاحب کے جہاد کا رخ انگریزوں سے ہٹا

کو سکھوں کی طرف پھیرا۔ لیکن سرسید کا یہ بیان بہت کم لوگوں کی
نظروں سے گزرا ہوگا۔ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری مرحوم
نے اسے پھیل کر پیش کیا۔

مہر صاحب نے اس خیال کے حامیوں میں تیسرا نام مرزا حیرت دہلوی
(مؤلف حیاتِ طلبہ) کا بتایا ہے۔ "حیاتِ طلبہ" کی بابت مہر صاحب نے
اپنا تاثر یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ کتاب تاریخ نہیں بلکہ افسانہ ہے اور سراسر
ناقابل اعتبار ہے۔

مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری نے سید صاحب کے متعلق ایک
کتاب رتوارِ پنج عجمیہ معروف بہ سوانحِ احمدی لکھی اس کتاب میں انھوں نے
یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سید صاحب انگریزوں سے نہیں
لڑنا چاہیے تھے۔ وہ صرف سکھوں سے لڑائی پر آمادہ تھے۔ اس بیان
کو مستند بنانے کے لئے سید صاحب کے مکاتیب کی بعض عبارتوں میں
تحریف کی گئی۔ مہر صاحب نے سید صاحب کے مکاتیب کے متعدد
قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے مولوی محمد جعفر صاحب کی اس لغزش کا پتہ
لگایا ہے اور دنیا کو حقیقت حال سے روشناس کیا۔ ہمیں مہر صاحب
کی اس داد تحقیق کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

مولوی جعفر صاحب کی اس لغزش پر تعجب ہوتا ہے اس لئے کہ سید
صاحب کی شہادت کے بعد وہ خود بھی اس تحریک میں شریک تھے اور اسکی
وجہ سے انگریزوں نے ان کے ساتھ بڑا سخت برتاؤ کیا تھا اور اسکی پاداش

میں ان کو بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں تھیں۔

مہر صاحب لکھتے ہیں۔

”مولوی محمد جعفر صاحب تھانوی سید صاحب کے خاص متقدّمین سے وابستہ تھے اس وابستگی کے باعث انھوں نے خوفناک تکلیفیں اٹھائیں۔ گھربار لٹایا اور کم و بیش اٹھارہ سال کالے پانیوں میں بسر کئے۔ ان کی قربانیوں کے سامنے ہر شخص کی گردن احتراماً جھک جانی چاہیے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سید صاحب کے نصب العین کو سمجھنے میں ان سے سخت لغزش سرزد ہوئی۔ اور حد درجہ انوس اس بات پر ہے کہ اس غلطی کی توثیق کیلئے انھوں نے سید صاحب کی عبارتوں کو بدلا

(سید احمد حمید ص ۲۵۸)

ہیں مولوی جعفر صاحب کی اس جرأت پر اس اعتبار سے مزید انوس تھا کہ وہ اہلحدیث تھے جن کے مسلک کی عمارت روایت کے باب میں نہایت دامنیت ہی کی بنیاد پر قائم ہے۔ خیر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اس لغزش کی تحقیق اور اس غلطی کی اصلاح کی توفیق بھی ایک اہلحدیث محقق ہی کو عطا فرمائی۔ فہم الفضل والمنہ۔

سید صاحب کی وہ تحریریں اور ان کے مکاتیب کی وہ عبارتیں جن سے صاف صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سید صاحب انگریزوں کو مسلمانوں کے لئے سکھوں سے بدرجہا زیادہ خطرناک سمجھتے تھے اسی لئے ہندوستان

کو ان کے تسلط سے آزاد کرانے کا وہ عزم رکھتے تھے۔ مہر صاحب کی
 "سید احمد شہید" اور "جماعت مجاہدین" میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں
 ہم سید صاحب کے ایک مکتوب کا وہ آخری حصہ یہاں نقل کرتے ہیں جس میں
 انہوں نے نصرتِ کچا ہندوستان کی تطہیر کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

باز خواہیں جانب مع مجاہدین صافین پھر میں مجاہدین کو لے کر ہندوستان
 یہ سمت بلاد ہندوستان بنا برازا کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا تاکہ وہاں اہل
 اہل کفر و طغیان متوجہ خواہد گشت کہ کفر و طغیان کو ختم کیا جاسکے اور میرا اصل
 مقصد اصل خود اقامت جہاد برہندوستان مقصد ہندوستان پر جہاد ہے۔ یہ
 است، نہ توطن در دیار خراسان نہیں کہ خراسان میں توطن اختیار کریں

(جماعت مجاہدین ص ۱۵)

اس اقتباس میں سید صاحب نے اپنا اصلی مقصد ہندوستان پر جہاد
 کرنا بتایا ہے۔ اس سے زیادہ واضح شہادت ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا
 نصب العین بنانے کیلئے اور کیا ہو سکتی ہے؟ اب رہا یہ سوال کہ جب اصلی
 مقصد ہندوستان کو انگریزی تسلط سے پاک کرنا تھا تو پھر سید صاحب
 ہندوستان چھوڑ کر سرحد پار کیوں گئے؟ اور انگریزوں کے بجائے وہ سکھوں
 سے کیوں لڑے؟ اس کا مفصل جواب مہر صاحب کی کتاب "سید احمد شہید"
 کے پچیسویں باب میں موجود ہے۔ ہم اپنے موضوع کے لحاظ سے اپنی کتاب
 میں اس عنوان پر گفتگو کرنے کی کوئی خاصی ضرورت نہیں سمجھ رہے ہیں۔

چند ممتاز اہلحدیث مجاہدین

مولانا اسماعیل شہیدؒ

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم لکھتے ہیں :-

”مولانا ابوالکلام آزاد کو تمام جہادی سرگرمیوں میں مولانا شہید ہی کی روح کار فرما نظر آتی ہے استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ سید صاحب اور مولانا شہید دونوں بزرگوں کو ”تجدید دین“ کی تحریک کا امام سمجھتے ہیں“

دوسری طرف مولانا مسعود عالم نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ ”..... مگر خود سید احمد صاحب کی جماعت میں مولانا اسماعیل شہید کے اثر سے خالص غافلین بالحدیث کا بھی ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا“

جب اس تحریک جہاد کی تمام سرگرمیوں میں مولانا شہید ہی کی روح کار فرماتی تھی۔ اور وہ اس تحریک تجدید دین کے امام تھے تو ظاہر ہے کہ ان کے

۱۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک میں ۴۴ ص ۱۷ کتاب مذکور ص ۲۵

اثر سے خالص عالمین بالحدیث کا جو طبقہ پیدا ہو گیا تھا وہ سب کا سب اس تحریک میں اپنی جانی یا مالی یاد و توں چیزوں کی قربانیوں کے ساتھ شریک رہا ہو گا۔ لیکن آج ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ تعین کے ساتھ انکی کسی خاص تعداد کی نشان دہی کر سکیں۔ تاریخ میں جن شہداء اور غازیوں کے نام محفوظ رہ گئے ہیں ان میں سے بھی ہر شہید اور غازی کے متعلق تعین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں بالحدیث تھے اور فلاں حنفی۔ ہاں کچھ ممتاز حضرات ایسے ضرور ہیں جن کا فقہی مسلک معروف ہے۔ یا کسی معتبر شہادت اور روایت و سند کی بنیاد پر ان کے مسلک کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے انہیں میں سے چند بالحدیث مجاہدین کا تذکرہ ہم یہاں لکھنا چاہتے ہیں۔ یہ تذکرہ صرف انکی مجاہدانہ خدمات پر مشتمل ہو گا ان کی پوری سوانح حیات لکھنا مقصود نہیں ہے۔ مذکورہ بالا نظریے کے پیش نظر سرفہرست حضرت مولانا اسماعیل شہید علیہ الرحمۃ ہی کا نام نامی واسم گرامی آسکتا ہے اس لئے اسی بطل جلیل کے ذکر خیر سے اس عنوان کا آغاز کرتا ہوں۔

سید احمد صاحب شہیدؒ سے بیعت کے بعد اپنی ساری **دعوت و تبلیغ** زندگی اچھا دین اور رد بدعات کیلئے وقف کر دی شہنہ اور جمعہ کو شاہی مسجد میں وعظ فرماتے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ نماز جمعہ کیلئے ایسی کثرت ہونے لگی جیسے عید گاہ میں نماز عیدین کے لئے ہوا کرتی ہے۔ تقریریں ایسی جامع ہوتی تھیں کہ ہر شخص کو اس کے شبیہ کا جواب مل جاتا تھا۔ اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ عالم دعائی یکساں

مستفید ہوتے تھے

کچھ مدت کے بعد سید صاحب کے ایما سے وعظ و تقریر میں جہاد فی سبیل اللہ کے مسائل بیان فرمانے لگے۔ سیرید کے الفاظ میں مسلمانوں کا آئینہ باطن مصفا اور محلی ہو گیا اور راہ حق میں اس طرح سرگرم ہوئے کہ ہر شخص بے اختیار چاہنے لگا، اس کا سفر فی سبیل اللہ فدا ہو اور اس کی جان دین محمدی کا علم بلند کرنے کے سلسلے میں کام آئے۔ ان کے مواعظ سے ہزاروں لوگ تائب ہوئے۔ ان میں زمان بازار ی بھی تھیں۔ ایک مرتبہ ایام محرم میں قلعے کے اندر بلائے گئے اکبر شاہ ثانی بادشاہ بھی غلبہ میں شریک تھا، شاہ صاحب نے ایک آیت پڑھ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مراتب صبر ایسے انداز میں بیان کیا کہ اسوہ حسینی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھج گیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان شرک و بدعات کے بلائے سخت میں مبتلا ہیں

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم فرماتے ہیں :-

دعوت و اصلاح امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹہ کے حجرہوں میں (شاہ ولی اللہ نے) دفن کر دیئے تھے۔ اب اس سلطان وقت و اسکندر عزم (شاہ اسماعیل شہید) کی بدولت شاہ جہاں آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کے سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ چل گیا اور ہندوستان کے کناروں

لے جماعت مجاہدین ص ۱۲۱ و ص ۱۲۲

سے بھی گذر کر نہیں معلوم کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی۔ وہ اب برسر بازار کی جارہی اور ہوسہی تھیں اور خون شہادت کے چھینے طحٹ و حکایات کو نقوش و سواد بنا کر صفحہ عالم پر ثبت کر رہے تھے۔

آخر تو لائیں گے کوئی آفت نفاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں آج آسمان سے ہم
(تذکرہ ص ۲۴۵)

۱۲۴۱ھ (۱۸۲۴ء) جنوری ۱۸ء
کارنامہ ہائے جہاد | دوشنبہ کو رائے بریلی سے سید صاحب کے ساتھ راہ ہجرت میں قدم رکھا اور وطن عزیز سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر ایک غیر معروف گوشے میں شہادت پائی۔ ان کی اور سید صاحب کی شہادت کے باعث ہمیشہ کی ناموری حاصل ہوئی۔ دوران جہاد میں ان کے کارنامے ”سید احمد شہید“ کے صفحات پر تفصیلاً بیان ہو چکے ہیں۔ ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ اجمالاً انکی کیفیت ذیل میں درج ہے

- (۱) وہ تمام انتظامات میں سید صاحب کے مشیر خاص تھے۔
- (۲) سید صاحب کیلئے امامت جہاد کا پورا بندوبست انھیں نے کیا تھا
- (۳) جنگ شیدو میں جان پر کھیل کر سید صاحب کو محفوظ مقام پر پہنچایا

(۴) ہزارہ میں جہاد کی ابتدائی تنظیمات انھیں نے کیں۔

(۵) جنگ شنکیاری میں تھوڑی سی جمعیت سے سکھوں کے بہت بڑے لشکر کو شکست دی۔ سکھوں کی گولیوں سے شاہ صاحب کی قبا چھلنی ہو گئی لیکن نہ آپ میدان سے ہٹے، نہ مورچے میں پناہ لی اور نہ جنگ روکی، اسی لڑائی میں شاہ صاحب کی ایک انگلی (جو چھنگلی تھی) زخمی ہوئی جسے دکھا کر مزارِ خافر مایا کرتے تھے کہ یہ ہماری انگشت شہیدِ ہجر ۴۔ بیعت شریعت کے سلسلے میں علمائے سرحد سے تمام گفتگوئیں

شاہ صاحب ہی نے کی تھیں

۷۔ ہنڈ کا مضبوط و مستحکم قلعہ چھوٹی سی فوج کے ساتھ فتح کر لیا اور دشمن کے صرف دو آدمی مارے گئے، اپنے کسی آدمی کے خراش تک نہ آئی۔

۸۔ جنگ زیدہ میں صرف سات سو مجاہدین سے درانیوں کی آٹھ دس ہزار فوج کو شکست فاش دی،

۹۔ مایار کی جنگ میں درانی فوج بارہ ہزار سے کم نہ تھی اور مجاہدین عرف ساڑھے تین ہزار تھے، جنہیں بڑی تعدادِ ملکیوں کی تھی، تاہم درانی مقابلے پر ٹھہر نہ سکے۔

۱۰۔ اسب و عشرہ کی لڑائیاں شاہ صاحب کے کمال سپہ گری کا ایک روشن ثبوت ہیں۔

۱۱۔ انتظامِ عشرہ کے سلسلے میں وہ سید محمد جان قاضی القضاۃ کے مشیر خاص

۷۰

تھے اور جنگ مردان میں انھیں کے حسن تدبیر سے نتیجہ حاصل ہوئی۔
۱۲۔ پشاور میں صلح کی تمام گفتگوئیں سید صاحب کی طرف سے شاہ صاحب ہی نے کی تھیں غرض وہ سید صاحب کی پوری تحریک جہاد میں اول سے آخر تک روح رواں بنے رہے۔ (جماعت مجاہدین ص ۱۲۶)

شاہ صاحب کے رعب اور
مولانا شہید کی شجاعت کا رعب | بیست کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کوئی درانی سپاہی کسی خاتون کا مال چھیننا چاہتا تھا خاتون نے شاہ صاحب کا نام لیا تو سپاہی سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

جنگ مایار ناگزیر ہو گئی تو سید صاحب نے شاہ صاحب کو بھی مہم سے بلا لیا۔ منشی محمدی انصاری نے بلاوے کے خط میں اپنی طرف سے لکھ بھیجا کہ اپنی تشریف آوری کی خبر کو شہرت دیجئے، اسیلئے کہ آپ کی شجاعت اس علاقے کے خاص و عام پر روشن ہے۔ کیا عجب ہے دشمن آپ کا نام سن کر مرعوب ہو جائیں اور اس طرح مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔

مولانا مناظر حسن گیلانی مرحوم کا ایک طے
مولانا گیلانی کا ایک مضمون | مضمون ماہنامہ ”الفرقان“ بریلی کے ”ولی اللہ نمبر ۱۳۵۹ء“ میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں مولانا گیلانی نے حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز کی ایک عربی نظم نقل کی

لہ جماعت مجاہدین ص ۱۲۶

ہے جس میں حضرت شاہ صاحب نے اپنے زمانے کے سکھ اور مرہٹہ مظالم کا ذکر دردناک الفاظ میں کیا ہے۔ اس نظم کے متعلق مولانا گیلانی لکھتے ہیں لیکن منجملہ اور چیزوں کے حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے یہ چند اشعار بھی اپنے اندر اس کی قوی شہادت رکھتے ہیں کہ ”اسلامی ایوان“ میں عہد عالمگیری کے بعد جو آگ لگی تھی اس میں جن جن کے کیلجے بجھنے تھے اور جن جن کے سینے آبلوں سے معمور ہو گئے اس میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی خاندان تھا اور شاید ہی آبلے تھے جو ”اسماعیلی جہاد“ کے رنگ میں پھوٹ کر بالآخر بہہ گئے۔۔۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں
مولانا آزاد کا تاثر | کی نسبت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنا تاثر مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اور پھر حین قدم اور آگے بڑھو۔ مقام عزیمت و عورت کی کیسی کامل اور آشکارا مثال سامنے آتی ہے ساری مثالوں سے آنکھیں بند کر لو۔ صرف یہی ایک مثال زیر بحث حقیقت کے فہم و کشف کیلئے کافی ہے حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ جامع اور کامل ہے۔

بائیں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد تک محدود رہا اس سے آگے

نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و لفاظ اور ظہور و شیع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مرد میدان کا منتظر تھا۔ اور معلوم ہے کہ توفیق الہی نے یہ معاملہ صرف حضرت علامہ و مجدد شہید رضی اللہ عنہ کیلئے مخصوص کر دیا تھا خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اسمیں حصہ نہ تھا۔

می خواست رتخیز عالم برآورد آں باغبان کہ تربیتِ ایں نہال کرد
اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو انہیں کے جھنڈے کے نیچے
نظر آتے۔۔۔ سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے مولانا آزاد آگے لکھتے ہیں
”پھر کیا اس وقت ہندوستان علم و عمل سے خالی ہو گیا تھا؟ یا حق پر
پر چلنے والے اور حق کا در و رکھنے والے معدوم ہو گئے تھے؟ کون
ہے جو ایسا کہہ سکتا ہے؟ خود اسی خاندانِ عالی میں کیسے کیسے اکابر
و اساتذہ علم و عمل موجود تھے؟ حضرت شاہ عبدالعزیز کے درس
تدریس کی پادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی
ہوئی تھی۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے
آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر ان کے تربیت یافتوں کو
دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کا فیضانِ علم
کام نہ کر رہا ہو۔ بایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ جو وقت کا سب
سے بڑا کام تھا اسکے لئے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی سب دوسرے
دوسرے کاموں میں رہ گئے۔ یا مجروحوں کا کام یا مدرسوں کا۔

لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا؟ وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک ہی جسم کیلئے تھا اور ایک ہی پر حیت آیا۔ دنیا اس کے لئے خلعت عظمت اور تشریف قبول کا اندھے پروٹے منتظر کھڑی تھی۔ زمانہ اپنے سارے زمانوں کے ساتھ کب سے اسکی راہ تک رہا تھا امیدواروں پر امیدوار یکے بعد دیگرے گذرتے رہے مگر اس کا مستحق کوئی نہ نکلا۔

بارِ غم اور عرض بہر کس کہ نمودم
عاجز شد ز این قعر بنام زمر افتاد

تذکرہ ص ۲۴۴ و ص ۲۴۵

کم و بیش چھ سال تک سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید **شہادت** نے اپنے جان نثار رفیقوں کے ساتھ راہ حق میں جان و مال کی قربانیاں پیش کیں۔ کامیابی و کامرانی ان کے ہر کامبختی ظفر مندی قدم لینے کو آگے بڑھی۔ قریب تھا کہ سارا پنجاب و سرحد اسلامی نور سے جگمگانے لگتا اور ایک مرتبہ پھر خلافت راشدہ کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے آجاتا۔ مگر ابھی مسلمانوں کے بُرے دن لکھے تھے۔ براہِ ہونسل غرور اور قبائلی عصبیت کا۔ جس نے اس تمام کئے کرائے پر پانی پھر دیا۔ افغانی سرداروں نے غداری کی۔ کچھ فتنہ پردازوں نے حنغیت اور وہابیت کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ علماء سواور قبر پرستوں نے مجاہدین پر کفر کے فتوے لگائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضلع ہزارہ کے کوہستانی علاقے کے ایک مشہور

مقام ”بالاکوٹ“ میں سید صاحبؒ اور مولانا اسماعیلؒ صاحب دونوں بزرگوں نے سکھوں سے مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔ اس جنگ میں مولانا اسماعیلؒ کی حالت ہی دوسری تھی۔ برسوں کے ارمان بکھلنے کا وقت آیا، اپنی مردانگی، شجاعت اور حرارت ایمانی کے جوہر دکھائے ایک غازی کا بیان ہے کہ مولانا کے سر پر ایک گولی لگی تھی۔ اس سے اگرچہ خفیف زخم آیا لیکن داڑھی خون سے رنگی گئی۔ پھر آپ ننگے سر امان اللہ خاں (غازی) سے ملے، بندوق بھری ہوئی تھی اور لبلبی چڑھی ہوئی تھی پوچھا امیر المومنین کہاں ہیں؟ امان اللہ خاں نے ”مٹی کوٹ“ کی طرف اشارہ کیا۔ ادھر سے بکثرت گولیاں آرہی تھیں لیکن یہ کہتے ہوئے چلے گئے، بھائی میں تو وہیں جاتا ہوں پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کس حربے سے شہادت ہوئی۔

ایک دوسرے غازی نے بیان کیا کہ میرے بائیں طرف سے مولانا اسماعیلؒ رفل کندھے پر ڈالے اور ننگی تلوار ہاتھ میں لئے میرے پاس آئے پیشانی سے خون بہہ رہا تھا پوچھا امیر المومنین کہاں ہیں؟ میں نے اپنے دلہنے طرف ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس ہجوم میں ہیں۔ یہ سن کر وہ اس طرف چھپتے ہوئے چلے گئے۔

تیسرے غازی کا کہنا ہے کہ سر سے خون جاری تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ گولی پیشانی پر لگی تھی یا کنپٹی پر، ہجوم میں جا کر داؤد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔

۷۵

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

(سید احمد شہید جلد دوم ص ۲۱ و ص ۲۲)

۲۲ رذی قعدہ ۱۲۴۷ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء یوم جمعہ کو گیارہ بجے دن میں
یہ سانحہ پیش آیا ۔

قصیدہ در فضائل جبرئیل مولانا محمد اسماعیلؒ

یہ قصیدہ مولوی محمد حسین صاحب متخلص بہ فقیر نے لکھا تھا۔ قصیدہ بہت
لمبا تھا اسمیں سے مولانا غلام رسول مہر نے صرف وہ اشعار چن کر جو شاہ شہید
کے فضائل سے متعلق تھے ”جماعت مجاہدین“ کے آخر میں شائع کئے ہیں ہم
اسمیں مزید اختصار کر کے کچھ اشعار یہاں نقل کرتے ہیں ۔

جو اشعار مہر صاحب نے منتخب کئے ہیں ان میں شاعر موصوف نے
پہلے یہ بتایا ہے کہ مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ تفسیر، حدیث، فقہ، نحو،
صرف، منطق، فلسفہ، ریاضی وغیرہ جملہ علوم و فنون میں تبحر اور کمال رکھتے
تھے اس کے بعد لکھا ہے ۔

واعظ ایسے تھے کہ کیا انکے بیاں کا ہو بیاں
سننے والوں کو عجب ہوتی تھی رغبت میریت

۷۶

جب حدیث نبوی کا وہ بیاں کرتے تھے
ہوتا تھا خلق سے معدوم حدوث بدعت

ذکر و وزخ کا جو آتا تو بلا دیتی تھی
آتشِ خوف خدا پس بہ خواب غفلت

اور جنت کا بھی کچھ ذکر جو آجاتا تھا

سن کے کفار بھی اسلام کی کرتے رغبت

اور جو کرتے تھے کبھی ہول قیامت کیا

مجلس و عظ کی ہو جاتی تھی ایسی صحت

ایک کو دوسرے کی کچھ نہ خبر رہتی تھی

اس قدر ہوتی تھی ہر ایک کے دل کو مشقت

سر کے نزدیک جو وہ شمس پُدی ہوتا تھا

شرم افعال سے ہوتی تھی عرق کی شدت

توبہ توبہ مری یا رب یہ ہر اک کہتا تھا

اس قدر ہوتی تھی والہ میثبت رب العزت

سر کو سجدے میں جھکا دیتے ہی بن پڑتی تھی

بے نمازوں کی بدل جاتی تھی ایسی حالت

فرض جن سے نہ ادا ہوتا تھا وہ صومہ فرض

کرتے نفلیں بھی ادا کرنے میں اپنی نیت

۷۷

اکل و شرب اپنا فراموش وہ کر دیتے تھے
روزہ خوروں کو تھی اس وعظ کی اتنی ہیبت
پھر تو عیدین سے تشریق سے لاچار تھے وہ
سال بھر روزے کی تھی ان کو دگر نہ رغبت

جو نہ دیتے تھے زکوٰۃ، ان کا یہ ہوتا تھا حال
صرف کل مال میں کرتے تھے وہ صرف ہمت
عیش میں گھر سے بھی تھا جن کو نکلتا مشکل
سفر حج کی پیادہ ہوئی ان کو رغبت

ہو گئے سیکڑوں زانی بھی زنا سے تائب
اور مے خوار بھی توبہ سے ہوئے پاک صفت
زانیہ عورتیں بھی ان کی نصیحت سن کر
باندھتی تھیں کسو دیندار سے عقد حلال

ہے یہ مشہور کہ دہلی میں وہ اک روز کہیں
اک زن فاحشہ کے در پہ گئے باعزت
اس کو کچھ ذکر قیامت جو سنایا تو وہیں
وہ بھی تائب ہوئی اور اسکی جو تھیں ہم محبت

اور ان سب کے دیئے باندھ اسی لحظہ نکاح
اللہ اللہ یہ تھی ان کے بیاں کی ہیبت

۷۸

اور دہلی ہی کی مسجد میں یہ مشہور ہے بات
خوض تک رہتا تھا بازار لگا بے دہشت

خیر کی جائے کو کر ڈالا تھا اک موقع شر
اس قدر شر میں تھی اہل ہوا کی کثرت

بہ طفیل ان کے دیاں سے یہ بلا دور ہوئی
موضع خیر میں انہوں ہوئی بس خیریت

مسجد میں سیکڑوں آباد ہوئیں ان کعب
مردوزن لاکھوں نمازی ہوئے صافی طینت

گر یہ طفل کو سنتی ہی نہ تھی مادرِ طفل
اس زمانے کی نمازوں میں یہ تھی محویت

ہر نمازی کو ہوا شوق تہجد ایسا
بستر خار بنا بستر خواب راحت

خواب شیریں سحر کا نہ مزہ تھا ان کو
طاعت حق میں اٹھیں آتی تھی کیا کیا لذت

ہر جگہ دین محمد کا رواج ان سے ہوا
ظلمت و ہریریں روشن ہوا نورِ منت

دیکھو دشوار تھا کیا کچھ زن بیوہ کا نکاح
وہ بھی آسان ہوا ان سے علیہ الرحمۃ
ورنہ اس ہند پر آفات میں اہل اسلام
عار اس کام سے رکھتے تھے برہمن کی صفت

شکر لاکھوں تری رحمت کے خدایا

بہ طفیل ان کے ادا ہونے لگی یہ سنت

اک جگہ سنتے ہیں فرماتے تھے مولانا د عظمیٰ

پیرزن ایک ہوئی سن کے غضبناک بہت

اور کہنے لگی یہ مولوی ایسا آیا پھر سے

اس نے رانڈوں کے تولے لوگو بھی کھو دیے سب

دانہ بیوی کا جو کھاتے تھے وہ محروم ہوئے

کیونکہ ہر رانڈ ہوئی اب تودو خصمی عورت

اس کو نرمی سے یہ سمجھایا نہ کیجئے غصہ

مجھ کو کہنے میں نہیں اپنی طرف سے جرات

بلکہ فرماتے ہیں یوں بیوی کے باوا صاحب

میں جو کہتا ہوں یہ سب کچھ ہے پیامِ حضرت

اور سب چھوٹ گئیں آپ کے سمجھانے سے

رسم بد شادیوں کی اور عمنی کی بدعت

اور مہاجر بھی وہ ایسے تھے کہ سبحان اللہ

ما بھی اللہ سے تھی ان کو ہمیشہ ہجرت

اے یہاں بیوی سے اشارہ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی طرف ہے جن کے متعلق

عقیدہ یہ تھا کہ ان کے نام سے جس کھانے پر نیاز کی جائے اس کو وہی عورت کھا سکتی ہے جس نے

دوسری شادی نہ کی ہو ۱۲

ظاہر مال ہے، اولاد سے، گھر سے ان کو

اس قدر عشق الہی میں ہوئی تھی نفرت

سب دیا چھوڑ مگر ہاتھ سے چھوڑا نہ کبھی

رشتہ ہجرت فی اللہ، بل بے ہمت

غازی ایسے تھے کہ کیا ان کے غذا کا ہو بیاں

آبِ شمشیر کو پیتے تھے وہ مثل شربت

ان کی شمشیر کا زہر اب ملا دیتا تھا

فوج کفار کے دریا میں عجب سمیت

یہ سنا ہو گا کہ سکھوں کو بہت قتل کیا

سکھ سے پھر رہ نہ سکے، سکھ ہوئے ایسے غار

مال سے، ملک سے اور جاہ سے کچھ کام نہ تھا

تھا تو یہ کام تھا، عالی ہو یہ دین و ملت

راہ مولیٰ میں بھی قربان ہوئے واہ نصیب

اور حیاتِ ابدی پائی علیہ الرحمۃ

جو برا کہتے ہیں ایسوں کو برا کرتے ہیں

عیب اپنے ہی بیاں کرتے ہیں باطنیت

ظاہر اے ادبی ہے یہ کلام حق کی

ایسے حافظ کو برا کہتے ہیں جو بد خصلت

ایسے عالم کی مذمت جو کیا کرتے ہیں مثل جاہل ہیں اگرچہ انھیں ہو علمیت

مولانا سید حیدر علی رام پوری

یہ مولانا سید محمد علی رام پوری کے بھائی تھے۔ مولانا محمد علی کا تذکرہ آگے آ رہا ہے۔ سید صاحب شہید نے اپنے خاص آدمی مختلف ہندوستانی علاقوں میں دعوت دین کیلئے مقرر فرمائے تھے جو عقائد و اعمال کی اصلاح کے ساتھ ساتھ سید صاحب کی تحریک جہاد کے لئے روپے کی قراہمی کے علاوہ غازیوں کو تیار کرتے تھے انھیں خاص داعیوں اور خلفاء میں سے یہ دونوں بھائی بھی تھے۔

مولانا سید حیدر علی شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی اور شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کے شاگرد تھے، مولانا ابوالحسن علی ان کی شان میں لکھتے ہیں۔
 ”ذکاوت، سرعت ادراک، جامعیت معقول و منقول، کتاب و سنت اور اختلاف ائمہ سے واقفیت، تبحر علمی، میں سرآمد روزگار اور علوم حکمیہ میں بحر ذخار تھے۔“

نواب احمد علی خاں فرمانروائے رام پور نے انھیں کے ہاتھ پر نیا برتہ بیعت جہاد کی تھی جیسا کہ نواب صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں

۱۔ سید احمد شہید ص ۳۶ اور جماعت مجاہدین ص ۲۹۲: ۲۔ سیر احمد شہید ص ۳۲

اسکا ذکر کیا ہے جو انہوں نے سید صاحب شہید کو اس وقت لکھا تھا
 جب سید صاحب سرحد پار چلے گئے تھے۔ نواب صاحب مذکور لکھتے ہیں
 چونکہ جہاد فی سبیل اللہ مثل صلوٰۃ چونکہ خدا کی راہ میں جہاد نماز اور نعرے
 وصیام برکافہ انام ایں ملت از جملہ کی طرح ملت اسلامیہ کے تمام افراد پر فرض
 فرض النہی مؤکد اسلام است بناءً۔ ہر اس لئے میں نے سید المرسلین (ان پر اللہ
 علیہ وزطر الغیب مطابق سنت انکی آل پر رب العالمین کی طرف سے ہزار ہزار
 سید المرسلین علیہ والہ الف الف صلوٰۃ رب العالمین ہر وقت مولوی
 حیدر علی صاحب کہ خلیفہ آنجناب کی سنت کے مطابق غائبانہ مولوی
 است آنحضرت بیعت بر جہاد کر لی ہے۔ جو آپ کے خلیفہ ہیں
 نمود و خود را باین وسیلہ جمیلہ در اس وسیلہ سے میں مجاہدین فی
 زمرۃ مجاہدین فی سبیل اللہ داخل سبیل اللہ کے گروہ میں شامل ہو
 نمود کہ در وقت مناسب بہ سرو گیا ہوں۔ مناسب وقت پر بہ
 چشم حاضر از دوست یک اشارہ سرو چشم حاضر ہو جاؤں گا۔ دوست
 و زما بہ سرو دیدن کی طرف سے اشارہ ہوتے ہی سر کے بل
 دوڑیں گے :

 و آنحضرت دعا فرمائید کہ مالک آپ بھی دعا فرمائیں کہ مالک حقیقی
 حقیقی ایں عزیمت مارا بہ انجام ہمارے اس ارادے کو پورا کرے
 رسالہ

والاجاد نواب صدیق حسن خالصہ مرحوم نے مولانا سید حیدر علی کے متعلق لکھا ہے دکان یذب عن اسماعیل الشہید راسما عیل شہید کی حمایت کرتے تھے اور ان پر اعتراض کرنے والوں کا جواب دیتے تھے، نواب صاحب نے "الیانع الجنی" کے مصنف کا یہ قول نقل کیا ہے ولذا مع شیخنا ابی العلاء الفضل بن الفضل الخیر آبادی مباحثات فی شان اسمعیل یجوہا بطون مؤلفا تھما بدعت منه عند البحث بواحد سر قھاھا العلماء توفی فی المحرم مستهل عام القراطس انتھی۔ رانھوں نے پارسے شیخ ابوالعلاء فضل امام ابن فضل حق خیر آبادی کے ساتھ اسمعیل کے بارے میں کئی مباحثے کئے جیسا کہ ان دونوں کی کتابیں شاہد ہیں۔ اور بحث کے وقت ان کے قلم سے ایسی باتیں سرزد ہوئیں جنکی کمزوری علماء نے ظاہر کی ہے، نواب صاحب ان مباحثوں کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ قلت والحق ان الحق فی تلك المباحث بیدالید کا بید الشیخ کما یظهر من الرجوع الی کتبھما عند نظر الانصاف میں کہتا ہوں کہ ان مباحث میں سید حیدر علی ہی حق پر تھے نہ کہ شیخ فضل امام جیسا کہ ان دونوں حضرات کی تصانیف پر نظر انصاف ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے، نواب صاحب یہ بھی لکھتے ہیں وقد کتب علی بعض کتب لی تقریظا حسنا وبالفیہ الثناء علی بسا لست اھلالہ انتھی مولانا حیدر علی نے میری بعض کتابوں پر تقریظ لکھی ہے جس میں میری تعریف میں ایسا مبالغہ کیا ہے جس کا میں اہل نہیں ہوں اور سری جگہ لکھتے ہیں

(ر لہ اجماع العلوم ص ۹۱)

لہ تقویٰ علی رسالتنا المسماة بکلمة الحق فی رد عمل المولکة رانہوں نے
میرے رسالہ ”کلمہ حق“ پر تقریظ لکھی ہے۔ یہ رسالہ میلاد مروج کی ترغید
میں ہے، نواب صاحب ہی لکھتے ہیں ومن مولفاتہ صیانة الاناس
عن وسوسة الخناس بالہندیہ ورسالتہ فی اثبات رفع الیدین فی
المواضع الاربعۃ من الصلاة حر دھار د اعلیٰ المولوی محبوب علی اللہوی
بالفارسیۃ وکان یدرس ویفیع الناس انتھی د مولانا سید حیدر علی کی
تالیفات میں سے ایک رسالہ ”صیانة الاناس من وسوسة الخناس“ اردو
زبان میں ہے اور ایک رسالہ فارسی زبان میں ہے جس میں انہوں
نے ثابت کیا ہے کہ نمازیں چار جگہوں میں رفع یدین کرنا سنت
ہے۔ یہ رسالہ مولوی محبوب علی دہلوی رضوی کے جواب میں لکھا ہے
”صیانة الاناس“ میں لکھتے ہیں:

”ایک شخص معین کی تقلید پر اگر کوئی دلیل اولہ شرعیہ راجعہ سے ہو
تو لاؤ ذکر کرو۔ جو شخص تقلید ایک شخص کی لازم اور واجب کہتا ہے
وہ غلط کہتا ہے۔“

نواب احمد علی خاں فرمانروائے رام پور کے آخری زمانے میں رام
پور سے ٹونک پہنچ گئے۔ وہاں نواب وزیر الدولہ نے انہیں عہدہ
دیوانی پر مامور فرمایا۔ اس عہدے کے فرائض انجام دینے کے علاوہ دس
بھی دیتے تھے اور طبابت بھی کرتے تھے۔ ۱۶ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) اگر
۱۸۵۶ء کو ٹونک میں وفات پائی آخر زمانے میں ٹونک میں اقامت تھی
۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) بمطابق المحمدیہ حافظ عزیز الدین مراد آبادی مدنی، جماعت مجاہدین

کر لینے کی وجہ سے بعض لوگوں نے ان کو "ٹونکی" بھی لکھا ہے

مولانا سید محمد علی رام پوری

یہ مولانا سید حیدر علی (مذکورہ) کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے متعلق مہر صاحب لکھتے ہیں :-

"معلوم نہیں سید محمد علی نے کس زمانے میں بیعت کی، البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ مجاہدین کا قافلہ لیکر ابتدائی دور ہی میں سرحد پہنچ گئے تھے جس زمانے میں سید محبوب علی دہلوی کی مراجعت کے باعث

۱۔ میرٹ والا جا ہی حصہ دوم ص ۷۲، ۲۔ سید صاحب شہید کی تحریک جہاد کا جب ہندوستان میں چرچا ہوا اور مختلف حضرات کی سرکردگی میں مجاہدین کے قافلے سرحد پہنچنے لگے تو مولوی محبوب علی صاحب دہلوی بھی ایک قافلہ لیکر سرحد پہنچے مگر راستے کی تکلیفوں سے اس قدر پریشان ہوئے کہ واپسی کا قصد کر لیا، دوسرے مجاہدین سے بھی کہنا شروع کر دیا کہ واپس چلو اور اقربا کے جو حقوق تمہارے ذمے ہیں انہیں ادا کرو۔ مولانا شاہ اسماعیل شہید اس زمانے میں پکھل گئے ہوئے تھے انہیں یہ حالات معلوم ہوئے تو متواتر خط لکھتے رہے کہ مولوی صاحب کو میری واپسی تک روکا جائے۔ لیکن شاہ صاحب کی تشریف آوری سے تین روز قبل مولوی محبوب علی صاحب کسی کو اطلاع دینے بغیر اس کے وقت اچانک پشاور روانہ ہو گئے اور وہاں سے بخیرہا نیت تبلی واپس پہنچ گئے۔

بقیہ ص ۷۷ پر

قافلوں کی آمد رک گئی تھی اس زمانے میں جن اصحاب کو بغرض دعوت و تبلیغ ہندوستان بھیجا گیا ان میں سید محمد علی بھی تھے۔

بقیہ حاشیہ ص ۵۵ کا۔ دہلی ہینکلر اپنی واپسی کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے اختلالات جہاد کی بہت لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلانے لگے اسکی وجہ سے مختلف حلقوں میں بددلی اور افسردگی پیدا ہوئی، اور دیر تک قافلوں کی آمد رک رہی، اسی زمانے میں سید صاحب نے مولانا سید محمد علی دہلوی کو ہندوستان بھیجا تھا۔ چنانچہ ان داعیوں اور خصوصاً شاہ اسحاق صاحب اور شاہ یعقوب صاحب کی کوششوں سے جب غلط فہمیوں کے بادل چھٹے تو پھر ہندوستان سے امداد جانے لگی اور قافلے پہنچنے لگے۔

یہی مولوی محبوب علی دہلوی ہیں جن کے روایں مولانا سید حیدر علی صاحب رام پوری نے رسالہ اثبات رفع البیدین لکھا تھا۔ یہ سہ ماہی کے ہنگامے تک زندہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شہداء کے ہنگامے کو انھوں نے جہاد کا فتویٰ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اسکے صلیب انگریزوں نے ان کو گیدہ گاؤں معافی میں دینا چاہا۔ مولوی صاحب نے پروانہ معافی لیکر چاک کر ڈالا۔ اور کہا کہ میں نے تمھارے لئے کچھ نہیں کیا تھا میرے نزدیک مسئلہ یوں ہی تھا: اس روایت کا اصل ماخذ اربع ثلاثہ ہے۔ اس سے پہلے کسی معتبر تاریخ میں اس روایت کا ذکر مجھے نہیں ملا۔ بعض اصحاب نے اس انعام کو میدان جہاد سے واپسی اور واپسی کے بعد اس تحریک کی مخالفت کا صلہ ظاہر کیا ہے۔ انعام کی پیش کش الی بات کی صحت کی تقدیر پر یہی وجہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس وقت تک تحریک جہاد کا رخ براہ راست انگریزوں کے خلاف ہو گیا تھا اور مجاہدین انگریزوں کے ٹکر لینے لگ گئے تھے۔ شہداء کے ہنگامے کو جہاد قرار دینے سے انکار کرنے والے تو دوسرے عداوت بھی تھیں کہ سامنے اس قسم کے انعام کی پیش کش کیوں نہیں کی گئی؟ اے جماعت مجاہدین ص ۱۲۱

یہ وقائع احمدی ہیں ان کے ارسال کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے :-
 یہ مولوی محمد علی رام پوری کو حضرت علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ تم حیدر آباد دکن
 کے جاؤ انہوں نے حذر کیا کہ مجھ کو نہ اس قدر علم ہے کہ کسی عالم سے
 مباحثہ یا مناظرہ کروں اور نہ یہ سلیقہ ہے کہ لوگوں کے انہوہ میں وعظ و درس
 کیوں۔ مجھ کو تو آپ کسی کام کو رہیں بھیجیں کہ وہ کام کر کے چلا آؤں۔ آپ
 نے فرمایا کہ خیر۔ جس بات کا عذر کرتے ہو، اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ
 وہ عذر دور کر دے۔ پھر آپ نے اپنا کرتا اور پاجامہ اور تاج (ٹوپی)
 انکو پہنایا۔۔۔ چار پانچ آدمی ان کے ہمراہ کئے۔ ان میں ایک نعیم خاں
 رام پوری تھے اور دوسرے عنایت اللہ خاں قتالی والے اور تیسرے
 عبداللہ کہ انھیں کے رفیقوں میں سے تھے اور باقی کے نام یاد نہیں۔ اور
 فرمایا کہ یہاں سے سندھ کو جانا۔ وہاں سپر کوٹ میں بی بی صاحبہ سے
 ملتے ہوئے کراچی بندر کو جانا وہاں سے کشتی پر سوار ہو کر بمبئی میں اتارنا
 پھر وہاں سے حیدر آباد کو جانا

سید صاحب کے حکم کے مطابق مولانا سید محمد علی حیدر آباد دکن پہنچے۔ انکی دعوت
 اور تبلیغ سے دکن میں سنت کا احیاء ہوا۔ مبارزالدولہ اور بڑے بڑے امراء اسی دور
 لے جماعت مجاہدین صلی اللہ علیہ وسلم احمدی میں اکٹھے کہ حیدر آباد کے ان نابھتہ گھر
 میں دو دہجن سے زیادہ بیویاں تھیں جب راہ ماست پر آئے تو چار کو اپنے نکاح میں رکھ کر
 باقیوں کو طلاق دیدیا اعلیٰ پتہ مصاحبین سے انکی شادیاں کر دیں۔ اور دوسرے تمام منہیات
 شرعیہ کو اپنے دربار سے دور کر کے متقی اور پرہیزگار زندگی گزارنے لگے۔

میں صراطِ دین پر قائم ہوئے۔ پھر سید صاحب نے مولانا محمد علی کو مداس جانے کا حکم دیدیا اور حیدر آباد میں مولانا ولایت علی کو بھیج دیا۔ مولانا محمد علی حیدر آباد سے نکلے تو کرفوں، کڈپا، اردگہر، نیلور جہتے ہوئے محرم ۱۲۳۵ھ (جولائی ۱۸۲۲ء) میں مداس پہنچے۔ وہاں پہنچکر مولانا سید محمد علی نے ملا بحر العلوم کے فرزند مولوی عبدالرب کے مدرسے میں ڈیرے ڈالے اور کتاب و سنت کی اشاعت شروع کی۔ آپ کے وعظ و نصیحت سے ہزاروں لوگ راہِ راست پر آئے ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر نواب خاں عالم خاں بہادر تھوڑے جگہ ہیں جو مدراس کے معزز و سار میں سے تھے۔ اور ان کی صاحبزادی نواب ارکاٹ کی بیگم تھی۔ نواب موصوف نے بیعت کرتے ہی راہِ سنت اختیار کر لی اور اپنے گھر کی وہ تمام چیزیں رگانے بجانے کے آلات وغیرہ توڑوا ڈالیں جو شرعیت کی رو سے ناجائز تھیں۔

خود نواب خاں عالم نے سید محمد علی کی تبلیغ کے اثرات یوں بیان کئے ہیں۔
۱۔ شراب، سیندھی گانجا پینے والے فاسق، اور نر شو کو پوجنے والے عوام و خواص پہنچو قتمہ نماز پڑھنے لگے۔

۲۔ مریوں کے علاوہ بعض عورتیں بھی تہجد گزار ہو گئیں

۳۔ تمام غیر شرعی اعمال و رسوم کا خاتمہ ہو گیا۔

دس مہینے کی تبلیغ کے یہ کرشمے دیکھ کر مخالف بھی جوش میں آ گئے اور انہوں نے اعتراضات شروع کر دیے۔ سید محمد علی کا طریقہ یہ تھا کہ فضول

بخشوں اور مناظروں میں نہ الجھتے۔ اپنے اصل مقصد سے کام رکھتے اور اصلاح عقائد و اعمال پر زور دیتے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد سید محمد علی رام پور چلے گئے۔

۲۵۔ میں حج کے ارادے سے کلکتہ پہنچے تو مدراس کا دوسرا سفر | مدراس والوں نے پے درپے درخواستیں بھیجیں کہ یہاں ٹھہرتے ہوئے جائے بلکہ نواب ارکاٹ کی والدہ نے ایک خاص آدمی کلکتہ روانہ کر دیا کہ سید محمد علی کو ہمارے جہاز "دریا دولت" پر سوار کر کے لائے۔ انکی اولین غرض یہ تھی کہ سید محمد علی صاحب سے اپنے بیٹے کیلئے اولاد کی دعا کرائیں۔ سید محمد علی مدراس تشریف لیگئے انکی دعا سے اللہ تعالیٰ نے نواب ارکاٹ کو اولاد عطا کی۔ آپکے دوبارہ وہاں تشریف لے جانے سے مخالفوں و بدعتی مسلمانوں نے شدید ہنگامے بپا کئے اور ہر ممکن کوشش کی کہ سید محمد علی کی دل آزاری اور اذیت رسانی میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ زیادہ تر بخش شاہ اسماعیل کی کتاب "تقویۃ الایمان" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے متعلق ہوتی رہیں۔ ایک موقع پر سید محمد علی کو زہر دینے کی کوشش بھی کی گئی لیکن آپ اور آپ کے متعلقین خدا کے فضل سے محفوظ رہے

اے سید محمد علی شفاعت بالاذن کے قائل تھے جیسا کہ حدیثوں میں مذکور ہے لیکن مخالفین کا اصرار تھا کہ شفاعت عام ہونی چاہیے۔ ملاحظہ فرمادہ قاضی بدرالزمان رحمہ اللہ جلد اول ص ۳۸ مؤلف یوسف کوکن عمری ۱۲

خاں عالم خاں اور انکی | نواب خاں عالم خاں پر بھی وار ہوئے ۔
 صاحبزادی کی استقامت | چنانچہ نواب سے کبر کران کی تنخواہ بند
 کرادی گئی جس کی مقدار گیارہ سو روپے
 ماہانہ تھی مگر خاں عالم خاں نے اسکی پسواہ نہیں کی اور اپنے عقیدہ توحید
 پر قائم رہے۔ ان کی صاحبزادی دجونا ب ارکاٹ کی بیگم تھی (کو بھی بہت
 تنگ کیا گیا کہ کسی طرح وہ غیر شرعی (مشرکانہ) مراسم اختیار کرے جو عام طور
 پر اس زمانے میں رائج تھے۔ اس حق پرست خاتون کا نواب کو صرف ایک
 جواب تھا۔ میں آپ کی بیوی ہوں اور آپ کے ہر فرمان کو ماننے کیلئے ہمہ
 تن تیار ہوں۔ لیکن قبر اور آخرت کے معاملات سب کے الگ الگ ہیں
 میں آپ کے فرمان سے کسی غیر شرعی امر کی مر تکب نہیں ہو سکتی۔

ظالم و جور | سید محمد علی نے بارہا اعلان کیا کہ میرا عقیدہ اور عمل وہی ہے جو
 جمہور اہل سنت کا ہے اور جو کچھ خلاف سنت ہے اُسے
 غلط سمجھتا ہوں، خواہ وہ کسی کی طرف سے ہو۔ لیکن مخالفوں نے انھیں چین
 نہ لینے دیا۔ سید موصوف کے ایک نیاز مند نے اس ابتلا کی تاریخ کہی
 جو ذیل میں درج ہے۔

بر محمد علی جفا سائے پٹن ۱۵
 رفت چوں جو رشام جبرین ۱۵
 ہست تاریخ ایں بللے سعظیم
 یاد مظلومی امام حسین
 ۱۲۵۱ھ

۱۵۔ مدراس کا پرانا نام چینا پٹن تھا اور اسے عام لوگ پٹن بھی کہتے تھے۔

سید محمد علی نے اس کے بعد حج کیا پھر احیائے دین کے کام میں لگے رہے
 ۱۲۵۲ھ و ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی اے

شیخ عبدالحق بنارسى

ان کا اصل وطن نیوتنی ضلع اناؤ تھا۔ ان کے والد شیخ فضل اللہ صاحب وہاں سے منتقل ہو کر بنارس چلے آئے تھے اور یہیں مستقل سکونت اختیار فرمائی تھی اسلئے مولانا شیخ عبدالحق صاحب بنارسى اور نیوتنوی دونوں نسبتوں کے ساتھ مشہور ہوئے۔ سید احمد صاحب شہید کے ساتھ ابتدائی دور ہی میں وابستہ ہو گئے تھے۔ سید صاحب کے ساتھ جو قافلہ حج کیلئے گیا تھا اس میں یہ بھی شامل تھے۔ مزاج میں تیزی بہت تھی۔ بدعات اور غیر شرعی مراسم کے رد و البطلان میں تشدد سے کام لیتے تھے۔ سفر حج میں بعض رفقاء سے تقلید کے مسئلہ پر جھگڑا ہو گیا اس جھگڑے کا یہ اثر ہوا کہ سید صاحب کا

۱۷۰۰ء یہ تمام تفصیلات مہر صاحب کی کتاب "جماعت مجاہدین" سے ماخوذ ہیں اس مضمون کی تکمیل کے بعد فضل العلماء یوسف کوکن عری کی کتاب "خانوادہ قاضی بدرالدولہ" جلد اول میں ملے جس سے سید محمد علی کی ان پریشانیوں کا مفصل حال معلوم ہوا جو حیدرآباد کی دعوت امداد چار سنت کی کوششوں کی وجہ سے ان کو علمائے مدراس کی طرف سے پیش آئی تھیں لیکن یہ داستان اتنی طویل ہے کہ ہم اس کے نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں پاتے۔

قافلہ جب مدینہ منورہ پہونچا اور وہاں شیخ عبدالحق صاحب نے غیر شرعی مراسم اور فاسد عقائد کے خلاف تقریریں شروع کیں تو وہاں کی حکومت میں شیخ صاحب کی شکایت کی گئی ان کے خلاف مقدمہ قائم کیا گیا اور ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

”اس زمانے میں رجواز کے، ارباب حکومت نجدیوں سے بے حد بگڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جنگ ختم ہوئے چند ہی سال گزرے تھے۔ اگر کوئی شخص موجدانہ عقائد کی اشاعت میں ذرا سرگرم معلوم ہوتا اور بدعات و محدثات کے رد میں سختی سے کام لیتا تو اسے ”وہابی“ سمجھ کر مواخذے کا تحفہ مشق بنا لیا جاتا تھا۔ سید صاحب کے ساتھیوں میں مولوی عبدالحق نیو تنوی بہت تیز مزاج تھے وہ بعض مروجہ غیر شرعی مراسم کے رد و ابطال میں ذرا تیزی سے کام لیتے تھے۔ جھٹ شکایت ہوئی کہ ”وہابی“ ہیں چنانچہ ان پر مقدمہ قائم ہو گیا، مولانا عبدالحق نے ضمانت دیکر انھیں چھڑایا اور مقدمے کی جوابدہی کے موقع پر بھی مولانا ہی نے عدالت سے بات چیت کی، اس طرح مولوی عبدالحق رہا ہوئے

مہر صاحب نے ”سید احمد شہید“ کے شروع میں کچھ باتیں ”استدراک“ کے عنوان سے لکھی ہیں۔ اسی کے ذیل میں ایک بات یہ بھی لکھی ہے

۱۔ سید احمد شہید ۲۲ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ

یہ مولوی عبدالحق کے خلاف مدینہ منورہ میں جو مقدمہ دائر ہوا تھا اس کے ذمہ دار مولوی اسلمی مدرسی اور مولوی رجب علی تھے۔ سید صاحب کلکتہ میں بحری سفر نظام فرما رہے تھے تو ایک موقع پر مولوی عبدالحق اور مولوی رجب علی ونشی مرزا جان لکھنوی کے درمیان تقلید و عدم تقلید پر بحث ہوئی تھی سید صاحب کے رفقا میں سے چند افراد جنہیں سے ونشی فضل الرحمن بروہانی کا نام بہ تصریح مذکور ہے۔ مولوی عبدالحق کے ہمنوا تھے۔ اس بحث میں مولوی رجب علی کو جو محسوس پیدا ہوئی اس نے مدینہ منورہ پہنچ کر دعوے کی شکل اختیار کی۔ مولوی رجب علی چاہتے تھے کہ مولوی عبدالحق کی جگہ مولانا عبدالحق اور شاہ اسماعیل کو اس قضیے میں الجھالیں۔ مولوی عبدالحق نے یہ سنا تو جوش میں آگئے اور قاضی سے کہا کہ میں حنفی ہوں لیکن ہمارے ہاں ابواب معاملات میں کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ قویٰ امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین تینوں کے خلاف ہے قاضی مثالیں سن کر چپ چاپ ہو گیا اور یہ قضیہ یوں ختم ہوا۔

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں۔
 (الف) مولانا شیخ عبدالحق کے ساتھ مسئلہ تقلید پر جو بحث ہوئی تھی وہ سفر حج کے موقع پر کلکتہ میں ہوئی تھی۔
 (ب) ابھی چند ہی سال گزرے تھے کہ حکومت حجاز اور نجدیوں میں جنگ ختم ہوئی تھی۔ اس کی وجہ سے حجاز کے ارباب حکومت نجدیوں سے ناراض تھے حجاز میں اس وقت ترکوں کی حکومت تھی ۱۲

تھے۔ کسی موحدانہ عقائد کی تبلیغ اور بدعات کی تردید کرنے والے کو نجدی اور وہابی سمجھ کر مواخذہ کا تختہ مشق بنا لیتے تھے۔ وہاں کی اس فضا سے سید صاحب کے رفقاء سفر میں سے ان علماء احناف نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جو شیخ عبدالحق صاحب بنارس سے اسیلئے ناراض ہو گئے تھے کہ وہ تقلید کے قائل نہ تھے۔ انھیں علماء نے مدینہ منورہ پہنچ کر وہاں کے حنفی حکام کے پاس شیخ عبدالحق صاحب کی شکایت کی۔ ان کو گرفتار کر لیا اور ان پر مقدمہ چلوا یا۔

(ج) اس مقدمہ کے ذمہ دار مولوی اسلمی مدراسی اور مولوی رجب علی جوہری تھے۔ بالفاظ دیگر مولوی اسلمی مدراسی اور مولوی رجب علی جوہری حنفی تھے اور مسئلہ تقلید میں متشدد نہ تھے۔ ورنہ حنفی تو مولانا عبدالحق بھی تھے۔ جنھوں نے شیخ عبدالحق کی ضمانت کی اور مقدمہ کی پیروی کر کے انکو چھڑا یا تھا۔

یہی مولوی اسلمی مدراسی ہیں جنکی بابت مہر صاحب نے ایک خاص بات یہ بھی لکھی ہے کہ مولانا سید محمد علی رام پوری دین کا تذکرہ ابھی پچھلے صفحات پر گزرا ہے، جب دوبارہ مدراس تشریف لے گئے تھے تو ان کے خلاف جن لوگوں نے ہنگامے برپا کئے، اور ان کی ایذا رسانی کے درپے ہوئے ان میں یہ مولوی اسلمی پیش پیش تھے۔ اس سے جہاں مولوی اسلمی کی ذہنیت کا پتہ لگتا ہے وہیں واضح طور پر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ مولانا

سید محمد علی رام پوری خفی اور مقلد نہ تھے۔ ورنہ مولوی اسلمی ان کے مخالف اور درپے آزار نہ ہوتے۔

(د) سید صاحب کے رفقا میں سے چننا فرد متقلید کی اس بحث میں مولانا شیخ عبدالحق کے ہمنوا تھے جنہیں سے منشی فضل الرحمن بردوانی کا نام بہ تصریح مذکور ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ منشی فضل الرحمن بردوانی بھی ہمدیث تھے۔ اور اس سفر حج میں سید صاحب کے ساتھ تھے۔ ان کے متعلق مزید تفصیلات کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

حج سے فراغت اور مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد مولانا شیخ عبدالحق یمن کے مشہور مقام "صنعا" چلے گئے وہاں امام شوکانی کا فیض علم جاری تھا۔ شیخ عبدالحق ان کے تلمذ کے شرف سے بہرہ اندوز ہوئے اور ان سے حدیث کی سند حاصل کر کے ہندوستان واپس آئے۔

شیخ عبدالحق نے امیر المملک نواب صدیق حسن خاں **شیوخ و تلامذہ** کو اجازت حدیث کی جو سند دی ہے۔ اس میں اپنے شیوخ کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

وبعد فان الشيخ الفطن الذی مولانا السید صدیق حسن نجل مولانا السید اولاد حسن المحدث القنوجی نفع الله بعلومہ کل ذکی وغبی طلب منی اجازة عامتہ ومثلی منہ لطلب ولست باهل ان اجاز تکلیف ان اجیز ولكن الحقائق قد تخفی وقد من الله تعالی علی بالمتول عند ائمتنا السنت النبویہ والسماع منهم لا تار والاحادیث

المصطفوية واخذ الاجازات عنهم، فاذلهم واجلهم الامام
 الهمام فخر الاسلام العالم الرباني مولانا القاضي محمد بن علي بن محمد
 الشوكاني الحقد الله بالسلف الصالحين ومتعنا ببركاتهم - آمين -
 وهو يروي عن عدة مشائخ واسامي الكل مع اختلاف الطرق
 مندرجت في اتحات الاكابر باسناد الدفاتر فلا حاجة الى
 اعادتها، والثاني وجيد الاسلام الورع التقى مولانا القاضي
 عبد الرحمن بن احمد بن حسن البهكلي والثالث العلامة
 التحري شيخنا ومولانا السيد عبد الله بن السيد محمد بن اسماعيل
 الامير والرابع العلامة المتبهي وارث احاديث النبي الامي
 الشيخ العلامة محمد عابد بن احمد على الواعظ الانصاري الخرجي
 السندی ... قرأت اكثر كتب الحديث على أسوة المحدثين
 وارث علوم سيد المرسلين العلامة النبيل مولانا الشيخ محمد اسماعيل
 الشهيد تَعَدَّ اللهُ بغير انهُ المديد وعلي شيخنا ومرشدي العلامة
 مولانا الشاه عبد القادر اعلى الله درجاته وخصه بهباته وعلي
 اكمل العلماء وافقه الفقهاء قدوة المحدثين عبد الكا ملين
 الشيخ العلامة مولانا الشاه عبد العزيز الدهلوي قدس الله
 سره بلطف الخفي والجلي فاقول اني اجزت السيد المذكور
 كثر الله نعم فوائده جميع كتب الحديث واصيبه بتقوى
 الله عز وجل واتباع الحق ايما كان ومع من كان والعمل بصحح السنة

ومجانبة البدعت والاستقامة على قدم الحق والصدق.... قال
 بنفسه وحده بقلمها خادم السنة النبوية عبد الحق المحمدي
 عاملہ اللہ تعالیٰ بلطفہ الخفی والجل فی سلخہ سرجب سنۃ خمس
 وثمانین ومائتین والعنہ الہجرۃ انتہی (اتحاد النبلاء ص ۳۶)

ترجمہ: احمد و صلوة کے بعد، مولانا سید اولاد حسن محدث قنوجی کے صاحبزادے
 مولانا سید صدیق حسن نے مجھ سے (روایت حدیث کی) عام اجازت مانگی،
 حالانکہ مجھ جیسا آدمی ان سے اجازت طلب کرتا۔ اور میں تو اجازت دیئے
 جانے کا بھی اہل نہیں۔ چہ جائیکہ میں خود اجازت دوں۔ لیکن بعض اوقات
 اصلیت چھپ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حقیر کو ائمہ سنت
 نبوی کی خدمت میں حاضری، ان سے حدیثیں سننے، اور اجازتیں حاصل
 کرنے کا موقع ملا۔ ان میں سب سے اول اور مقدم عالم ربانی۔ فخر اسلام
 امام اجل مولانا قاضی محمد بن علی شوکانی ہیں وہ کئی مشائخ سے روایت کرتے
 ہیں ان سب کے نام، اختلاف طرق کے ساتھ، اتحاد الکاہل کا بہا سنا والا فتوہ
 میں درج ہیں ایسی یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے
 مولانا قاضی عبدالرحمن بن احمد بن حسن البہکلی ہیں.... اور تیسرے علامہ
 سید عبداللہ بن سید محمد بن اسماعیل الامیر بکینی ہیں.... اور چوتھے علامہ
 شیخ محمد عابد بن احمد علی سندھی ہیں.... اور میں نے حدیث کی اکثر کتابیں
 علوم نبوی کے وارث اسوہ محدثین علامہ جلیل مولانا شیخ محمد اسماعیل شہید بغدادی
 اللہ بغفرانہ المدید، اور اپنے شیخ و مرشد مولانا عبدالقادر علی اللہ ورجاتہ،

اور علماء و فقہاء کے سر تاج۔ محدثین کا ملین کے سر خیل۔ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس اللہ سرہ سے پڑھیں۔۔۔۔۔ میں سید مذکور کو تمام کتب حبیب شاہ کی روایت کی اجازت دیتا ہوں۔۔۔۔۔ اور انہیں تقویٰ الہی کے ساتھ اتباع حق کی نصیحت کرتا ہوں۔ حق جہاں بھی ہوا اور جس کے ساتھ بھی ہو اس کی اتباع کرنا چاہیے (اسی طرح) صحیح سنت پر عمل کرنے۔ بدعت سے بچنے اور حق و صداقت کی راہ پر ثابت قدم رہنے کی نصیحت کرتا ہوں)۔۔۔۔۔ یہ (سب کچھ) سنت نبوی کے خادم عبدالحق محمدی نے اپنی زبان سے کہا اور (یہ سطوریں) اپنے قلم سے لکھیں مورخہ آخر رجب ۱۲۸۵ھ

شیخ موصوف کو امام شوکانی نے جو سند دی تھی اس پر تاریخ ہمارے جمادی الاخری ۱۲۳۸ھ ثبت ہے۔ تلامذہ میں جن کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں مرہٹو م مولانا وحید الزماں حیدر آبادی م مولانا عبدالعزیز محدث لکھنوی م

لے ابجد العلوم ص ۸۷۰۔۲۷۰ نواب صاحب ابجد العلوم ص پر لکھتے ہیں شیخنا عبدالحق بن فضل اللہ الحمدی الہندی المتوفی بمئی سنۃ ۱۲۵۰ھ ولف وایتین و ثمان وثمانین الہجریۃ القدریۃ نیز اسی کتاب کے اسی صفحہ پر لکھتے ہیں و قد اتفق شیخی عبدالحق بکتاب شیخہ الشوکانی اتحات الاکابر بامداد الدفاتر م مولانا وحید الزماں اپنی کتاب وحید اللغات مادہ "سفر" میں لکھتے ہیں و بقیہ ص ۹۹

قاضی شیخ محمد نجیل شہری۔ سید جلال الدین احمد جعفری بناری۔ اور ان کے تین صاحبزادے سید سعید الدین احمد، سید حمید الدین احمد، سید شہید الدین احمد۔

ولقبہ حاشیہ ص ۹۸ کا سہ ۱۰ سفر و بالفتح فائدہ اعظم للاجر، کا مطلب یہ ہے کہ فجر کی نماز طول کرو یعنی لمبی سوڑیں پڑھو یہاں تک کہ اس وقت ختم ہو جب خوب روٹی ہو جائے۔ اس میں زیادہ ٹوا ہے۔ مترجم کہتا ہے میرے شیخ عبدالحق نیوتوی رحمہ اللہ بغفرلہ وافاض علینا من برکاتہ۔ اس حدیث کا یہی مطلب کہتے تھے اور یہی صحیح ہے (حاشیہ حیات وحید الزماں ص ۲) ص ۹۳ کا۔ عبدالعزیز بن غلام احمد نام ہے شیخ محمد مریم بن مقام فرخ آباد ہند ہوئے۔ بچپن میں قرآن حفظ کیا۔ پھر عربی کی کتابیں مختلف اساتذہ وقت سے پڑھیں۔ مولانا عبدالحق نیوتوی سے بلوغ المرام، مولانا حسین احمد بلخ آبادی سے صحیح بخاری اور مولانا سراج الدین سے سنن ابی داؤد کا درس لیا۔ سید احمد طحان اور عبدالحق نیوتوی سے حدیث کی سند ملی ۸۵ سال کی عمر پا کر ۱۳۲۲ھ میں انتقال کیا (حاشیہ حیات وحید الزماں ص ۳)

۱۔ نجیل شہر ضلع جونپور کا ایک شہر قصبہ ہے۔ یہی قصبان کا مولد و مسکن ہے۔ موصوف کا مفصل ترجمہ: تراجم علمائے حدیث ہند، جلد اول میں ص ۳۲ تا ص ۳۳ ملاحظہ ہو۔ مولانا امام خاں فاضل شہری لکھتے ہیں: "جب اپنے چچا صمد الصمد و مولوی عبدالشکور صاحب کے ساتھ (شیخ محمد نجیل شہری) مکہ سفر گئے تو سند الوقت شیخ عبدالحق محدث بناری، شاہ عبدالغنی صاحب بنی، شیخ محمد النظام سے بھی حدیث پڑھی اور سند حاصل کی۔ شیخ عبدالحق محدث بناری کی شاگردی پر آپ کو بہت ناز تھا آپ ہی کی سند سے احادیث روایت کرتے اس لئے کہ اپنے اس استاد کی وجہ سے آپ ایک ہی واسطہ سے امام شروکانی کے شاگرد تھے۔ اور یہ بھی آپ کی خوش نصیبی تھی کہ جب دوسری دیا تیسری مرتبہ پھر حج کیلئے حاضر ہوئے تو انہیں اپنے محبوب استاد حضرت عبدالحق محدث کے جنازہ میں شرکت کی سعادت بھی نصیب ہو گئی۔ یقیناً ص ۹۵

شیخ عبدالحق صاحب کی تصانیف میں ہم کو صرف ایک
تصنیف کتاب کا نام معلوم ہو سکا۔ الدر الفریذ فی المنع عن التقليد
 اس کا جواب مولوی تراب علی لکھنوی نے عبدالقادر سندیلوی کے نام سے لکھا
 تھا۔ حاشیہ حیات وحید الزماں منہج بحوالہ سلسلۃ العسجد نوابعالیق حسن فا
 حب الہی کی کشش نے بار بار زیارت بیت
تکرار حج اور وفات اللہ کی سعادت بخشی چنانچہ بعض مورخین نے
 لکھا ہے کہ سات مرتبہ حج کیا۔ آخری مرتبہ ۱۲۸۹ھ میں قیام عرفات و
 مزدلفہ کے بعد منی میں انتقال فرمایا۔ بعض لوگوں نے تاریخ وفات ۱۲۸۶ھ لکھی ہے۔

بقیہ حاشیہ ۹۲ کا۔ ان حضرات کے علاوہ اور اصحاب سے بھی سند حاصل کی مگر حواشر صاحب محدث
 بناری کے فیض صحبت سے ہوا اسکی وجہ سے آپ سیرۃ صحابہ کا ایک دلکش نمونہ بن گئے۔
 ۱۵۔ مولف تراجم علمائے حدیث ہند ان کے حالات میں لکھتے ہیں۔۔۔ اس حدیث کی تکمیل مولانا عبدالحق
 محدث بناری سے کی۔ عمل بالحدیث و اتباع سنت کا دلولہ بھی انہیں بزرگ کے فیض صحبت سے
 پیدا ۱۸۵۶ء کے ہنگامے میں انگریزوں کے مخالفین کے ساتھ مگر حکومت کے شکنجہ سے بچ گئے
 ۱۶۔ تراجم علمائے حدیث ہند جلد اول ص ۲۴۵۔ ۱۷۔ حاشیہ حیات وحید الزماں ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱

مولانا سندھی کا ایک افسوسناک بہتان

مولانا عبید اللہ سندھی نے شیخ عبدالحق محدث
بناری کے مسلک کی بابت یہ نہایت افسوسناک
بہتان باندھا ہے کہ وہ مذہبنازیدی شیعہ تھے

اور امیر شہید سید احمد بریلوی نے ان کو اپنی جماعت سے نکلوا دیا تھا چنانچہ لکھتے
ہیں: "امیر شہید نے ان کے رہنما کو جو مولانا محمد اسماعیل اور امام شوکانی دونوں
کا شاگرد اور نازیدی شیعہ تھا اپنی جماعت سے نکلوا دیا۔ مولانا مسعود عالم ندوی
مرحوم اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔

"اہل حدیث عالموں کے جس رہنما کو مولانا سندھی نازیدی شیعہ کہتے ہیں
وہ شیخ عبدالحق بن فضل اللہ بناری مہاجر کی روضۃ الجہۃ ص ۳۵۵ کا ایک متبع
سنت سلفی عالم ہیں ان پر زیدیت اور شیعیت کا الزام عائد کرنا بڑا ظلم ہے
مولانا نے انکا ذکر خیر مختلف جگہوں پر کیا ہے دو موقعوں پر زیدی شیعہ
اور ایک مقام پر نواب صدیق حسن خاں روضۃ ص ۱۳۲ کا استاذ بھی بتایا
گیا ہے۔ لیکن نام لینے سے احتراز رہا ہے ہمیں نہیں معلوم کہ امیر شہید نے
انہیں کب جماعت سے نکلوا دیا تھا۔ کیا اس کا کوئی مستند ثبوت پیش کیا جا
سکتا ہے؟ لے

لے شاہ ولی اللہ دہلوی کی سیاسی تحریک مثلاً اشاعت دوم نیز دیکھو اسی کتاب کا صفحہ ۱۳۲

لے مولانا سندھی اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے کہ کمرہ میں ایک دس سال
دیکھا ہے جس میں مولوی عبدالحق بناری کے اخراج کا واقعہ درج ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی
اس جواب کی بابت لکھتے ہیں افسوس کہ موجودہ حالات میں اس کی تحقیق بھی نہیں ہو سکتی ہندوستان کے کتاب
خانوں میں کسی ایسی کتاب کا پتہ نہیں چلتا شیخ عبدالحق کے بارے میں ہندی حکومت اسکی نایاب نہیں کرتی

اب رہا شیخ عبدالحق بن فضل اللہ پیر زیدیت اور شیعیت کا الزام
 تو اسکی حیثیت ایک بہتان سے زیادہ نہیں دیکھئے! کہیں ”مرغ قبلہ نما“
 تو آپ کی ناوک انگلی کا نشانہ نہیں بن رہا ہے؟ مولانا سندھی اور انکے افکار
 پر ایک نظر صرف مولانا عبید اللہ سندھی اپنے زعم باطل میں امام شوکانی کو بھی زیدی
 شیعہ سمجھ رہے ہیں اسی بنیاد پر انھوں نے ان کے شاگرد شیخ عبدالحق بناری
 کو زیدی کہا ہے۔ مولانا مسعود عالم مرحوم نے بڑی تفصیل سے اور نہایت معقول
 طریقہ پر پرزور دلائل کے ساتھ ان کے اس زعم باطل کی تردید کی ہے۔
 سندھی صاحب کا یہ بہتان سراسر بے بنیاد ہے اس لئے ہم ضرورت نہیں سمجھتے
 کہ مولانا ندوی کے جواب کے زیادہ اقتباسات یہاں پیش کریں۔
 یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ شیخ عبدالحق کے مزاج میں تیزی تھی،
 وہ تقلید کی تردید اور غیر شرعی مراسم کے ابطال میں تشدد سے کام لیتے تھے
 اسی کا اثر تھا کہ غالی حنفیوں کے جواب میں ان کی زبان و قلم سے بعض اوقات
 ایسے کلمے بھی نکلے جن سے حضرت امام ابو حنیفہؒ کی تنقیص کا پہلو پیدا ہو سکتا
 تھا۔ یہ روش ان علمائے اہلحدیث کو بھی ناگوار گذری جو فقہی مباحث میں
 غلو اور تشدد کو ناپسند کرتے تھے۔ انھیں میں مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی
 مرحوم بھی تھے۔ یہ مدت العمر اس بات کیلئے کوشاں رہے کہ حنفی اور اہلحدیث
 دونوں اعتدال کی روش اختیار کریں۔ وہ لعن طعن کی روش کو شیعوں کا
 طریقہ بتاتے تھے اسی لئے انھوں نے شیخ عبدالحق کی نسبت بھی لکھ دیا کہ وہ
 شیعہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

”جیسا کہ مولوی عبدالحق بنارسہی نبی روش اختیار کر کے آخر شیعہ ہو گئے مگر آخر مرنے سے پہلے وہ اس مذہب شیعہ سے تائب ہو گئے اور خدا کے توفیق اور رہنمائی سے وہ سنی اہل حدیث ہو کر فوت ہوئے راشعۃ السنۃ جلد ۲۲ ص ۹۷ (۲۸۷)

یہ تو اپنوں کی روایت تھی۔ اب اس قدر تفریح کے لئے غیروں کی بنائی ہوئی کہانی بھی سینے اس سے معلوم ہو گا کہ شیخ عبدالحق کی مطلوب کوئی نئی نہیں، اپنے شیخ حضرت سید احمد شہید اور استاذ مولانا شہید کی طرح یہ بھی غیروں کے حلقے میں نیک نام نہیں، جماعت مجاہدین کے خاص کرم فرما مسٹر اوکنلے (J. comd. okinley) مولانا ولایت علی کے تذکرہ میں رقم طراز ہیں:

”ایک معلم کی حیثیت سے نمودار ہونے سے پہلے یہ مولانا ولایت علی بنارس کے ایک متعصب وہابی عبدالحق کے مرید ہو گئے تھے اس شخص کا اصلی نام غلام رسول (۹) تھا، لیکن وہابی تعلیمات اختیار کرنے کے بعد اس نے یہ غیر مذہبی نام ترک کر دیا اور عبدالحق نام اختیار کیا۔ اس کے بعد یہ مکہ گیا، جہاں اس کے مبتدعانہ خیالات کی خبر ترکی حکام کو ہوئی، گرفتاری کا حکم صادر ہوا لیکن یہ کسی طرح بچد پہنچ گیا (۹) چند سال بچد میں رہ کر یہ بنارس واپس ہوا جہاں یہ شیخ بخدی کے نام سے مشہور تھا لہ مولانا ولایت علی، شیخ عبدالحق کے مرید یا شاگرد نہیں تھے، البتہ دونوں ایک استاذ مولانا سلیمان

۱۰۴

مولوی ولایت علی اسکے اولین حلقہ بگوشوں (Conferences) میں تھے۔

ایک دوسرے صاحب اسی میں نمک مرچ لگا کر یوں خامہ فرسایا ہے۔
 "ایک بات اور بھی ہے جس میں ہندوستانی وہابی اپنے عرب
 بھائیوں سے الگ ہیں، یعنی یہ کہ سید احمد امام مہدی ہیں؟"
 ولایت علی (عبدالحق) کا ایک مرید نجد ہی میں وہابی ہو چکا تھا لیکن
 بنارس میں رہتا تھا، انے اس عقیدے کی تبلیغ کی، اور اس پر
 ایک کتاب بھی لکھی" (۹)۔

یہ سب عبارتیں مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب "مولانا سندھی اور ان
 کے افکار و خیالات پر ایک نظر" کے ص ۵۲ و ص ۵۳ سے ماخوذ ہیں۔
 مذکورہ بالا دونوں اقتباسات انگریزی تحریر میں ملنے کے حوالے سے مولانا ندوی نے
 نقل کئے ہیں۔ ان اقتباسات کی مشترکاتیں جھوٹ اور محض بناوٹی
 افسانے ہیں۔ مولانا ولایت علی شیخ عبدالحق کے مرید نہیں تھے۔ نہ شیخ
 عبدالحق کا اصلی نام غلام رسول تھا۔ نہ شیخ عبدالحق کبھی نجد گئے۔ نہ ترکی
 حکام کی گرفتاری سے وہ بچ سکے تھے۔ بلکہ گرفتار ہوئے ضمانت پر رہا
 ہوئے پھر مقدمہ چلا۔ اور مقدمہ کی پیروی اور بحث کے بعد وہ غیر مقصور
 وار ثابت ہوئے۔ یہ بھی بالکل غلط ہے کہ ہندوستانی وہابی سید
 احمد شہید کو امام مہدی سمجھتے تھے۔ نہ مولانا ولایت علی نے کبھی اس کی
 تبلیغ کی اور نہ اسکی بابت کوئی کتاب لکھی۔

منشی فضل الرحمن، منشی محمدی انصاری

منشی فضل الرحمن بروانی کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ وہ بھی سفر حج میں۔ سید صاحب رشیدیہ کے ساتھ تھے اور مسلک میں شیخ عبدالحق محمدی بناری کے ہم عقیدہ و ہمنوا تھے۔ مولانا تمہرنے لکھا ہے کہ حج کو جاتے ہوئے جب سید صاحب راج محل پہنچے تو منشی محمدی انصاری سید صاحب کو بہ اصرار اپنے وطن لیگئے (جو راج محل سے دس بارہ کوس پر تھا) وہاں منشی صاحب کے اکثر اقرباء نے سید صاحب کی بیعت کی۔ مثلاً ان کے والد منشی شاہ محمد منشی رؤف الدین، منشی مخدوم بخش، منشی حسن علی، رجبکار شتہ معلوم نہ ہو سکا۔ منشی فضل الرحمان اور منشی عزیز الرحمان یہ منشی محمدی کے باموں تھے اور لوگ بھی سید صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ منشی شاہ محمد جیکلے ساتھ گئے اے

سید صاحب اور ان کے جاناں زرفقار نے سرحد پار جو جنگ مایار | لڑائیاں لڑیں، ان میں جنگ مایار، ایک بڑی اہم

اور معرکے کی جنگ ہے۔ یہ جنگ سرحد کے ورنی قبائل کے ساتھ ہوئی ہر سید صاحب کو اسکا بے حد ملال تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں سے لڑیں، انفس کے ساتھ فرماتے تھے۔

”اللہ تعالیٰ کا کارخانہ دیکھئے۔ ہم ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے کہ مسلمان کو متفق کر کے کافروں سے لڑیں۔ بڑے انفس کی جگہ ہے کہ کفار تو درکنار یہ مسلمان ہی ہمارے مخالف اور دشمن جانی بن گئے اور ہم سے لڑنے کیلئے تیار ہو گئے۔ ہم تو ہرگز نہیں چاہتے کہ ان کو لڑیں۔ چنانچہ سلطان محمد خاں کو بار بار سمجھایا۔ لیکن نفس و شیطان نے اسکو شر و فساد پر اس درجہ آمادہ کر دیا کہ کچھ اس کے ذہن میں نہ آیا خیر، مشیت اگر یوں ہی ہے تو ہم ناچار ہیں جو کچھ ہوگا، دیکھ لیں گے لہ مولانا غلام رسول تہر لکھتے ہیں۔

”ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں ایک دو نہیں بیسیوں واقعات موجود ہیں کہ مسلمانوں نے جوع الارض کی خاطر مسلمانوں کے گلے کاٹے کلمہ گویوں نے کلمہ گویوں کا خون بہایا۔ لیکن ایسی مثال آپ کو شاید ہی مل سکے کہ وعیدداران اسلام نے ان غازیوں کو خونریزی اور خون آشامی کا ہدف بنایا۔ جنہیں رضائے حق کے سوا دنیا و آخرت کی کوئی چیز مطلوب نہ تھی۔ جسکے دلوں میں صرف ایک آرزو اور ایک

تڑپ تھی کہ مسلمان سچے مسلمان بن جائیں۔ عزت و سربلندی کی زندگیاں
بسر کریں۔ کوئی معاند انھیں آزار نہ پہنچا سکے۔ کسی بدخواہ کا
ہاتھ انکی طرف بڑھنے کی جرأت نہ کر سکے۔ یہ مکروہ اور گھناونا
کام صرف پشاور کے درانی سرداروں نے اپنے لئے پسند کیا۔

مثل هذا يذوب القلب من مكد

ان کات فی القلب اسلام وایمان

مولانا اسماعیل شہید اس موقع پر موجود نہ تھے۔ سید صاحب نے انکو بلانے
کلیں پیغام بھیجا تو نشی محمدی انصاری نے اپنی طرف سے مولانا کو لکھ بھیجا کہ
اپنی تشریف آوری کی خبر کو شہرت دیجئے۔ ایسے کہ آپ کی شجاعت
اس دیار کے خاص و عام پر روشن ہے کیا عجب ہے کہ دشمن آپ کا
نام سنکر مرعوب ہو جائیں اور اسی طرح مصالحت کی کوئی صورت نکل
آئے۔ لیکن مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی آخر جنگ ہوئی
اور بڑی گھمان کی ہوئی۔ اسی جنگ میں بعض مجاہد یہ رجز پڑھ رہے تھے۔
جس کے پیروں پہ گرے گر و صف جنگ وہ جہنم سے بچا، نار سے ہو وہ آزاد
لے برادر تو حدیث نبوی کو سن لے باغ فردوس ہر تلوار و کسے سائے کرتے
جو مسلمان رہ حق میں لڑا لحظہ بھر روضہ خلد بریں ہو گیا واجب اس پر
آج جو اپنی خوشی جان، خدا کو دو گے پھر تو کل شوق سے جنت کے مزے لوٹو گے

لے سیاحہ شہید طبلہ دوم ص ۲۳۳ و ۲۳۴

دشمن بڑی تیاری کے ساتھ مقابلہ پر آئے تھے۔ درانی فوج اس وقت بارہ ہزار تھی۔ چار ہزار پیادے اور آٹھ ہزار سوار۔ ان کے پاس دو بڑی اور چار چھوٹی توپیں تھیں۔

سید صاحب کے پاس غازیوں کی مجموعی تعداد ساڑھے تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ سوار صرف پانچ سو تھے۔ توپ کوئی نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال تھی۔ سید صاحب لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر جب جنگ ناگزیر ہو گئی تو سید صاحب خود اور ان کے تمام مجاہد رفقار، بڑی پامردی اور استقلال سے لڑے۔ آخر چشم فلک نے دیکھ لیا کہ صرف ساڑھے تین ہزار کے قائلہ حق نے باوجود بے سرو سامانی بارہ ہزار کے لشکر کو شکست فاش دی، جو ہر قسم کے سامان سے لیس تھا۔

شہداء کی تدفین | اس جنگ میں جن خوش قیمت غازیوں کو شہادت نصیب ہوئی انھیں میں منشی فضل الرحمان بروہانی بھی تھے۔ شہداء کی تدفین کا انتظام مولانا شاہ اسماعیل کے سپرد صاحب نے کئی کئی شہیدوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا چنانچہ منشی فضل الرحمان کے ساتھ حاجی عبدالرحیم کچھلی والے، سید ابو محمد نصیر آبادی، میر رستم علی، شیخ عبدالحکیم سہلپتی، مولوی عبدالرحمن ساکن تور دکریم بخش، عبدالرحمان رائے بریلوی بھی دفن کئے گئے۔ مؤخر الذکر کو کفن بھی پہنایا گیا تھا۔ باقی تمام اصحاب

لے سید احمد شہید جلد دوم باب ۲۵۔

کو بلا غسل و کفن ان کے لباسوں میں بہ دستور رکھ دیا گیا۔ مولانا نے فرمایا ان کے عماموں کا ایک سر لے کر منہ ڈھانپ دیئے جائیں۔

بعد تدفین مولانا نے غازیوں سمیت دیر تک شہداء کیلئے مغفرت کی دعا کی۔ سب کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر یہ کلمہ تھا کہ یہ بھائی تو جس مراد کو آئے تھے حاصل ہو گئی۔ خلاہم لوگوں کو بھی اسی طرح شہادت نصیب کر لے

تھوڑی دیر بعد مغرب کی اذان ہوئی۔ سید صاحب نے **حب رضا کی دعا** خود نماز پڑھائی۔ پھر غمزہ الحاج سے دعا کی کہ ..

اے ہمارے پروردگار تو خوب جانتا ہے کہ یہ سب لوگ محض تیری خوشنودی اور رضا جوئی کیلئے اپنے گھر بار، خویش و تبار، اہل و عیال اور مال و منال چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ اور صرف تیری راہ میں انھوں نے اپنی جانیں صرف کیں۔ ان کے گناہوں کو اپنے دامن رحمت میں چھپالے۔ فردوس میں جگہ دے اور ان سے راضی ہو۔ ہم جو چند ضوفاور اور غربا تیرے عاجز بندے باقی ہیں۔ ان کو بھی اپنی رضا مندی اور خوشنودی کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ہمارے سینوں میں جو شیطانی خطرات اور نفسانی وساوس خطور کرتے ہیں۔ ان کو دور کر دے۔ دلوں کو اپنے اخلاص و محبت سے معمور رکھ۔ اپنے بین کو قوت اور ترقی بخش جو لوگ اس دین کے

لے سید احمد شہید جلد دوم باب ۲۵

و دشمن اور بدخواہ ہیں انھیں ذلیل و رسوا کر۔ جو مسلمان شریعت کے راہ راست سے ہٹ کر بادیہ ضلالت میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ انھیں ہدایت دے اور بچے مسلمان بنا دے۔ تاکہ اس کا رخصس میں جان و مال اور اہل و عیال سے شریک ہو لیں۔

منشی محمدی انصاری جنہیں بعض اوقات بروہانی منشی محمدی انصاری | بھی لکھتے ہیں۔ منشی فضل الرحمن رنہ کور کے

بھانجے تھے۔ مجاہدین میں ان کا عہدہ میر منشی کا تھا۔ انھوں نے سید صاحب سے اس زمانہ میں بمقام میرٹھ بیعت کی تھی۔ جب سید صاحب میرٹھ، بہارن پور، مظفرنگر وغیرہ کے دورے پر نکلتے تھے۔ اس وقت منشی صاحب کی عمر انیس بیس سال سے زیادہ نہ ہوگی اس لیے کہ دوران جہاد میں جن لوگوں نے انھیں دیکھا۔ انکی عمر پچیس چوبیس سال کی بتائی۔ سفر حج میں سید صاحب کے ساتھ رائے بریلی سے روانہ ہوئے۔ راج محل پہنچ کر سید صاحب کو اپنے وطن لے گئے۔ وہاں ان کے اقربا نے سید صاحب سے بیعت کی جیسا کہ پہلے اس کا ذکر آچکا۔

سید صاحب انکو عموماً: "انصاری بھائی" کہہ کر پکارتے تھے۔ اور تمام اہل لشکر انھیں "بھائی صاحب" کہتے تھے۔ ان کا صحیح نام معلوم نہ ہو سکا البتہ: محمدی نسبت ان کے اہل حرمیت ہونے کی دلیل ہے۔ مجاہدین

میں الحمد بیٹ ہی اپنے کو محمدی کہتے تھے۔ اور آج بھی یہ طرہ امتیاز محمدیہ
انہیں کو حاصل ہے۔

مہجرت جب اطلاع ملی کہ سید صاحب ہندوستان سے ہجرت فرمانے
کا ارادہ کر رہے ہیں تو منشی محمدی بیوی، بچے اور اقربا کو بھونڈ
کر لائے بریل پہنچ گئے۔ اور سید صاحب کے ساتھ ہجرت کا شرف حاصل
کیا، ان کے ماموں منشی فضل الرحمان بھی ساتھ تھے۔

انتظام و قریب منشی صاحب کو تحریر پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی، اندھیرے
میں بھی بے تکلف لکھتے، لیکن نہ سطر ٹیڑھی ہوتی نہ الفاظ
ایک دوسرے سے پیوست ہوتے۔ انہوں نے مختلف امور کیلئے الگ
الگ بستے بنائے تھے۔ یہ بستے ایک بڑے صندوق میں رہتے جس
بستے کی ضرورت پڑتی محافطوں سے کہہ کر صندوق میں سے نکالوا لیتے۔ ہر
مہینے کے آغاز میں روزنامے کی جدولیں تیار کر لیتے، اس روزنامے میں
تمام حالات تفصیل سے لکھوا لیتے۔

ایک واقعہ منشی محمدی کے ایک رفیق عبدالرحیم نو مسلم تھے۔ منشی صاحب
نے اپنی بندوق اُسے دے رکھی تھی۔ لیکن تاکید کر دی تھی کہ
اگر خبگ چھڑ جائے تو بندوق فوراً میرے پاس پہنچا دینا۔ فتح ہنڈ کے بعد
فی الفور کی یورشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ منشی صاحب اور عبدالرحیم ہنڈ ہی
میں تھے۔ ایک روز عبدالرحیم اونٹ چرانے کیلئے باہر چلا گیا اور بندوق
لے روشن مستقبل ص ۷۷

بھی ساتھ لے لیا۔ اسی اثنا میں غنیم کے ایک گروہ نے یورش کر دی۔ منشی صاحب بندوق کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ عبدالرحیم جوش حمیت میں خود شریک جنگ ہو گیا۔ سوء اتفاق سے بندوق سے بندوق کا چقماق گم ہو گیا، دوڑا دوڑا قلعہ میں آیا منشی صاحب بندوق اٹھا کر خود جلنے لگے لیکن انہیں موزوں چقماق نہ مل سکا۔ مجبوراً مستعمل چقماق کا ٹکڑا اٹھا کر لگالیا۔ انہیں خیال تھا کہ بندوق خالی ہے۔ عبدالرحیم نے بھی کچھ نہ بتایا منشی صاحب نے بلبلی و بادوی تاکہ چقماق کے کارآمد ہونے کا اندازہ کر لیا جائے۔ اس کے چار ٹکڑے ہو گئے۔ منشی صاحب نے ان میں سے بڑا ٹکڑا اٹھا کر دوبارہ لگایا اور کہا کہ اگر یہ آگ دے گیا تو فی الحال اسی سے کام لوں گا۔ عبدالرحیم جانتا تھا کہ بندوق بھری ہوئی ہے لیکن اس نے منشی صاحب کی توضیح کے بعد بھی کچھ نہ بتایا۔ تقدیر کی بات، منشی صاحب نے بلبلی و بادوی، بندوق چلی اور گولی عبدالرحیم کے شانے کے نیچے کی پڈی کو توڑتی ہوئی نکل گئی دوسرے دن اسی صدمے میں وہ نیک دل جاں بحق ہوا۔ منشی صاحب کو اس واقعہ کا بڑا قلق تھا۔ عبدالرحیم سکرات موت میں بھی منشی صاحب کو تسلی دیتے ہوئے کہتا رہا بھائی صاحب! رنج و غم نہ کریں، آپ نے مجھے نہیں مارا۔ آپ کو کیا معلوم تھا کہ بندوق بھری ہوئی ہے؛ میں بتانہ سکا جو کچھ پیش آیا وہ تقدیر ہی معاملہ تھا۔

منشی صاحب بڑے مخلص، سید صاحب کے کمال

اخلاق و عادات | معتقد اور آپ کے نزدیک نہایت معتبر و معزز

تھے۔ اخلاص کا یہ عالم تھا کہ دوران جہاد میں کبھی کسی معاملے کے متعلق سید صاحب سے خفیف سے اختلاف کا بھی موقع نہ آیا۔ سید صاحب کی طرف سے جو فیصلہ یا فرمان صادر ہوا اسکی درستی کے بہ دل متعقد تھے۔ آخر دم تک سید صاحب کے ساتھ رہے یہاں تک کہ انکی شہادت | شہادت بھی ہالا کوٹ میں سید صاحب کی شہادت کا ہ کے قریب ہی ہوئی۔ انھیں غالباً اس گنج شہیداں میں دفن کیا گیا جو قصبہ ہالا کوٹ کے مغرب میں مٹی کوٹ کے ٹیلے سے قریب ہے۔ شہادت کے وقت انکی عمر تیس برس جو کم تھی مولوی سید جعفر علی نقوی کا بیان ہے کہ

”میں اور منشی محمدی انصاری پاس کھڑے لڑ رہے تھے۔ اچانک قاضی علاء الدین لڑائی سے دست کش ہو کر حضرت کا پتہ پوچھتے ہوئے آئے منشی انصاری نے بھی لڑنا چھوڑ دیا اور حضرت کی تلاش میں بائیں جانب چلے گئے۔ اسی حالت میں یہ دونوں بزرگ یعنی قاضی علاء الدین اور منشی محمدی انصاری اگولیاں کھا کر شہید ہو گئے“

سید اولاد سن قنوجی

موصوف تلمذ رشید میں قنوج میں پیدا ہوئے باپ کے سائے
عاطفت سے بچپن ہی میں محروم ہو گئے تھے۔ خاندان میں کوئی دوسرا ایسا
بزرگ بھی موجود نہ تھا جو انکی تعلیم و تربیت پر اپنی خصوصی توجہ مبذول کرتا
یا نہ کہ قدرت نے انکو ایک خاص ملکہ صلاحیت و استعداد عطا کیا
تھا۔ اسلیئے خود بخود محض اپنے ذوق طبعی اور شوق فطری سے کتاب علم کی
طرف انکی عنان توجہ معطوت ہوئی۔

ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی۔ پھر لکھنؤ پہنچے اور مولوی محمد نور حسنا
اور جناب مرزا حسن علی صاحب محدث کے حلقہ اور س میں داخل ہوئے جو
اسوقت اہل علم کے طبقہ میں سرآمد روزگار تھے۔ کچھ زمانے تک کتاب
علم کے بعد وہلی کا سفر کیا۔ وہاں حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین
شاہ عبدالقادر سے تفسیر، حدیث، فقہ، اور دوسرے علوم پڑھے۔ ان
بزرگوں کی تعلیم و تربیت اور فیض صحبت کے اثر کو اپنے خاندانی مذہب شیعیت
سے تائب ہو کر اہل سنت کا مسلک اختیار کیا۔ اور تمام اہل خاندان سے
جو اباب تشیع میں سے تھے، اپنے تعلقات منقطع کر لیے اور مذہب شیعہ
و غمی کو یک قلم اٹھا دیا

۱۲۰۰ مائتہ صدیق محمد اول

تحصیل علم سے فراغت کے بعد سید احمد صاحب شہید
بیعت جہاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہر طرح کے ایشیا و قربانی
 اور خدمت قوم و ملت کیلئے اپنے کو پیش کیا۔ ان سے بیعت کی اور مجاہدین
 کی جماعت میں شامل ہو گئے ان سابقین اولین میں شریک تھے جو سید
 صاحب کے ساتھ جہاد کیلئے سرحد پار گئے تھے۔ کچھ مدت کے بعد سید
 صاحب نے انکو سند خلافت دے کر دعوت و تبلیغ کی غرض سے وطن واپس
 بھیج دیا۔ چنانچہ نواب اصحاب ان کے حالات میں لکھتے ہیں۔

وجاہد معہ فی سبیل اللہ و صار خلیفۃ لہ فی دعوة الحق الی الدین
 اللہ تعالیٰ فرجع الی الوطن

مراجعت وطن کے بعد کمال بیس برس تک یعنی اپنی
دعوت و ارشاد آخر حیات تک وہ اسلام کی تبلیغ اور قوم کے
 اصلاح میں سرگرم رہے۔ نواب صاحب لکھتے ہیں۔

”و باجارت و خلافت مستعد گشتہ از ولایت بقنوج آمدند و اشتغال
 بوعظ و ہدایت خلق و تحریریں ایشان بر جہاد و اتباع خیر العباد فرمودند
 تا آنکہ در قلیل مدت نفع کثیر بخلق رسید و زیادہ از وہ ہزار کس سکند ،
 اطراف قنوج مسلمان و مومن شدند و مومنان در تادیب احکام اسلام سرگرم
 گردیدند مسجد ہا آباد گردید صوم و صلوٰۃ رونق و گیر گرفت ، امام باڑہ ہا
 با خاک برابر شد تعزیر ہا نام و نشان باقی نماند سنت ہائے بسیار زندہ گشت بدعت ہا
 بے شمار ببرد“

لہ اجد العلوم ۹۳۵ء ۲۵۰ اتحاف النبلاء ص ۲۳۶

ترجمہ: سید احمد شہید سے اجازت و خلافت کی سعادت حاصل کر کے وہ قنوج واپس آ گئے۔ ہدایت خلق اور وعظ و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع پر آمادہ کرتے تھے یہاں تک کہ تھوڑی ہی مدت میں ان کی ذات سے مخلوق خدا کو بڑا فیض پہنچا۔ اطراف قنوج کے دس ہزار سے زیادہ غیر مسلم ان کی تبلیغ سے مسلمان ہو گئے اور جو مسلمان غافل تھے وہ احکام اسلام کی پابندی میں سرگرم ہو گئے مسجدیں آباد ہو گئیں۔ صوم و صلوٰۃ کی رونق بڑھ گئی۔ امام باڑے خاک میں مل گئے اور تعزلیوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ بہت سی سنتیں زندہ ہوئیں اور بے شمار بدعتیں ختم ہوئیں۔

خود سید صاحب ایک مکتوب میں انہیں لکھتے ہیں:-

آپ نے رب العالمین کے احکام کی تبلیغ کے سلسلے میں اپنی مصروفیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بہت خوشی حاصل ہوئی اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی نیک جزا دے۔ تمام مسلمانوں خصوصاً بڑے بڑے علماء و مشائخ پر لازم ہے کہ اسلام کے احکام کو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں پھیلائیں اور رب کریم کی رضا حاصل کرنے کیلئے ان کو تیار کریں ان کو سیدھی راہ پر چلائیں۔ میں اہل ملت و غیر کی	انچازہ مصروفیت خود تبلیغ احکام رب العالمین نوشتہ اید موجب فحرت بسیار شد جزاکم اللہ خیر الجزاء بر سر کیے از منین خصوصاً علمائے اعلام و مشائخ کرام لازم است کہ احکام اسلام را بر بندگان او تعالیٰ شائع و ذائع گردانند و براہ مستقیم و رضائے رب کریم مستعد سازند، و این جانب از دعوت اہل سوات و غیر
--	--

فارغ شدہ برائے ازالہ کفر و فساد تباہ
پنجاب رسیدہ است انشاء اللہ تعالیٰ
عقرب البواب نصرت فتح بر مجاہدین
ابرار مفتوح خواهد شد انتہی بلفظہ راتھا
اصلاح و دعوت سے فارغ ہو کر کفر و فساد کے
ازالہ کیلئے پختیار تکمہ پہنچا ہوں، انشاء اللہ
تعالیٰ عنقریب فتح و نصرت کے دعوازے
مجاہدین پر کھل جائیں گے۔

النبلا ص ۲۲۶

دعوت و ارشاد کے سلسلے میں کتابیں بھی لکھیں ایک رسالہ "راہ سنت"
کے نام سے نظم میں تالیف کیا۔ اسکے کچھ اشعار ہم یہاں نقل کرتے ہیں
ہو اگر دنیا میں مسدوب امراد
الغرض دیکھیں جب ان آنکھوں کا
اب کمی کا فعل ہو یا قول ہو
مولوی فاضل ہو یا استاذ پیر
نندہ ہو مودہ ہو یا نرویکٹ دور
ہو رسالہ یا کہ ہو کوئی کتاب
گرا سے بر حسب عزت پایے
گر نہ ہو سنت سے اسکو اتفاق
ہے خطا کی پیروی گمراہ خطا
ہر طرح تبعیت اور تقلید عام
مذہب ارباب سنت کر یقین
مجتہد کے حق میں ہر بخطلی یصیب
عالم سنت بہنگام فساد
یہ بلا کے اختلافات اسم
چاہیے سنت سے اسکو تولو
یا ولی یا شیخ یا شاہ و فقیر
ہو ولایت یا کراست کا ظہور
مجتہد ہو یا فقیہ لا جواب
بے خطر اس کو عمل میں لائیے
چھوڑ دے اسکو ہے کردار شقاق
یہ اجازت کب ہوئی ہم کو روا
غیر پیغمبر کی ہے جائے کلام
جز نبی معصوم عالم میں نہیں
ہے خطا جائز ولی سے لے حبیب

جو خطا تقلید میں ہوتی معاف
 کہتے ہیں اکثر گروہ معتقد
 دشمن تحقیق ان کی بات ہے
 علم ہیں رکھتے بہت عالم مگر
 راہ پر کچھ اور کچھ بے راہ ہیں
 اچھے اچھے ہیں خطا میں آپڑے
 الغرض یہ وہم ہیں سب در خیال
 جان و دل سے چاہیے کرنا قبول
 کس لئے پڑتا بھلا پھر اختلاف
 ہے خطا سے پاک قول مجتہد
 جز نبی، معصوم کسی ذات ہر
 کس لئے نزدیک از باب خبر
 گرچہ اہل علم ہیں۔ آگاہ ہیں
 مذہب باطل میں عالم ہیں بڑے
 ہے بجائے خود یہ دعوائے محال
 لطف قال اللہ اور قال الرسول

سن چکے تم حسن ارشاد نبی
 چاہیے سنت کی اب تو پیروی

ان کے صاحبزادے نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ
 "اللہ تعالیٰ نے میرے باپ کو سنی خالص محمدی قح بنایا تھا۔"
 تقریباً ایک ہفتہ بیمار رہے مگر اس درمیان میں فرض
 وفات نمازیں برابر قیام کے ساتھ اوقات معینہ پر ادا کرتے رہے
 البتہ نوافل میں کبھی کبھی بیٹھ جایا کرتے تھے۔ جب انھوں اپنی زندگی کے
 جانب سے قطعاً مایوسی ہو گئی تو حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ: آپ لوگ
 گواہ ہیں کہ مجھ پر تبلیغ احکام دین کے باب میں جو واجب تھا اسکو میں نے

لے تراجم عللے حدیث ہند جلد اول بحوالہ طریق انجیدی مولفہ حافظہ عزیز الدین صلاہ ملو آبادی ۱۳۱۷
 (بقار المنہ ص ۱۲)

اگرچہ حتی الامکان بغیر افراط یا تفریط کے پورا کیا اور اپنی تمام تر کوششیں کام میں اتباعتاً سید المختار صرف کی لیکن اب وقت سر پر آپہنچا کہ اپنے خدائے غفور و رحمان و رحیم کی بارگاہ میں حاضر کیا جاؤں، مجھ کو افسوس اور انفعال اس بات کہ ہے کہ کوئی کام میرے ہاتھ سے لائق قبول عمل نہیں نہیں آیا۔ میں کسی طرح سزاوار عدل نہیں ہوں۔ محض اسکے فضل پر بھروسہ ہے کہ ابھی یہ تقریر ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان پر یہ ہمیشی طاری ہو گئی، تھوڑی دیر کے بعد کسی قدر ہوش آیا زبان سے کچھ کہنا چاہا مگر بول نہ سکے۔ پھر اشارہ سے نماز کا وقت دریاقت کیا جب ان کو معلوم ہوا کہ نماز ظہر کے وقت میں ابھی کچھ دیر ہے تو آہستہ سے کہا کہ نماز کا وقت نہ آئے گا کہ ہم روانہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نماز ظہر سے پہلے ہی بروز پنجشنبہ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۳ء) میں ان کی روح عالم جاودانی کو پرواز کر گئی، محدث شیخ پورہ قنوج میں دفن ہوئے۔

ان کے دو صاحبزادے تھے ایک مولانا سید احمد حسن عرفی دوسرے اولاد امیر الملک تو اب صدیق حسن خاں والی بھوپال، دونوں کے سر سے ان کے والد کا سایہ عاطفت بچپن ہی میں اٹھ گیا تھا۔ اول الذکر کی عمر والد کے انتقال کے وقت قریباً سات برس کی تھی اور مؤخر الذکر کم و بیش پانچ سال کے تھے۔ اور تین لڑکیاں تھیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ان دونوں صاحبزادوں کے حالات

پر بھی کچھ تھوڑی سی روشنی ڈال دی جائے۔

سید احمد حسن عرشی | ابتدائی تعلیم اپنے وطن قنوج میں حاصل کی پھر بغرض اکتساب علم کا پلور، فرخ آباد، بریلی، علی گڑھ اور دہلی کا سفر اختیار کیا اور اساتذہ وقت کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور ان سے استفادہ ہوئے۔ مجملہ علوم نقلی و عقلی میں کمال حاصل تھا۔ عربی، فارسی اردو تینوں زبانوں کے با کمال شاعر تھے۔ فارسی اور اردو شاعری میں غالب کے شاگرد تھے انکی شاعری کی بابت نواب صاحب لکھتے ہیں۔

”در عربی ہمعنان شعرائے جاہلیت اندو در فارسی ہم بزم عرفی و نظیری و در اردو مقتدرائے آتش و ناسخ“

یعنی عربی میں شعرائے جاہلیت کے ہم پلہ ہیں۔ اور فارسی میں عرفی اور نظیری کے ہم نشین اور اردو میں آتش اور ناسخ سے بلند۔

ان کے مسلک کی بابت مصنف ”سیرت والا جاہلی“ لکھتے ہیں۔

”مولانا نے مرحوم کو عمل بالحدیث میں خاص شغف تھا۔ اور

مقلدین مذہب سے رجحان تحقیق و تدقیق سے کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ طبعی نفرت تھی۔ چنانچہ انھوں نے تقلید کے ذمائم و مفاسد کے متعلق

بہت سے رسائل مطول و مختصر تالیف کئے“ ص ۷۹

نواب صاحب لکھتے ہیں۔

”وہیں زمان آخر کیسکے نصرت سنت کنڈایشان بودند و رد و تقلید

ید طولیٰ داشتند۔ دیدہ نہ شد کہ با کسے دریں باب تقریرے و تحریرے
بودہ باشد۔ مگر آنکہ الزام سخت اور ادا نند۔ در اصول فقہ امام عہد بوند
وسنن و آثار کتب بستہ گویا بر نوک زبان بود تمام ہمت مصروف انتصار
فرقہ اتباع می کردند۔ کتابے موسوم شہاب ثاقب در رد تقلید بر وجہ
نوشته اند کہ مثلش در ہند دیدہ و شنیدہ نہ شد۔

یعنی اس آخری زمانے میں سنت کی حمایت کرنے والا اگر کوئی شخص
ہے تو وہ یہ ہیں۔ رد تقلید میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ جس کسی سے بھی اس مسئلہ
میں کوئی گفتگو ہوئی اسکو الزامی جواب میں سخت گرفت میں لے لیتے
تھے۔ اصول فقہ میں اپنے زمانے کے امام تھے۔ صحاح ستہ کی حدیثیں گویا
نوک زباں پر تھیں۔ اپنی تمام کوششیں فرقہ اتباع سنت (الہدیش)
کی مدافعت میں صرف کرتے تھے۔ تقلید کی تردید میں "شہاب ثاقب"
کے نام سے ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے کہ ہندوستان میں اس جیسی کوئی
کتاب اب تک نہ دیکھنے میں آئی اور نہ سننے میں۔

اسی "اتحاف النبلاء" میں نواب صاحب نے "اسامی کتب و
مولفین" کے ذیل میں جہاں اپنے بھائی مولانا سید احمد حسن قنوجی کی اس
کتاب "شہاب ثاقب" کا ذکر کیا ہے وہاں لکھتے ہیں۔
"و دراستقرای فقیر در رد تقلید کتابے جامع شملی وے دریں آخر
زمان تالیف نیافتہ و مولف وے در رسالہ تنقید خود در حق وے

گفتہ ہو کتاب لو اجتماع اہل المشرق والمغرب علی ابطالہ لما قدروا
لفضل اللہ تعالیٰ۔ فی الواقع اس کتاب بچھنیں است و تصدیق اس میں
ملتی ہو بر مطالعہ اوست بنظر انصاف ولیکن در حیات مولف از
سوا وہ بیاض نرسیدہ فلیعلم انتہی بلفظہ۔

ترجمہ :- میرے استقرائیں رد تقلید کے باپ میں ایسی جامع کتاب اس
آخر زمانے میں نہیں پائی جاتی اسکے مولف نے خود اس کتاب کے حق میں
یہ دعویٰ کیا ہے کہ (میری) اس کتاب کا جواب لکھنے کے لئے مشرق و مغرب
کے سارے (مقلدین) جمع ہو کر بھی کوشش کریں تو انشاء اللہ وہ اس کا
جواب نہ لکھ سکیں گے۔ نواب صاحب مولف کے اس دعوے کی تائید
و تصدیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

” فی الواقع یہ کتاب ایسی ہی ہے۔ مولف کے اس دعوے کی تصدیق
اس بات پر موقوف ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ نظر انصاف سے کیا جائے
لیکن یہ کتاب مولف کی حیات میں شائع نہ ہو سکی۔“
نواب صاحب نے ان کے عمل بالحدیث اور انکار رائے و تقلید کا حال
اس طرح بیان کیا ہے۔

” در بارہ عمل بحدیث و انکار رائے نمونہ حافظ ابن حزم و شیخ الاسلام
ابن تیمیہ بودند اما ایشان را بر کتب این بزرگواران اطلاع نبودہ بحدت
آنکہ تصانیف ایشان در ہند موجود و میر نہایت۔ اگر روزے از دہر توالیف
این اکابر در انتصار سنت و رد بدعت و انکار تقلید و اختیار تحقیق

بنظر ایشاں می گذشت و اطلاع و عبور بر اولہ و برابین نقلیہ و حج سمیعہ و دلائل سلفیہ ایشاں دست بہم می داد، خدا داد و در تقلید چہ عجائبی نمودند زیرا کہ با وجود عدم اطلاع آنقدر اولہ متفرقہ را یکجا کرده بودند کہ در خیال نمی آید کہ کسی لہجہ و زبان جمع می تواند کرد :

ترجمہ در عمل بالحدیث اور انکار رائے کے بارے میں یہ حافظ ابن حزم اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا نمونہ تھے البتہ ان بزرگوں کی تصانیف پر انکو اطلاع نہ تھی اسلئے کہ ان حضرات کی تصانیف ہندوستان میں موجود اور میسر نہیں ہیں۔ اگر ان بزرگوں کی وہ کتابیں جو سنت کی حمایت بدعت کی تردید، تقلید کے انکار، اور تحقیق کے اختیار کرنے کے بارے میں ہیں ایک مرتبہ بھی انکی مولانا احمد حسن عرشی کی نظر سے گزری ہوتیں۔ اور ان اسلاف کے بیان کردہ برابین نقلیہ، حج سمیعہ، اور دلائل سلفیہ ان کے ہاتھ لگ گئے ہوتے۔ تب تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ تقلید کے رویں کیا کیا عجائبات دکھلاتے۔ جبکہ ان کتابوں پر اطلاع نہ ہونے کی صورت میں انھوں نے اسقدر کثیر تعداد میں متفرق دلائل یکجا کر دیئے تھے کہ کسی دوسرے کیلئے عمر دراز میں بھی ان کا اکٹھا کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے،

نواب صاحب نے: "اتحان النبلاء" اور "ابجد مولانا عرشی کا ایک خواب" العلوم: ان دونوں کتابوں میں مولانا سیلا احمد حسن عرشی مرحوم کا ایک خواب نقل کیا ہے ہمارے نزدیک وہ بھی

۱۲۴

اس موقع پر قابل ذکر ہے اس خواب کی تفصیلات عرشی صاحب نے خود اپنے قلم سے بیان کی ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں: أما بعد فانی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمرحہ وستر قنوج فی مبشرۃ اریتمہا یوم الثلاثاء فی الثامن من رمضان المبارک سنة خمس وستین بعد الف ومائتین من ہجرتہ صلی اللہ علیہ وسلم رأیتہ وهو حین ولونہ ابیض من لون الخطۃ وقد کلا لیشکی منہ قصر ولا طول فرأیت انی اکلت معہ طعاما واطال یدہ صلی اللہ علیہ وسلم الی قصتی فقربت الیہ قنۃ ولہا بیڈ کا الشرفیۃ واخذ کاندہ یا کل فی قصتی وکانہ لم ین فی قصتہ طعام او کان فاکلہ و لم یبق منہ شئ فقلت ایتما الحضرة! من رأى کم فی ہذا الزمان وصحبکم فی المنام هل یعد من اصحابکم فاجاب بما مفہومہ انہ لا یعد منہم واعطانی فلوسا وسألت منہ صلی اللہ علیہ وسلم ان بعض الناس یترون حدیثکم بقیاس المجتہدین مع ان المجتہدین انما قاسوا اذ لم یجدوا حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادعوا اصحابہم بالعل علی الحدیث و الناس فی ہذا الزمان قد غلوا فی ذلک وکفروا من ارشادہم الی اتباع السنۃ المخالفتہ لہم فتاہدت اناس الملال فی بشرتہ صلی اللہ علیہ وسلم من صیغ الناس ہذا وصارہم یحرفون کان الملال یبلغ فی القلب و یقین من النظر الیہ انہ لا یرضی بصنیعہم ہذا و کنت اذا سلطت عن شئ اری جسمی کاندہ یمس جسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و هو صلی اللہ علیہ وسلم لا یمس کاندہ بل یتعطف علی و یقبل الی بوجہہ و وجدت

لہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد ہذا المبعوثۃ عظیمۃ من قلبی حتیٰ عجبۃ
ان جلی فی اللہ ندا کا و اقل فی الجہاد وانا احبہ ووجدتہ صلی اللہ علیہ
وسلم یرضی بالعل الحدیث واللہ علی ما نقول شہید وکفی بہ شہید اتھی۔
ترجمہ :- میں نے فتوح میں ۸ رمضان مبارک ۶۶۲ھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کو خواب میں دیکھا آپ کا رنگ گہرے گہرے رنگ سے بھی زیادہ صاف اور حسین
تھا۔ آپ کا تہ بھی معتدل اور متناسب تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں کھانا کھا رہا ہوں
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنا دست مبارک میرے برتن کی طرف
بڑھایا۔ میں نے اپنا سامن آپ کے قریب کر دیا آپ اس میں سے لیکر کھانے
لگے۔ میں نے عرض کیا حضور! جو شخص اس زمانے میں آپ کو دیکھ لے اور خواب
میں آپ کی ہم نشینی کا شرف بھی حاصل کر لے کیا وہ آپ کے صحابہ میں شمار
کیا جائے گا؟ آنحضرت نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا تھا اس کا مفہوم
یہ تھا کہ نہیں۔ پھر میں نے دوسری گزارش یہ پیش کی کہ بعض لوگ مجتہدوں کے
قیاس کے مقابلے میں آپ کی حدیثوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ ان مجتہدوں
نے اسی وقت قیاس کیا تھا جب انکو حدیث نہ ملی تھی۔ نیز انھوں نے یہ صیغہ
بھی کر دی تھی کہ وجہ حدیث مل جائے تو ہمارے قول کو چھوڑ کر حدیث پر عمل
کیا جائے۔ اس زمانے میں تو لوگ اس معاملہ میں حد سے بڑھ گئے ہیں۔
یہاں تک کہ اس شخص کو کافر کہتے ہیں جو ان کو ان کے مذہب کے خلاف کسی
سنت کی اتباع کی دعوت دیتا ہے۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ لوگوں کے اس
طرز عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر رنج و ملال

کے آثار نمایاں ہیں۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی (اس وقت کی) کیفیت دیکھ کر یقین کر لیا کہ حضور کو لوگوں کا یہ طریقہ ناگوار اور ناپسند ہے۔ میں جب کوئی بات بوجھتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا بدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کو چھو رہا ہے مگر حضور اسکو برا نہ مانتے تھے بلکہ مجھ پر جھک کر میری طرف مزید توجہ فرماتے تھے۔ اس خواب کے بعد سے میرے دلیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بہت بڑھ گئی ہے۔ جی یہی چاہتا ہے کہ آپ کی حمایت میں خود کو قربان کر دوں۔ خدا کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کیا جاؤں۔ میں نے محسوس کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث پر عمل کرنے کی وجہ سے خوش ہیں۔ یہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر اللہ گواہ ہے اور اسکی گواہی کافی ہے۔

مولانا عرشی نے کئی بار حج بیت اللہ کا ارادہ کیا لیکن انکی والدہ **وفات** ماجدہ یہ کہہ کر ان کو روکتی رہیں کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم سب ملکر ساتھ چلیں گے۔ تھوڑے دن ٹھہر جاؤ۔ کچھ روز تک وہ منتظر رہے مگر جب کوئی صورت سب کی روانگی کی نہ بن پڑی اور زیارت حرمین کے ذوق و شوق کے استیلا نے ان کے دلیں زیادہ شور و شہ پیدا کی تو وہ اکیلے ہی چل کھڑے ہوئے۔ منزل بمنزل طے کرتے ہوئے بڑا دھوپنچ گئے مگر یہاں پہنچ کر دفعۃً تیب اسہالی میں مبتلا ہو گئے اور ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۲ھ کو ۳۳ برس نو مہر ۱۱۷۱ روز جمعہ کو انتقال فرما گئے۔ اور وہیں دفن ہوئے فرامدہ اللہ تعالیٰ دایا نا برحمتہ العاسعہ وغفر لنا ولہ بکر من العمیم وقد قال

تعالیٰ ومن یخرج من بیتہ مهاجرًا الی اللہ در مولیٰ ثم یدہا کہ الموت نقد
وقع اجراء علی اللہ۔

مولانا سید اولاد حسن قنوجی رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے
نواب صدیق حسن خان صاحب نامور صاحبزادے نواب صدیق حسن خاں قنوجی

تھے۔ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۵ھ بموافق ۱۱ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو پائش بریلی میں جہاں انکی
نہیال تھی پیدا ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کی والدہ محترمہ انکو ہریلی سے لیکر
قنوج میں جو آبائی وطن تھا چلی آئیں۔ یہ گزر چکا کہ ان کی عمر پانچ برس
کی تھی کہ باپ کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ یتیمی کی حالت میں اپنی والدہ
ماجدہ کی آغوش میں پرورش اور تربیت پائی۔ لیکن والدہ محترمہ نے
انکی کس طرح تربیت کی۔ اسکا اندازہ اس واقعے سے لگائیے۔ نواب صاحب
خود لکھتے ہیں کہ میں سات برس کا تھا مکان کے دروازے پر مسجد تھی
مجھے خوب یاد ہے کہ جب صبح کی آذان ہوتی اور میں سوتا پڑا ہوتا تو والدہ
محترمہ مجھے اٹھا کر دھو کر اتیں اور اپنے سامنے مجھکو مسجد بھیج دیتی تھیں کبھی
گھر میں نماز پڑھنے نہیں دیتی تھیں۔ اگر نیند کی سستی کی وجہ سے میری آنکھ
نہ کھلتی تو منہ پر پانی ڈال دیا کرتی تھیں۔ اس سبب سے نماز کی عادت
لڑکپن سے برابر رہی۔ شاید دس برس کی عمر میں روزہ رکھو یا تب
روزہ کی عادت پڑی۔

اس تربیت کا یہ اثر ہوا کہ بری صحبتوں اور بری عادتوں سے ہمیشہ دور

لے ابقار السنہ

رہے۔ علماء اور صلحا کی مجلسوں میں بیٹھنے انکی باتیں سننے اور انکی نصیحتوں سے مستفید ہونے کا شوق و انگیزہ رہا۔

علم دین کی تحصیل کی بظرت بچپن ہی سے رغبت ہو گئی۔ خود لکھتے ہیں
 ”گھر میں والد مرحوم کا کتاب خانہ تھا جب شیخ حسینی ران کے والد کے خادم
 کتابوں کو دھوپ دیا کرتے تھے تو ہمارا کھیل یہی تھا کہ ایک ایک کو کھول
 کر ہر جگہ سے دیکھتے اور پڑھتے۔ کوئی جگہ سمجھ میں آتی کوئی نہ آتی بعض
 ورق گردانی کی برکت سے علم کا شوق دل میں پیدا ہو گیا لے

اداکل عمر میں مختصرات فن کی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولانا
اساتذہ سید احمد حسن عرشی سے حاصل کی پھر فرخ آباد۔ کانپور،
 اور دہلی میں تکمیل کی۔ جن اساتذہ علم سے انھوں نے سند لی ان کے
 نام یہ ہیں۔ شیخ حسین عرب بن محسن بن محمد الالفاری حدیدی۔ شیخ
 عبدالحق بن فضل اللہ نپوتنوی، مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی مہاجر مکہ
 منظمہ۔ شیخ یحییٰ بن محمد بن احمد بن حسن الحارمی، قاضی عدن، علامہ
 سید نعمان خیر الدین آلوسی زادہ مفتی بغداد۔ صدیق فاضل صدیق الدین
 خاں دہلوی دہلی کے قیام کے زمانے میں شیخ الکمل حضرت میاں صاحب
 سید نذیر حسین محدث دہلوی مرحوم کو بھی دیکھا تھا۔ مگر اتفاق صحبت
 کم ہوا لے

لے ابقا والنسب ۳، ۲۷۹ ابقا العلوم ۹۳۹، ۳۷۹ ابقا والنسب ۳۱۰ -

درد بھوپال پہلی مرتبہ

اکیس سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت حاصل کر کے دہلی سے اپنے وطن قنوج واپس آئے یہاں بمشکل چند ماہ ان کا قیام رہا کیونکہ سوائے ان کے کوئی دوسرا مربی خاندان موجود نہ تھا۔ متعلقین اور عزیزوں کی معیشت کا دار و مدار صرف ان کے قوت بازو پر تھا۔ وجہ کفایت بھی کوئی موجود نہ تھی جو زندگی کی ضرورتوں میں کافی ہوتی اس پریشان حالی میں تلاش معاش کا خیال پیدا ہوا۔ اپنے محلہ کے ایک آدمی کی زبانی ریاست بھوپال کے حالات سنکر اور خدا کا نام لے کر بھوپال کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ ۲۵ روز کے بعد وہاں پہنچے اور ایک کرایہ کے مکان میں اترے۔

اس وقت بھوپال کی ریاست نواب سکندر بیگم کے زیر حکومت تھی۔ ارکان حکومت میں کسی سے تعارف نہ تھا جسکی سلی و سفارش کی توقع ہو سکے۔ مجبوراً انھوں نے تائید ربانی پر اعتماد کر کے اپنے ہاتھ سے ایک مختصر عرضداشت، اپنے حال پر ملاں کی لکھ کر منشی جمال الدین خاں مدارالمہام نائب اول ریاست کی خدمت میں پیش کی۔ شیخ علی عباس چریا کوٹی اتفاق سے وہاں موجود تھے جو عالم بھی تھے اور کسی اعلیٰ عہدہ پر وہاں فائز تھے انھوں نے ہمدردانہ حمایت و تائید کی۔ خدا کا فضل شامل حال تھا۔ ریکیہ معظمہ نواب سکندر بیگم کی خدمت میں نواب صاحب باریاب ہوئے ریکیہ نے ان کی تقرری منظور فرمائی اور غرہ رمضان ۱۲۸۷ھ سے تین

روپے مشاہیر پر منشی گری: کی خدمت انکو تفویض ہوئی پھر حسن خدمت کے صلہ میں جلد ہی ترقی کر کے: "میر دبیری" کے منصب پر بڑھ چکے مشاہیرہ میں بھی اضافہ ہوا۔ اولاً چالیس روپے اور بعد میں پچاس روپے ہو گئے۔ مگر خدا کی شان اسی دوران میں شیخ علی عباس صاحب سے مسئلہ حقہ کشی پر بحث ہو گئی نواب صاحب اباحت کے اور شیخ صاحب موصوف تحریم کے قائل تھے۔ بحث نے اس قدر طول کھینچا کہ مناظرہ سے منقطع اور مناقشہ سے منافرت کی نوبت پہنچی۔ یہی منافرت ریاست کی خدمت نواب صاحب کی معزونی کا سبب ہوئی۔

وطن کی طرح واپسی ریاست بھوپال سے جب سلسلہ ملازمت منقطع ہو گیا تو لاہور محرم ۱۲۵۳ھ کو وطن روانہ ہو گئے۔ وطن پہنچ کر معاش کی بابت کوئی اطمینان کی صورت نہ پیدا ہوئی اسی پریشانی اور فکر میں تھے کہ ملک میں انگریزی حکومت کے خلاف ۱۲۵۴ھ کا مشہور ہنگامہ شروع ہو گیا۔ فرخ آباد اور قنوج بھی اسکی لپیٹ میں آئے۔ فرخ آباد کے ایک رئیس کی فوج سے انگریزی فوج کی جھڑپ ہو گئی۔ اس جنگ میں تمام رعایائے شہر کے مکانات مسمار اور زلاعتیں برباد ہو گئیں اور انکا تمام اثاثہ البیت سکھوں اور پنجابوں کی غارت گری کی نذر ہو گیا۔ دوسرے روز قتل عام کا غلغلہ زور شور سے بلند ہوا اور مارشل لا کے جانی ہوئی کی افواہیں فرخ آباد سے قنوج اور قنوج سے تمام نواح اور مقامات شہر میں پھیل گئیں ہر طرف ایک جھگڑ سی مچ گئی۔ سارا گھر لٹ گیا۔

افسوسناک شنگدستی نواب صاحب کے والد سید ملا حسن کے معتقدوں اور اراکین و مندوبان خاں نے جب یہ حالت دیکھی تو وہ نواب صاحب کو اور انکی بہنوں کو انکی والدہ کو اپنے ہمراہ بلگرام لے آئے یہاں ایک مکان کر رہے کالیکر یہ کاروان آفت رسیدہ اتارا گیا چند مہینے یہاں قیام رہا۔ درحقیقت یہ زمانہ ہندوستان کیلئے بڑا مصیبت خیز

اور اندوہناک زمانہ تھا۔ نواب صاحب کا یہ حال تھا کہ کئی مہینہ تک صرف ایک سپاہ موٹا کپڑا اور سوکھی ہوئی باسی روٹی پر وقت گزاری کرنا پڑی جب کپڑا پھٹ جاتا اپنے ہاتھ سے سی لیتے۔ جب سیلا ہو جاتا خود دریا پر جا کر دھولا تے۔ متعلقین کا بھی اس سے زیادہ بہتر حال نہ تھا۔ مگر باوجود اس تنگدستی اور فاقہ مستی کے نہ کسی سے کبھی قرض لیا اور نہ کسی کے سامنے دست سوال پھیلا یا۔ اپنی حالت بے مائگی پر صابر اور قانع رہے۔ اسی زمانے کا ایک روز کا ذکر ہے کہ وہ نہانے اور کپڑا دھونے کیلئے دریا پر گئے کپڑا اتار کر کنارے پر رکھے اور پانی میں اتر کر غسل کرنے لگے۔ اتفاق سے سکھ اور پنجابی پلٹن کے کچھ سپاہی ادھر سے گزرے۔ چونکہ نواب صاحب کا سرخ و سفید کھلارنگ تھا اس لئے سپاہیوں کو ان پر انگریز ہونے کا شبہہ گذرا۔ ان سپاہیوں نے لپک کر ان پر بندوق کا فیر کرنا چاہا۔ مگر خوش قسمتی سے ایک دیہاتی ادھر سے آ رہا تھا جو چند سال قبل فوج میں کاشتکاری کر چکا تھا اور وہاں کے دیہات کا مکھیا تھا، وہ روڑا اور ان سپاہیوں سے چلا کر کہا، ایسا غضب نہ کرنا یہ تو بڑے حضرت کے صاحبزادے ہیں میں ان کو برسوں سے خوب جانتا پہچانتا ہوں۔ جب سپاہیوں کو اس کے بیان اور گواہی پر پورا اطمینان ہو گیا تو وہاں سے چلے گئے نواب صاحب نے خدائے ارحم الراحمین کا شکر ادا کیا اور نہادھو کر گھر واپس آئے۔

بلگرام میں قیام کے زمانے میں بیکاری اور روز افزوں تہذیب و تہذیب سے تنگ آ کر نواب صاحب نے چاہا کہ کوئی ایسا مفید مشغلہ اختیار کیا جائے

۱۳۲

جیس وقت بھی اچھی طرح کٹے اور آشفہ خاطر کی کو ایک گونہ تسلی و تسفی بھی حاصل ہو۔ یہ خیال کر کے انھوں نے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دیا اور تھوٹے ہی دنوں میں یاد کر لیا جب ۱۰۵ کے ہنگامے کی شورش رقتہ رقتہ کم ہوئی تو سب عزیزوں کو ساتھ لیکر بلگرام سے قنوج چلے آئے۔ یہاں پہنچنا تھا کہ خانہ داری کی ضرورتوں نے خیر مقدم کیا چار دنا چار وطن کو چھوڑ کر تہیہ سفر کیا۔

ورود بھوپال خوش قسمتی سے اسی دوران میں بھوپال کی رئیسہ جناب سکندر بیگم صاحبہ نے ان کی طلبی کا فرمان (از خود) بھیجا
دوبارہ برسات کا موسم تھا زور شور سے بارش ہو رہی تھی اسی

حالت میں انکو جانب بھوپال روانہ ہونا پڑا۔ گیارہ روز میں ریاست ریلوں ہوتے ہوئے وہ جبل پور پہنچے بارش کی کمی کے انتظار میں ایک جگہ میں روز تک مہمان رہے مگر جب انھوں نے موسلا دھار پانی میں کسی قسم کی کمی نہ دیکھی تو مجبوراً وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ایک ندی پر سے گذر ہوا جو متواتر بارش کے سبب بالکل بھر گئی تھی۔ رات کا وقت تھا کراہیہ کی بجٹھ مع گھوڑے کے اسمیں جا پڑا طغیانی آب کی وجہ سے قریب تھا کہ وہ بھی غوطے کھا کر اسمیں ڈوب جائیں۔ اتفاق سے ندی کے وسط میں ایک سنگ گراں پڑا ہوا تھا اور اسکا ایک بڑا حصہ باہر نکلا ہوا تھا جو پانی کے بہاؤ اور موجوں کے تلاطم کا سد راہ تھا وہ اسکی سطح مرتفع پہ چڑھ کر بیٹھ رہے اور صبح تک اسی حالت میں اسپر بیٹھے رہے بارش کا سارا پانی ان کے سر پر سے گذر

۱۰ سیرت والا جہی حصہ دوم ۱۱

۱۳۳

رہا تھا جب صبح ہوئی اور آفتاب طلوع ہوا راہ گیر ادھر ادھر آنے جلنے لگے اسوقت ان کو اس مصیبت سے نجات ملی۔ کپڑے خشک کئے ، سواری ٹھہرائی اور سوار ہو کر آگے روانہ ہوئے ، اس طرح بہ ہزار تکلیف و دشواری چوتھی صفر ۱۲۷۵ھ کو وہ بھوپال پہنچے ۔

بھوپال پہنچ کر ریاست کے نائب اول مدارالمہام نشی جمال الدین خاں بہادر سے ملاقات ہوئی۔ اپنی تمام سرگذشت ان سے بیان کی۔ وہ مصائب سفر کا حال منکر بہت دلگیر ہوئے مگر بھوپال چلے آنے سے ان کو بہت خوشی ہوئی۔ پھر انھوں نے رئیس معظمہ سے جا کر سب حال عرض کیا اور انکی حاضری کی اطلاع دی مگر چونکہ پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔ اس درمیان میں معاندین اور حاسدین نے رخنہ اندازی کر کے حکم منسوخ کرا دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ریاست سے چلے جانے کا فرمان جاری ہو گیا آخر یہ شعر پڑھ کر ۹ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ کو بھوپال سے رخصت ہو گئے ۔

ماز بھوپال گذشتیم تو دل شاد نشیں

قفلے بردر مزن و خار بہ دیوار منہ

اثنائے سفر میں ان کا گذر ریاست ٹونک میں ہوا حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کے خویش سید

چند ماہ ٹونک میں

اسماعیل صاحب نے ان کو اپنا خاص مہمان بنایا۔ نواب وزیر الدولہ امیر الملک محمد وزیر خان کو اطلاع ہوئی تو والا جاہ سے ٹونک میں اقامت اختیار کرنے پر اصرار کیا اور ساتھ ہی پچاس روپیہ مشاہرہ بھی مقرر کر دیا

۱۳۴

اس تعلق نے ان کو ٹونک کے قیام پر مجبور کر دیا مگر وہاں کی طرز معاشرت کی ناشائستگی اور طریقہ بود و باش کی عام خرابی سے والا جاہ ہمیشہ متنفر اور دل برداشتہ رہا کرتے تھے۔ آخر آٹھ ماہ کی اقامت کے بعد ترک تعلق کا ارادہ کر کے چار مہینے کی رخصت کی درخواست دیدی۔ ابھی اس دستخط کی منظوری کا حکم صادر نہیں ہوا تھا کہ یکایک بھوپال سے ایک خط منشی جمال الدین خاں کا جو ریاست کے نائب اول تھے اور ایک فرمان طلبی نواب سکندر بیگم صاحبہ رئیسہ کا پہونچا اس خط اور فرمان کے مضمون سے ان سب شکوک و ادہام کا بھی پورا ذخیہ ہو گیا جو بعض اعتراض پر دانوں نے رئیسہ خترمہ کے دل میں پیدا کر دیئے تھے۔ دو چار روز کے بعد دوبارہ ٹونک سے درخواست رخصت بھی منظور ہو کر آگئی ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ کو والا جاہ ٹونک سے بھوپال کی طرف روانہ ہو گئے۔

۱۰ محرم ۱۲۶۰ھ (۱۸۵۹ء) کو بھوپال پہونچے، اور یکم

ورود بھوپال
تیسری مرتبہ

صفر کو ریاست کی تاریخ نگاری کی خدمت ان کو تفویض کی گئی نواب صاحب کے حق میں بھوپال اب وہ پہلا بھوپال نہ تھا۔ عروج نے قدم چومے اور اقبال خود کو نچھادر کرنے لگا۔ چنانچہ کم و بیش ڈیڑھ سال کے بعد نائب اول ریاست ہدار المہام منشی جمال الدین خاں نے اپنی چھوٹی صاحبزادی سے (جو بیوہ تھیں) نکاح کر دیا۔ نواب صاحب کی یہ پہلی شادی تھی۔ انھیں کے بطن سے میرت والا جاہی کے مصنف نواب علی حسن خاں پیدا ہوئے تھے۔ یہ بڑھاپے

۱۳۵

دیندار راسخ الاعتقاد موحده خاتون تھیں۔ نماز بڑے اہتمام کیساتھ اوقات
 معینہ پرا داکیا کرتی تھیں، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اچھی مہارت
 تھی۔ گلستاں کی سادہ عبارت، اسکے شگفتہ جملے، اور بوستاں کے ناصحانہ
 دلکش اشعار ان کی نوک زباں پر تھے۔ بات بات میں وہ بے تکلف
 گلستاں کی ضرب المثلیں بول جاتی تھیں، تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں یکم
 رمضان ۱۳۵۷ھ کو بھوپال میں انتقال کیا اور یہیں اپنے والد کے
 مزار کے پاس مدفون ہوئیں۔ نواب صاحب نے خود ہی ان کے جنازے
 کی نماز پڑھائی تھی۔

رئیسہ بھوپال نواب سکندر بیگم کے انتقال کے بعد ان کی صاحبزادی
 نواب شاہ جہاں بیگم سریرائے سلطنت ہوئیں، ان کا پہلا نکاح نواب
 نظیر الدولہ بخشی باقی محمد خاں بہادر کے ساتھ ہوا تھا جو نکاح کے بعد غالباً بارہ
 سال تک زندہ رہے۔ نواب نظیر الدولہ کی وفات کے پانچ مہینے کے
 بعد نواب شاہ جہاں بیگم مسند نشین ریاست ہوئی تھیں۔ عمان حکومت
 ہاتھ میں لے ہوئے جب تین سال گزر گئے تو رئیسہ عالیہ نواب شاہ جہاں
 بیگم نے محسوس کیا کہ نظم و نسق ملکی کی ذمہ داریاں زندہ ہر روز بڑھتی جا رہی ہیں
 ضرورت ہے کہ کسی قابل اعتماد، مدبر، منتظم، عالم و خطیب اذی وجاہ
 شریف، خدا پرست اور ماہر اصول سیاست و معدلت کو پیشتر امور
 مملکت اور اپنا ہمدم و محرم راز بنایا جائے، نگاہ انتخاب دالاجہ نواب
 صدیق حسن خاں پر پڑی جو ستترہ سال سے ریاست کی خدمت محنت

و جانفشانی اور دیانت و وفاداری کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ والا جاہ نے بھی منظور کیا۔ ۸ رشتوال شہزادہ مطابق شہزادہ کو نکاح ہو گیا۔ پچیس ہزار روپیہ مہر مقرر ہوا تھا جس کو بعد میں نواب صاحب نے یکمشت داکر دیا تھا اور چھ ہزار روپیہ سالانہ مصارف نان و نفقہ کے طور پر برابر دیا کرتے تھے اس رشتہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین و دنیا کے اعلیٰ مراتب پر فائز فرمایا۔ علم دین اور علمائے دین کو عروج اور سر بلندی حاصل ہوئی عرصہ تک بھوپال کتاب و سنت کے حاملین کا مرجع بنا رہا۔ مختلف علوم و فنون پر خود والا جاہ نے بہت سی کتابیں لکھیں اور بہت سی دینی کتابیں جو بیش قیمت ہونے کے ساتھ نایاب ہو چکی تھیں، عرب و عجم سے گراں بہا قیمتوں پر حاصل کر کے، مصر، بیروت اور ہندوستان کے مختلف مطابع میں لاکھوں روپیہ خرچ کر کے چھپوائیں اور پھر تحفۂ قدردانوں کو نذر کر دیں۔ فتح الباری کا نفی نسخہ چھ سو روپیہ میں خرید لیا اور ہزاروں کی لاگت سے چھپوا کر مفت تقسیم کیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے ”نواب والا جاہ امیر الملک سید محمد صدیق حسن خاں بہادر“ کا خطاب ملا تھا۔

تیرہ چودہ سال تک یہ خطاب و منصب حاصل رہا پھر حاسدین و بغضین کی ریشہ دوانیوں اور مخالفانہ کوششوں کی وجہ سے نوابی کا خطاب انگریزوں نے چھین لیا۔ جن شکایتوں سے انگریز افسروں کے کان بھرے ان میں بڑی شکایت یہ تھی کہ نواب صدیق حسن خاں انگریزی حکومت

لے ابقار المتن ص ۱۷

کے خلاف جہاد کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور مذہب و ہابیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ریکمہ شاہ جہاں بیگم ان الزامات کے دفعیہ اور خطاب کی واپسی کے لیے برابر کوشش کرتی رہیں یہاں تک کہ پانچ برس کے بعد انکی وصیت کی منظوری اور دوبارہ خطاب کی واپسی کی اطلاع گورنمنٹ انگلینڈ کی طرف سے اسوقت آئی جبکہ نواب صاحب اس دنیا سے رحلت فرما چکے تھے۔ نواب صاحب کی وفات ۲۹ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۰ فروری ۱۹۱۷ء کو بھوپال میں ہوئی اور وہیں دفن کئے گئے۔ غفر اللہ لہ درجہ۔

مرثیہ شعراء ہندوستان اور مخدوران ریاست نے دالاجاہ کی وفات کے بعد بکثرت مرثیے اور قطعات تاریخ لکھے ان میں سے مولوی جمیل احمد صاحب سہوانی مرحوم کے مرثیے سے چند اشعار ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ نواب صاحب کی دینی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

اب کون یوں کرے کاشاعت حدیث کی ہے کسے دلیں اتنی محبت حدیث کی
 لطیف اسکا کس زبان شکرا ٹھائی گے قرآن کا یہ مزل ہے یہ لذت حدیث کی
 لغو و فضا سے انکی زبان آشنا نہ تھی کہتے جو کوئی بات تو آیت حدیث کی
 بے مایہ حدیث ہوئے کیسے مایہ دار کیسی لٹی دھڑلے سے دولت حدیث کی
 دن رات صبح و شام یہی مشغلہ رہا حق تو یہ ہے کہ خوب کی خدمت حدیث کی
 کیسا محنت آہ نہ ملنے سے اٹھ گیا حالت پر آج قابل رقت حدیث کی
 اب قدر دانا کہاں کوئی اہل حدیث کا سمجھے ہوئے تھے کچھ وہی دقت حدیث کی
 انوس کا رخا نہ ملت بگڑ گیا ہے شگفتہ باغ شریعت اجر گیا

(سیرت دالاجاہ ص ۳۷)

اس مرتبے کے آخر میں دالا جاہ مرحوم کیلئے جو دعائیں کی گئی ہیں آئیے دعا ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں۔

اللہ ان کو روضہ رضواں عطا کرے	حور و تصور و نعمت الوان عطا کرے
جو چاہیں وہ حصول ہو جو مانگیں وصول	اپنی طرف سے اور انہیں نیز داں عطا کرے
مختیار و ترجیحے ہاں سیر کے لئے	خدا رحمت کے واسطے انہیں غلام عطا کرے
پینے کو آب کوثر و تسنیم و سببیل	کھانے کو پیوہ پائے فرا داں عطا کرے
ملک کبیر و فوز عظیم و سرور و عیش	اللہ ان کو یاں کے عوض داں عطا کرے
اپنے جال پاک کی رویت کرے نصیب	نقد و فور رحمت رضواں عطا کرے
ہوکان سے سنا ہو نہ دیکھا ہو آنکھ سے	جنت میں رہنا کا کاماں عطا کرے

سیرت والا جاہی حصہ سوم

نواب ضاکر مسک آج اہلحدیث ہی نہیں، احفان میں بھی حضرت نواب صاحب قدس سرہ کا مسلک اہلحدیث ہوتا اتنا مشہور اور معروف ہے کہ شاید بہتوں کو اس پر تعجب ہو گا کہ اس عنوان پر گفتگو کرنے کی ہم نے ضرورت کیوں محسوس کی؟ قصہ یہ ہے کہ نواب صاحب کے صاحبزادے نواب علی حسن خاں مرحوم نے تاثر صدیقی یہودیوم یہ سیرت والا جاہی امین نواب صاحب کے مسلک کی بابت بعض ایسی بدنی لکھ دی ہیں جو اب تک تو قابل التفات نہیں سمجھی گئی تھیں لیکن آج کل بعض لوگوں نے ان کو اچھا لایا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ دلائل اور دقتات کی روشنی میں اس مسئلہ کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔

نواب صاحب کے مسلک کے متعلق مصنف ”
سیرت والا جاہی کا بیان“ سیرت والا جاہی کا ایک بیان تو یہ ہے : لکھتے ہیں :-
 ”سنی خالص محمدی فتح احمد جدت متبع کتاب و سنت حنفی مذہب نقشبندی مشرب تھے اور
 ہمیشہ طریقہ اسلاف پر مذہب حنفی کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے مگر عملاً و اعتقاداً اتباع
 سنت کو مقدم رکھتے تھے چنانچہ خود لکھتے ہیں : ”باقفائے نیا کاں بزرگ و دانشمندان
 سترگ و رظاہر انتساب بروش امام ابو حنیفہ معروف است لیکن ہمارہ گفتار و کردار
 را باتباع سنت آراکش دارو“

”سیرت والا جاہی حصہ چہارم ص ۱“

ان کا دوسرا بیان یہ ہے لکھتے ہیں :-
 ”والا جاہ مرحوم نماز پنجگنا : حنفی طریقہ پر پڑھتے تھے البتہ ان کو فاتحہ خلف
 الامام ادا دل وقت کا خاص اہتمام مد نظر رہتا تھا“ (کتاب مذکور ص ۳۳)
 نواب صاحب کی تالیفات، ان کے مضامین اور تحریروں کا جہاں تک
 ہم نے مطالعہ کیا ہے انکی بنیاد پرہ اور اس زمانے میں جبکہ نواب صاحب
 کے رفقاء اور مشاہدین ایک ایک کمرے سب اللہ کو پیارے ہو چکے
 ہیں، ان چیزوں کے سوا کوئی دوسری چیز اس بحث کی بنیاد بن سکتی
 ہم پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ ”سیرت والا جاہی“ کے
 یہ دونوں بیان غلط اور ناقابل اعتبار ہیں۔ حتیٰ کہ فارسی کی وہ عبارت
 بھی انکے مدعا کی مثبت نہیں ہے جس کو انھوں نے اس موقع پر اپنی تائید
 میں پیش کیا ہے۔ ہم ان دونوں بیانیوں پر علی الترتیب الگ الگ گفتگو

کہنا چاہتے ہیں۔

سیرت والا جاہلی کے دعویٰ اور دلیل میں مطابقت نہیں

مصنف یہ سیرت والا جاہلی نے دعویٰ یہ کیا ہے کہ نواب صاحب ہمیشہ مذہب حنفی کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے۔ منسوب کرنے کے صاف معنی یہ ہیں کہ نواب صاحب اپنے متعلق خود یہ کہا کرتے تھے یا لکھا کرتے تھے کہ میں حنفی ہوں اور ایسا وہ ہمیشہ کرتے تھے بالفاظ دیگر سیرت والا جاہلی نے حنفی مذہب کی طرف سے انتساب کو خود نواب صاحب کا فعل بتایا ہے۔ لیکن اس کے ثبوت اور تائید میں فارسی کی جو عبارت انھوں نے نقل کی ہے وہ ہرگز اس دعویٰ کے مطابق نہیں ہے۔ اس میں نواب صاحب نے مذہب حنفی کی طرف انتساب کو اپنا فعل نہیں قرار دیا ہے۔ اور نہ یہ تسلیم کیا ہے کہ میں حنفی ہوں۔ ہاں یہ البتہ کہا ہے کہ مذہب امام ابو حنیفہ کی طرف انتساب معروف ہے یعنی انتساب کی نسبت انھوں نے عرف کی طرف کی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگوں کا عمل ہے۔ خود ان کا اپنا عمل یہ نہیں ہے۔ اس لیے اس عبارت سے یہ دعویٰ تو ثابت نہیں ہوتا کہ نواب صاحب اپنے کو مذہب حنفی کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اور جب یہ ثابت نہ ہوا تو یہ بھی ثابت نہ ہو گا کہ وہ "حنفی مذہب" تھے رہا عرف کا معاملہ تو اس کے اعتبار سے یہ عبارت دو معنوں کا احتمال رکھتی ہے ایک یہ کہ لوگ اپنے کو حنفی مذہب کی طرف منسوب کرتے ہیں

اور ہر چند یہ انتساب لوگوں میں معروف و مشہور ہے۔ لیکن میں نے اس شہرت کی پیرزی نہیں کی۔ میں نے اتباع سنت کو اختیار کیا ہے دوسرا احتمال یہ ہے کہ نواب صاحب نے اپنے ہی متعلق یہ بات کہی ہو کہ بظاہر ان کا انتساب حنفی مذہب کی طرف معروف ہے مگر پھر ساتھ ہی انہوں نے حوت استدراک (لیکن) سے اس توہم کو بھی دفع کیا ہے۔ کہ اس ظاہری انتساب کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ میں امام ابو حنیفہ کا مقدر اور انکے اقوال کا پابند ہوں میں نے اپنے قول و عمل کو تقلید کے عیب سے بچا کر، اتباع سنت کی زینت سے آراستہ کیا ہے۔

اس عبارت کا ایک بڑا اہم لفظ، مصنف و سیرت والا جاہی ہے۔ نے نقل نہیں کیا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پوری عبارت قارئین کے سامنے رکھی جائے تاکہ نواب صاحب کا صحیح نشان کی سمجھ میں آجائے۔ نواب صاحب لکھتے ہیں۔

”امروز کہ چھل و ہشت مرحلہ از عمر گرامی

طے شدہ با آنکہ استخوان در تن ناتوان

کہنہ شد، و سحے سر بسفیدی چون شعلہ

تاباں گردید، آثار گرمی درونی و سوز باطن بچیاں افزائش دارد و بسا نکا

دل افروز بر فراز ظہوری دارد، در آئین مالک ش و شافعی و ابو حنیفہ و ابن حنبل

گو ناگوں دریافت اصولاً و فروغاً ہم آمد۔ و بقدر ذی بخت بیدار، و نکالوی

طالع سازگار بر پانہ اجتہاد و مجتہدان و قوف حاصل شد، ہر چند با تغفلے

عبارت کا پورا متن اور اس کا صحیح مطلب

نیاکان بزرگ و دانشمندان ستمگر و ظاہر انتساب بروش ابو حنیفہ رحمہ
معروف است لکن ہمارے گفتار و کردار سادات تابع سنت آرائش ماروہ
(المنعم البار و ص ۳۱)

ترجمہ: آج جبکہ میں اپنی عمر عزیز کی ۸۸ منفریں طے کر چکا ہوں، بدن کی
ہڈیاں بھی پرانی ہوئی ہیں۔ سر کے بالوں میں سفیدی چمک رہی ہے۔ سوز
باطن بھی ترقی پر ہے۔ امام مالک و امام شافعی و امام ابو حنیفہ و امام ابن
حنبل رحمہم اللہ ہر ایک کی فقہ و آئین کو اصولاً و فروعاً ہر طرح سے جان چکا
ہوں۔ اور خوش قسمتی سے مجتہدوں کے پایۂ اجتہاد سے بھی مافضیت حاصل
کر چکا ہوں ایسی حالت میں بزرگوں کی اتباع اور دانشمندی کی پیروی
میں ظاہری طور پر امام ابو حنیفہ کے طریقے کی طرف انتساب رچا ہے، جتنا
بھی مشہور ہو۔ لیکن اس انتساب کے معنی یہ نہیں کہ میں ان کا مقلد ہوں
میں اپنی گفتار و کردار کو تقلید کے عیب سے بچا کر، اتباع سنت کی زینت اسے آراستہ کرتا
ہوں۔ ————— پوری عبارت کے معنی اور مفہوم پر غور کیجئے! اقواب صاحب نے سب
سے پہلے اپنی عمر کی مدت بیان کی ہے جس سے انکا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر کی
اس منزل میں پہنچ گئے ہیں جو طبعی طور پر انسان کے نیم و دانش کے کمال کی منزل مانی جاتی ہے۔
اس کے بعد انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا ذکر کیا ہے جو علم دین کے متعلق انکو عطا
کر لیا تھا انھوں نے بتایا ہے کہ چاروں اماموں کے فقہی مسائل اور ان کے
استخراج و استنباط کے اصول و قواعد، آئین اور ضابطے
سب پر ان کو عبور حاصل ہے۔ وہ خوب

۳۴۱

نتے ہیں کہ کون ختہد کس درجے کا نقیہ ہے۔ کس کا اجتہاد کتاب و سنت کے موافق ہے اور کس کا اس کے خلاف۔ اپنے علم و فہم کے اس رسوم اور کمال کا اظہار کر لینے کے بعد تب انھوں نے لکھا ہے۔ یہ چند باقتضائے نیاکان بزرگ و دانشمندان سترگ در ظاہر انتساب یعنی جب اللہ تعالیٰ نے عقل و فہم کے کمال کی منزل تک پہنچا دیا ہے اور فقہ و اصول فقہ کا علم بھی وافر عطا فرمایا ہے۔ ایسا علم جو چاروں اماموں کے اہل و فروع پر گونا گوں طریقے سے حاوی ہے۔ ختہدوں کے پایہ اجتہاد و اہل کے اقوال و امار کے خطا و صواب کے معرفت کا مسلک بھی حاصل ہو تو ایسی صورت میں کسی کا مقلد بن کر، ہر مسئلہ میں اسکی رائے کو بلا دلیل مان لینا اور خود اس کا پابند بنا کر رکھنا، یہ میل کام نہیں ہے۔ اس لئے ہر چند اپنے بزرگوں کی پیروی میں لوگوں کا انتساب ظاہر میں رسمی طور پر حنفی مذہب کی طرف معروف ہو لیکن میرے نزدیک اس شہرت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں نے اتباع سنت کی راہ اختیار کی ہو یا نواب صاحب کا مقصد یہ کہ ہر چند ظاہر میں یہ انتساب حنفی مذہب کی طعن و محذور ہو لیکن اس ظاہری انتساب کا مطلب مقلد ہونا نہیں ہے کیونکہ یہ تو مجھ جیسے شخص کیلئے ایک عیب کی بات ہو۔ میں نے اپنے قول و عمل اور گفتار و کردار کو حقیقت و بصیرت کی روشنی میں سنت کی پیروی سے آراستہ کیا ہو اہل علم سمجھ سکتے ہیں کہ نواب صاحب کی محولہ بالا عبارت میں لفظ "ہر چند" کو اپنے سیاق و سباق کے ساتھ کتنا گہرا تعلق ہے اس کے بعد وہ خود فیصلہ کریں کہ کیا ہماری یہ شکایت بے جا ہے کہ مصنف "سیرت والہابی"

نے اس عبارت کا ایک بڑا اہم لفظ نقل نہیں کیا ہے ؟
 خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس عبارت سے نواب صاحب کا : حنفی و اربہ سنی
 مقلد امام ابو حنیفہ ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے برخلاف اسی عبارت
 سے ان کا محقق (غیر مقلد) متبع سنت ہونا واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے
 اس لئے کہ اگر ”انتساب معروف“ سے اتباع سنت کا حق ادا ہو جاتا تھا
 تو پھر اس استدراک کے ذریعہ کس توہم کو دفع کیا گیا ہے کہ لیکن
 ہمارے گفتار و کردار یا اتباع سنت آرائش دارد؟ نیز اگر وہ مقلد ہی
 تھے تو اس اتہام کے ساتھ اپنے علمی کمال اور جامعیت کے بیان کرنے کی
 کیا ضرورت تھی ؟

نواب صاحب کی بعض دوسری عبارتوں سے اسکی تائید

”انتساب معروف“ کا تعلق نواب صاحب
 ہی کی ذات سے مان کر عبارت زیر
 بحث کا جو مطلب ہم نے بیان کیا ہے
 اسکی تائید نواب صاحب کی دوسری کتابوں سے بھی ہوتی ہے۔ منجملہ ان کے
 ایک کتاب ”ابقار المنن بارتقا الرحمن“ ہے جو نواب صاحب کی وفات
 سے ڈھائی تین سال پہلے کی تالیف ہے۔ اسی کتاب کے حوالے سے چند
 عبارتیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں نواب صاحب لکھتے ہیں۔

میں نے ابتداً طلب علم میں کتب فقہ حنفی کو بھی موافق رواج اس

نواب صاحب کی وفات شدہ میں ہوئی۔ اور ابقار المنن انھوں نے ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ میں لکھی جیسا کہ
 کتاب کے آخر میں مذکور ہے۔

ملک کے پڑھا تھا۔ پھر شعور بڑھا تو مذاہب ائمہ ثلاثہ پر بھی عبور کیا اور فروع میں اولہ مذاہب اربعہ پر اطلاع حاصل ہوئی۔ اور اچھی طرح ہوئی۔ ہر مذہب کی دلیل کو میزان تحقیق میں بقاعدہ علماء جامعین وزن کیا جس مسئلہ کو دلیلاً رائج پایا اسی کا میں قائل ہوا۔

بعد عبور کے مذاہب اربعہ پر میں نے اتباع دلیل کا اختیار کیا ہے۔ جو مذہب موافق دلیل قوی و صحیح کے ہوتا ہے وہی میرا مختار ہے خواہ مذہب حنفی ہو یا شافعی یا مالکی یا حنبلی۔ میں کسی مذہب کا ترک در و براہ تعصب کے نہیں کرتا ہوں، نہ کسی مذہب کا اخذ براہ ہوائے نفس کے۔ مثلاً مسئلہ آب میں مذہب مالک اقویٰ المذاہب ہے اور مسئلہ صیغ تشہید میں مذہب امام ابو حنیفہ اصح الاقوال ہے اور مسئلہ صفات میں مذہب امام احمد اقویٰ الذہاب ہے۔ دلی ہذا القیاس میری کل تالیف میں اسی قاعدہ کی رعایت و حمایت ہے اس اعتبار سے اگر میں آپ کو حنفی کہوں یا شافعی یا مالکی یا حنبلی کہوں تو کچھ کذب لازم نہیں آتا ہے۔ اور اگر سنی محض کہوں تو بالکل سچ ہے اور اگر اس اعتبار سے کہ میں محب اور خادم ہوں ہر امام مجتہد کا۔ ان ائمہ اربعہ وغیرہم سے آپکو طوط کسی امام کے مضان کر دوں تو بھی یہ اصناف درست لگے۔

لے دیکھئے مقلد ہونے کی حیثیت سے تو نواب صاحب کی امام کی طرف اپنے کو منسوب کرنا درست نہیں سمجھتے البتہ دوسرے اعتبارات سے اسکو صحیح سمجھتے ہیں لیکن اس میں بھی حنفی مذہب کی خصوصیت نہیں ہے چاروں اماموں اور چاروں مذہبوں کو وہ ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں ۱۲

۱۴۶

چنانچہ اکثر اضافات ائمہ علم کی طرف سلف امت کے اسی قبیل سے تھے۔ (ص ۳۱)
 • مشکل تو یہ ہے کہ میں تو دلیل کو مذہب کہتا ہوں نہ تقلید کو، اور لوگ
 اعراض مجھ پر از روئے تقلید کرتے ہیں (ص ۲۶)

• ائمہ سلف پر طعن مخالف سنت کی کرنا انصاف کا خون بہانا ہے یاں
 جو مقلدان کے بعد وضوح دلیل کتاب و سنت کے تقلید رائے بحث پر جامد
 ہیں انکو خاطر بھیجتا ہوں (ص ۲۷)

مجھے یہ بات معلوم ہے کہ سوائد و رسول کے کسی کا اتباع کسی شخص پر امت
 اسلام میں سے واجب نہیں ہے اور اسی وجہ سے سارے سلف تقلید رجال
 سے منع کرتے آئے ہیں (ص ۱۱)

• رجاء بالغیب مجھ پر یہ طوفان باندھا گیا کہ میں خدا نخواستہ حق میں ائمہ
 اربعہ کے عموماً اور حق میں امام اعظم رضی اللہ عنہ کے خصوصاً بے ادب نامہذب
 ہوں۔ حالانکہ یہ نرا افتراء ہے اسکی تکذیب کیلئے میرا رسالہ جالب المنفعۃ
 نام بس کرتا ہے اگر میں ایسا ہوتا تو اپنی کتب فقہ میں ہرگز کسی مسئلہ حنفی کی
 ترجیح نہ کرتا۔۔۔۔۔ بے شبہ میں کسی کی رائے مجرد اجتہاد کا مقلد نہیں
 ہوں جب تک کہ اسکو موافق دلیل و سنت کے نہ کر لوں خواہ وہ علم ظاہر سے
 علاقہ رکھتا ہو یا علم باطن سے۔۔۔ (ص ۸۹)

لے کچھ میں نہیں آتا کہ اگر سیرت والا جاہی کا یہ بیان صحیح ہے کہ نواب صاحب حنفی مذہب تھے اور
 ہمیشہ مذہب حنفی کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے تو پھر ان پر یہ طوفان کیسے باندھا گیا کہ وہ امام ابوحنیفہ کے
 حق میں جفا و بدنامی کا مرتکب ہیں ۱۲

● پھر مجھ سا شخص جو بعد حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عالم اور امام امت کی تقلید کا وجوہاً قائل نہیں ہے وہ صاحب کتاب التوحید شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی رحمہ اللہ کی تقلید کیوں کرنے لگا (ص ۱۲)

● ایک محنت مجھ پر یہ آئی کہ اہل تقلید نے مجھ پر تہمت تقلید امام محمد بن علی شوکانیؒ کی لگائی ملے گویا میں اپنے دین میں انکا مقلد ہوں یہ تہمت نہایت طرفگی سے قابل تماشا ہے اسلئے کہ جب طرح ائمہ اربعہ مجتہدین وغیرہ سلف صالحین نے تقلید مذاہب سے منع کیا ہے اسی طرح یا اس سے زیادہ رد تقلید میں شوکانیؒ نے میدان مباحثہ میں جولانی فرمائی ہے..... پھر میرا کسی اور کا اس نہیں کے باوجود ان کا مقلد بننا کیا معنی رکھتا ہے؟ میں نے اپنی تالیف میں کئی جگہ ان کا خلاف کیا ہے اسلئے کہ انکی تقریر پر دلیل واضح کی موافقت ظاہر نہیں ہوئی (ص ۱۱)

بعض لوگوں کو یہ گمان ہے کہ میں اولیاء اللہ تعالیٰ کا معتقد نہیں ہوں حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ ولایت خدا کا وجود کتاب و سنت دونوں سے ثابت ہے۔ اور کرامات کے وقوع پر بھی قرآن و حدیث و دلیل ہیں۔ پھر انکا انکار یعنی چہ..... ہاں اتنی بات ہے کہ میں اس علم میں بھی بکتاب و سنت ہوں اس حال و قال کا قائل نہیں ہوں جو نص کتاب و دلیل

لے لے : اگر واقعی نواب صاحب غنی المذہب تھے اور ہمیشہ غنی مذہب کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے تو پھر ان دونوں الزاموں کی گنجائش کہاں سے مل آئی کہ وہ شوکانی کے مقلد ہیں۔ یا یہ کہ وہ اولیاء اللہ کے معتقد نہیں ہیں؟ اس قسم کے الزام تو اہلجدیوں کو لگائے جاتے ہیں نہ کہ کسی غنی مذہب مقلد کو۔

سنت کے برخلاف ہے۔ اور نہ ان رسوم مشائخ کو جائز جانتا ہوں جو کہی
ربان پر مبنی نہیں ہیں کیونکہ بطرح تقلید فروع احکام میں بے اصل ہے۔
اسی طرح تقلید مکشوفات و رسوم میں بے سند ہے۔ صوفیہ صافیہ میں کوئی
شخص مقلد کسی مذہب خاص کا نہیں تھا اسی جگہ سے کہا ہے الصوفی سلا
مذہب لہذا احوال العلوم و فتوحات ملکہ وغیرہا کو بچھو کہ کس قدر تحذیر اختیار
تقلید سے اور کس قدر تحریفی اثرات اتباع پر کی ہے (صفحہ ۱۲۵)

یہ اقتباسات پوری وضاحت کیساتھ اس بیان کی تردید کر رہے ہیں
کہ نواب صاحب حنفی مذہب تھے اور ہمیشہ مذہب حنفی کی طرف اپنے کو منسوب
کرتے تھے "لہذا المغنم البارد" کی عبارت سے مصنف "سیرت والا جاہلی"
نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ بھی غلط ہے اور اس عبارت کا صحیح مطلب وہی ہے
جو ہم نے بتایا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اقتباس اور پڑھئے جس میں نواب صاحب نے
الحدیث مسلک کی صحیح ترجمانی کی ہے اور تقلید کی پرزور مذمت
کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"تقلید اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی دوسرے شخص کی بات کو کسی شئی کی
حالت یا حرمت میں بلا دلیل و نص شارع کے قبول کر لے، سو یہ بات ظاہر
ہے کہ سب مسلمان حضرت کی امت ہیں اور حالت و حرمت کسی شئی کی بغیر حضرت
کے بتائے معلوم نہیں ہو سکتی تو اس باب میں اتباع حضرت کا چاہئے نہ اور
کسی شخص کا۔ ورنہ اس شخص کو بغیر ماننا پڑیگا۔ اور اگر کسی مجتہد نے کسی شئی

پر بسبب نہ ملنے اور معلوم نہ ہونے کسی دلیل کے ایسا حکم اپنے اجتہاد اور
 رائے و قیاس سے لگا دیا ہے اور بعد اس کے کوئی اور دلیل کسی دوسرے
 شخص پر قرآن یا حدیث سے واضح ہو گئی تو وہ مجتہد معذور ہے بلکہ اس کو
 ایک اجر جہدوسی کا ملیگا مگر یہ شخص جس کو آیت قرآن یا سنت صحیحہ پہنچ گئی
 ہرگز معذور نہ ہوگا۔ بلکہ اگر وہ دیدہ و دانستہ خلاف نص کے کریگا تو مخالف
 خدا یا رسول ٹھہرے گا۔ اس بات کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کچھ مشکل بات نہیں ہے
 اور ہم نے ساری کتب فقہ مذاہب اربعہ دیکھی کسی امام مجتہد سے یہ بات ماثور
 نہیں پائی کہ ہمارے اجتہاد کے آگے تم قرآن و حدیث کو چھوڑ دینا بلکہ چاروں
 اماموں نے اپنی تقلید اور غیر کی تقلید سے منع کیا ہے ان کے اقوال خود کتابوں
 میں ان کے مقلدین کی منقول ہیں۔

اس صورت میں مقلد صحیح صادق ان کا وہی مسلمان ہے جو اس قول
 حق میں انکی پیروی کرتا ہے نہ وہ مسلمان جو خلاف انکی نہی کے عمل کرتا ہے
 کیونکہ وہ تو ان کا مخالف ہو نہ مقلد۔

یہ نواب صاحب کی صرت ایک کتاب کے اقتباسات ہیں اگر ان کی
 دوسری کتابوں سے اسی قسم کی عبارتیں ہم نقل کریں تو مضمون بہت طویل
 ہو جائے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ "سیرت والا جاہلی" کے بیان کی تردید کیلئے
 اتنے حوالے ہی کافی ہیں۔

اسی طرح نواب صاحب مرحوم کی کتابوں کی روشنی میں ہم اس بیان کو بھی ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں کہ "والا جاہ مرحوم نماز پنجگانہ حنفی سیرت والا جاہی کے دوسرے بیان پر تنقید

مکتبہ پر پڑھتے "۔ "سیرت والا جاہی" کے حصہ چہارم کے آخر میں خود اسی کے مصنف نے نواب صاحب کی مؤلف کتابوں کی ایک طویل اور مفصل فہرست پیش کی ہے۔ یہ فہرست انہوں نے کتابوں کے ناموں کے پہلے حرف کو ملحوظ رکھ کر حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب کی ہے اور اللہ کی شان ہے کہ "حرف الالف" سے لیکر "حرف الیاء المشاء" تک ہر حرف کے ذیل میں نواب صاحب کی تالیفات موجود ہیں۔ چنانچہ "حرف التاء" کے ماتحت "تعلیم الصلوٰۃ" کو بھی انہوں نے نواب صاحب کی تالیفات میں شمار کیا ہے۔ جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ تقریباً بیس صفحات کا یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں طہارت اور نماز کے کچھ مسائل بالاختصار مذکور ہیں۔

مصنف "سیرت والا جاہی" کے مذکورہ بالا بیان کو پیش نظر رکھ کر جب ہم نے اس رسالہ کا مطالعہ کیا تو ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اس باب میں احناف اور اہلحدیث کے مابین جن جن مسائل میں اختلاف مشہور ہے ان سب میں نواب صاحب نے اہلحدیث ہی کے مسلک کو اختیار کیا ہے کسی ایک مسئلہ میں بھی انہوں نے حنفی مذہب کی موافقت نہیں کی ہے

لے اس رسالہ کے آخری صفحہ پر درج ہے کہ ہر جادوی الاخریٰ ۱۳۸۷ھ کو چند گفتگوں میں لکھا گیا ۱۲

مثلاً نماز کی ترکیب : کا عنوان قائم کر کے وہ لکھتے ہیں : نماز بے نیت کے نہیں ہوتی ہے نماز کے سبب رکن فرضی ہیں مگر نیچ کا تشہد و جلسہ ستراحت اور نماز کے ذکر میں کوئی ذکر واجب نہیں ہے مگر تکبیر تحریمہ اور پڑھنا فاتحہ کا ہر رکعت میں اگرچہ مقتدی ہو۔ اور پچھلا تشہد اور سلام پھر نا۔ یہ چار ذکر فرض ہیں۔

اس کے سوا جو کچھ ہے وہ سنت ہے جیسے ہاتھ اٹھانا چار جگہ پر، وقت تکبیر کہنے کے، اور وقت رکوع کرنے کے، اور سر اٹھانے کے رکوع سے۔ اور وقت کھڑے ہونے کے واسطے رکعت سوم کے اور جیسے ہاتھ باندھنا وقت قیام کے، اور جیسے دعائے توجہ پڑھنا بعد تکبیر تحریمہ کے، سب سے زیادہ صحیح و متفق علیہ یہ دعا ہے۔ اللھم ربنا عبد یحییٰ و بین خطایاں... اور جیسے تَعُوذ کرنا.... پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم کہے... پھر فاتحہ پڑھے اور آمین جہر سے کہے یہ آمین امام و مقتدی دونوں کو کہنا چاہیے روایت جہر کی اصح و اقویٰ ہے روایت نغض سے۔ اور جیسے پڑھنا کسی سورہ کا ہمراہ فاتحہ کے... اور جیسے تشہد اوسط... اور جیسے وہ ذکر جو ہر رکن میں آئے ہیں مثل تکبیرات رکوع و سجود و قیام و قعود کے پھر اجد تشہد اخیر کے جوئی دعا چاہیے ماثور یا غیر ماثور مانگے (صفحہ ۱۵۱)

اسکے بعد نواب صاحب نے "نامہ" کے ذیل میں ان حدیثوں کا ترجمہ کیا ہے جنہیں تعدیل ارکان کی تسلیم اور تورک کے ساتھ نماز نا کرنے کا ذکر ہے۔ پھر فرماتے ہیں :-

"اب چاہیے کہ کوئی نمازی کیفیت نماز میں اس ہیئت سے تجاوز نہ کرے

ورنہ اسکی نماز میں خلل ہوگا۔ ۱۵۲

ان تصریحات کی موجودگی میں کسی کا یہ بیان کس طرح قابل اعتبار سمجھا جائے کہ ”والا جاہ نماز پنجگانہ حنفی طریقہ پر پڑھتے تھے؟“ مسک الختام وغیرہ میں تو نواب صاحب نے ان مسائل کے بارے میں اہل حدیث کے موقف و سلف کی تائید اس طرح کی ہے کہ اسکے خلاف حنفیہ کے شبہات و دلائل کے جوابات بھی دیئے ہیں۔ یہی وہ حقائق ہیں جنکی بنا پر نواب صاحب اہل حدیث مشہور تھے جیسا کہ انھوں نے خود اس کا اقرار کیا ہے

لکھتے ہیں:-

نواب صاحب اقرار خود اہل حدیث مشہور تھے | ایک محنت خیز یہ آئی کہ ہنگام انقلاب سنکراہل عزائم نے اگر گھبرنا شروع کیا،

عامہ خلق کے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ اصرار و رد سار معتقد اعمال کے ہوتے ہیں حالانکہ میں اول امیر نہیں ہوں دوسرے علم سے فقیر بھی نہیں ہوں کہ دام تیر ویر اہل شرک و بدعت میں گرفتار ہو جاؤں۔ میں تو اپنے اعتقاد میں کسی شخص کا معتقد نہیں ہوں خصوصاً ان فقراء و مشائخ کا جو اس زمانہ جہل میں دوکانداری کرتے پھرتے ہیں۔ مجھکو انکی حرکات بے برکات پر نہایت تعجب آتا ہے کہ باوجود اس جہل و خبیث و شرک و بدعت کے یہ کسی موجد کو بچانے چلے، ان حقار نے اتنا بھی نہ جانا کہ میں تو اہل حدیث مشہور ہوں اور تقویۃ الایمان و رسائل توحید کا پابند ہوں۔ میرے سامنے کسی رمال جفال بنجم عزیمت خواں کی اتنی بھی قدر نہیں ہے۔ جتنی کہ دواب کی قدر نظر انسان

۱۵۳

میں ہوتی ہے کیونکہ موحد ہر بلا اور خار مصیبت و عافیت میں اللہ ہی کو پکارتا ہے ————— (اقبال المن ص ۱۳۶)

نواب صاحب مرحوم کی عبارتوں کے یہ اقتباسات صاف اور صریح لفظوں میں ان باتوں کی ترویج و تکرار ہے کہ وہ حنفی تھے اور ہمیشہ حنفی مذہب کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے اور حنفی مذہب کے طریقہ پر نماز پڑھتے تھے ۛ

قَدْ أَصْحَبْتِ اِمَّ سَلِيمٍ تَدَاخَعِ
عَلَىٰ دُنْيَا كَلْمًا لَمْ اَصْنَعِ

مولانا خرم علی بلہوری

مہر صاحب لکھتے ہیں :-

بلہور کاں پور کے مصنفات میں سے ہے۔ مولوی صاحب ہومونا نے لکھنؤ میں سید صاحب سے بریت کی تھی۔ اس کے بعد خدمت دین میں مشغول ہو گئے۔ مشہور ہے کہ سید صاحب کے ساتھ جہاد کے لئے سرحد گئے تھے وہاں سے واپس آ گئے، غالباً سید صاحب نے انھیں دعوت و تبلیغ کے لئے مقرر کر دیا۔ رو بدعت اور احیا، سنت میں بہت سرگرم تھے۔

۱۳۱۵ھ میں نواب ذوالفقار بہادر رئیس باندہ کے حکم سے درمختار شرح تنویر الالبصار کا ترجمہ شروع کیا۔ محرم ۱۳۱۵ھ میں کتاب الحج تک ترجمہ مکمل کر چکے تھے۔ اسی سال وفات پائی۔ مولوی محمد احسن نانوتوی نے مولوی خرم علی کے وارثوں سے اس کتاب کا حق تالیف خرید لیا اور "غایتہ الاوطار" کے نام سے اسے شائع کر دیا۔ یہ ترجمہ ناتمام رہا۔

"مشارق الانوار" کا بھی ترجمہ کیا۔ "نصیر المسلمین" ان کی مشہور کتاب ہے "جہادیہ" منظوم ہے جس میں جہاد کے فضائل بیان کئے ہیں۔ سید صاحب کے لشکر میں "جہادیہ" جنگ کے وقت پڑھی جاتی تھی لے مولانا بلوچی اعظم خاں نوشہری نے "تراجم علمائے حدیث ہند" (جلد اول) میں اس "جہادیہ" کی نسبت لکھا ہے کہ "اسکی اشاعت کی اجازت نہیں" اس

سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت کی نظر میں بھی اسکی خاص اہمیت تھی۔ اس جہاد یہ "کے کچھ اشعار مہر صاحب کی کتاب کے حوالہ سے اس کتاب کے شروع میں نقل کئے گئے ہیں وہاں ملاحظہ کئے جائیں۔ مولانا فاضل شہر وی موصوف لکھتے ہیں۔

"مولانا خرم علی بلہوری ولی اللہی خانوادہ روہلی کے شاگرد تھے اور ابتداءً روش عام کے مطابق غالی مقلد کہ بقول صاحب "تلاکوفہ علماء ہند" منع قراءۃ فاتحہ خلف الامام پر سالہ لکھا، مگر جب قمحت نے یادری کی اور اسمعیل شہید علیہ الرحمۃ کی مصاحب نصیب ہوئی تو اتباع سنت کا رنگ چڑھ آیا اور اسی پر خاتمہ ہوا۔ اس غلبہ نے آپ کی زبان سے وہ شعر مجتہدہ حدیث رسول میں نکھوائے کہ جنہیں ہندوستان کے پرانے اہل حدیث شوق سے پڑھا کرتے۔ یعنی

کیا تجھ سے کہوں حدیث کیا ہے	دردانہ درج مصطفیٰ ہے
صوفی عالم، حکیم و نبی	کرتے رہے اسکی خوش چینی
بابا کے یہاں سے کون لایا	جس نے پایا یہیں سے پایا
یہ شاہ راہ محمدی ہے	گنجینہ راز احمدی ہے
مشعل انور راہ سنت	برہمن ریخ و شاخ بدعت
ہوتے ہوئے مصطفیٰ کی گفتار	مت دیکھ کسی کا قول و کردار
جب اصل ملے تو نقل کیا ہے	یاں وہم و خطا کا دخل کیا ہے

اب زیادہ تو مجھ سے نہ کر کل کل خورشید کے آگے کیا ہے مشعل
 بالفرض فلاں ہے مرد کا بل اس نے تھا کیا کہاں سحر اصل
 وہ بھی اسی در کا اک گدا تھا گو غوث و امام و مقتدا تھا
 ملفوظ بہت ہیں تو نے دیکھے ملفوظ محمدی کو اب الے
 ناحق تجھے اور کچھ ہوس ہے قرآن و حدیث تجھ کو بس ہے
 حق ہو گا حدیث خوان و خترم ارشاد رسول فخر عالم
 (تراجم علمائے حدیث ص ۵۴)

صاحب تذکرہ علمائے ہند نے ان کے حق میں لکھا ہے ”در
 قلع بدعت و احیائے سنت می کو شیدہ“
 (بدعت کے مٹانے اور سنت کے زندہ کرنے میں بڑے سرگرم تھے)
 ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ایک نامور مجاہد مولوی لیاقت علی صاحب

لے مولوی لیاقت علی صاحب نے الہ آبادی کے نواسے قاضی محمد ایوب صاحب ابھی محمد اللہ زندہ ہیں۔
 اپنے گاؤں مگادوں ضلع الہ آباد میں رہتے ہیں۔ مولوی ابوالخیر صاحب فاروقی ساکن موضع
 پرپوڑا ضلع پرتاب گڑھ نے مجھے بتایا کہ یہ بڑے دیندار اور اعتقاداً و عملاً نہایت پر جوش
 اور بختہ اہل حدیث ہیں۔ اپنے نانا مولوی لیاقت علی صاحب کے متعلق انھوں نے بڑے وثوق
 کے ساتھ کہا کہ وہ قطعی اہل حدیث تھے بلکہ اہلحدیث گرتھے۔ وہ رفع یدین کرتے تھے سنت نبویؐ
 کے عاشق تھے۔ جب ۱۸۵۷ء کی شورش ناکام ہوئی اور انگریز کا میاب ہو گئے تو مولوی لیاقت علی
 صاحب گرفتار کر لئے گئے ان کو کالے پانی بھیجا گیا۔ وہیں انکی وفات ہوئی۔ مولانا غلام رسول
 (رقیہ ص ۵۷) پر

اللہ آبادی کے جو کارنامے تاریخ میں محفوظ ہیں ان میں مذکور ہے کہ انھوں نے انگریزوں کے خلاف جب جہاد کا اعلان کیا اور خود تلوار لیکر میدان میں نکل آئے تو ملک کے دوسرے لوگوں کو اپنے ساتھ لینے کے لئے دو اشتہار بٹوائے۔ ایک اشتہار میں شرمناک عبارت تھی اور دوسرا اشتہار منظوم تھا۔ یہ دونوں اشتہار محاربہ عظیم کے مصنف کنالال نے اپنی کتاب میں شائع کئے ہیں۔ منظوم اشتہار میں یوں لکھا ہے۔

واسطے دین کے لڑنا نہ ہے طمع بلاد
اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
جو مسلمان رہ حق میں لڑا لمحظہ بھر
روضہ خلد بریں ہو گیا واجباً سپر
جو وہ حق میں ہوئے ٹکڑے نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں جنت بیغ تھی کرتے ہیں
گر پہ جیتے تو گھر بار میں پھر آؤ گے
اور گئے مارے تو جنت میں چلے جاؤ گے
مولوی لیاقت علی کے یہ دونوں اشتہار تلوار سے زیادہ کاٹ
کرنے لگے۔ جس نے بھی اسے پڑھا وہ تلوار لیکر میدان جنگ میں کود پڑا
مذکورہ بالا سب اشعار مولانا خرم علی بلہوری کے ہیں جو ان کے رسالہ
”جہاد یہ“ سے اشتہار میں نقل کئے گئے تھے۔ اس طرح بالواسطہ مولانا

مہر اپنی کتاب ”سہ سہرا“ اپنی کتاب ”سہ سہرا“ کے جہاد میں فرماتے ہیں،
دینی حمیت، ایمانی غیرت، اور حب آزادی کا یہ گرانماہ گہرے بہا۔ ان کی انوش میں خوبیاں
لے آجاتا دے ملت کھنوا بابت ۵ جولائی ۱۹۶۳ء ملاحظہ ہو۔

محرّم علی بھی ۱۵۷ھ کی جنگ آزادی میں شامل ہو جاتے ہیں اور اس انقلاب انگیز شورش میں ان کا بھی حصہ ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس ”جہادِ یہ“ کی اشاعت کی اجازت نہیں تھی جیسا کہ ابو یحییٰ امام خاں نے لکھا ہے۔

”سید احمد شہید جب سرحد پار پہنچ گئے تو ہندوستانی مجاہدین کے قافلے انکی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہے ان میں ایک قافلہ مولانا محرم علی کا بھی تھا۔“

www.KitaboSunnat.com

(۱) سید احمد شہید جلد دوم (حصہ ۲)

حکیم مومین خاں مومن

جہاد و تجدید و احیائے دین کی اس تحریک میں حکیم مومن خاں مومن دہلوی بھی شریک تھے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اس تحریک کو فروغ دینے میں اپنی شاعری سے بھی کام لیا۔ مومن ۱۲۱۵ھ و ۱۲۱۶ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان طبیبوں کا ایک مشہور خاندان تھا، ان کے والد حکیم غلام نبی خاں اپنے زمانے کے مشہور طبیبوں میں سے تھے۔ مومن کے گھرانے میں فارغ البالی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مذہبیت کا بھی چرچا تھا ان کے والد کو شاہ عبدالعزیزؒ سے خاص اداوت تھی کہا جاتا ہے کہ جب مومن خاں پیدا ہوئے تو ان کے والد کی فرمائش پر شاہ صاحب ہی نے ان کے کانوں میں اذان دی اور ان کا نام مومن خاں رکھا۔ مومن کی ابتدائی تعلیم گھری پر ہوئی۔ جب سن شعور کو پہنچے تو ان کے والد نے انہیں شاہ عبدالقادرؒ کے سپرد کیا۔ مومن بلا کے ذہین تھے اس لئے اس ماحول سے انہوں نے بہت جلد بہت کچھ حاصل کیا۔ مشہور یہ ہے کہ استاد کی زبان سے جو الفاظ نکلتے تھے وہ انہیں ازبر ہو جاتے تھے غرض مومن نے اس علمی ماحول میں شاہ عبدالقادرؒ جیسے استادوں سے درسیات کی تکمیل کی بعد اس کے بعد طب کی طرف متوجہ ہوئے جو ان کا آبائی پیشہ تھا۔ طب کی تکمیل کے بعد ان کی تنوع پسند طبیعت علم نجوم کی طرف راغب ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس فن میں بھی مہارت حاصل کر لی نجوم کیساتھ ساتھ شطرنج کی طرف بھی

راغب ہوئے اور اس فن پر بھی بہت تھوڑے عرصہ میں حاوی ہو گئے
اس عرصہ میں شاعری سے انھیں برابر خاص نسبت رہی۔ شعر کہتے
رہے اور اس میں بھی جلد اپنی ایک حیثیت بنالی یہاں تک کہ ان
کا شمار اس دور کے مشہور اساتذہ میں ہونے لگا۔

ایک شاعر کی حیثیت سے مومن نے یوں تو تمام اصناف میں شاعری
کی ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مثلث، مربع، مخمس،
مدرس، مثنیٰ، ترجیع بند، ترکیب بند، سب میدانوں کی انھوں
نے خاک چھانی ہے۔ لیکن ان کا خاص میدان غزل ہے۔ اس مخصوص
صنعت میں انھوں نے جو کمال حاصل کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے
انھوں نے اس صنعت میں جس مخصوص اچھوتے انداز کی طرح ظلی
ہے اس نے خود غزل کی صنعت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

شاعری کے اس ذوق کے باوجود جذبہ جہاد سے بھی ان
جذبہ جہاد کا دل معمور تھا۔ ان کی ایک رباعی ہے

مومن تمہیں کچھ بھی ہو جو پاس یا ماں ہے معرکہ جہاد چل دیجے وہاں
انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز وہ جان جسے کرتے تھے بتوں پر قربان
بارگاہ الہی میں دعا کرتے ہیں

خدا یا لشکر اسلام تکسب پہنچا کہ آپہنچا لبوں پر دم بنا ہو جس خوش شوق شہداء کا

اے مومن کے ابتدائی حالات اور ان کی شاعری کے متعلق یہ تفصیلات کلیات مومن کے مقدمہ سے ماخوذ ہیں۔
۱۶ کلیات مومن ص ۶۳

نہ کریگا نہ مہر امام اقتدا سنت
کہ انکار آشنائے کفر و نائی الامت کا
امیر لشکر اسلام کا محکوم ہوں، یعنی
ارادہ ہے ہر افواج ممالک پر حکومت کا

زمانہ مہدی موعود کا پایا اگر مومن
تو سب پہلے تو کیوں سلام پاک حضرت کا
ان کی ایک مشنوی پورے چالیس اشعار کی مشنوی جہاد یہ کے نام

سے موسوم ہے جو درج ذیل ہے۔

پلا مجھ کو ساقی شرابِ ظہور
کہ اعضا شکن ہے خارِ فجور
کوئی جرعہ دے دیں خراجِ اسکا
کہ آجائے بس لشکر اسلام کا
برنگِ مے ایمان کو آجائے جوش
نہ اپنا ہے اور نہ دنیا کا ہوش
عناؤ نہ ہفتہ کو ظاہر کروں
دم تیغ سے قتل کا فر کروں
چے تشنہ کامی سب در سب
پیوں شوق سے ملحدوں کا ہلو
یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال
کہ گردن کشوں کو کروں پامال
بہت کوششِ جان نثاری کروں
کہ شرعِ پیغمبر کو جاری کروں
دکھا دوں بس انجامِ الحاد کا
نہ چھوڑوں کہیں نامِ الحاد کا
نہ کیونکہ ہوں اس کام میں ناشکیب
ظہور امامِ زمان ہے قریب
وہ خضر طریقِ رسولِ خدا
کہ جو پیر و اس کا ہے سویشا
وہ نورِ مجسم وہ نطلِ الہ
کہ سایہ سے جکے نخلِ مہر و ماہ
زہے سید احمد قبولِ خدا
سر امتحانِ رسولِ خدا

(۱۰ کلیات مومن ص ۶)

نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف
 علی و حسینؑ و حسنؑ کا خلف
 زہے حشر تک زندہ و بنگذات
 بے کفار کی موت اسکی حیات
 خدانے مجاہد بنایا اسے
 سر قتل کفار آیا اسے
 دم اس دست باز و پیہ دیوے اجل
 لب تیغ کے بوسے لیوے اجل
 جلو میں ہمیشہ دواں ہو ظفر
 رکاب اسکی پکڑے رواں ہو ظفر
 کہوں کیا لولائے امامت کا انج
 کہ ہیں غوث و ابدال سب پل فنج
 خبردار ہو جاوے اہل دل
 ہو اجماع لشکر اسلام کا
 ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک
 جو داخل سپاہ خدا میں ہوا
 حبیب حبیب خداوند ہے
 امام زمانہ کی یاری کرو
 سمجھ لو جو کچھ بھی ہے تمکو تمیز
 کبھی کو نہیں ہے اصل کی خبر
 تو مقدور کس کا کہ آنے نہ دے
 تو بہتر یہی ہے کہ جاں کا آئے
 قیامت کو اٹھو تو تم بامراد
 عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو
 جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم
 خداوند اس سے رضا مند ہے
 خدا کیلئے جاں نثاری کرو
 نہ جاں آفریں سے کرو جاں عزیز
 کہ آجائے بیٹھے ہوئے اپنے گھر
 تن خستہ سے جاں کو جانے نہ دے
 پس مرگ تربت میں آرام آئے
 لب الحمد گو اور دل شاد شاد
 حیات ابد ہے جو اس دم مرد
 سزاوار گردن فرازی ہو تم

یہ ملک جہاں ہے تمہارے لئے نعیم جہاں ہے تمہارے لئے
 شراکت یہاں کی ہر طالع کا اوج کہ ایسا امام اور ایسی ہے فوج
 سعادت ہے جو جانفشانی کرے یہاں اور وہاں کا مرانی کرے
 الہی تجھے بھی شہادت نصیب یہ افضل سے افضل عباد نصیب
 الہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار پر تیرے کرم کا ہوں امیدوار
 تو اپنی عنایت سے توفیق دے عروج شہید اور صدیق دے
 کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے ملا دے امام زماں سے مجھے
 یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں مری جاں فدا ہو تیری راہ میں

میں گنج شہیداں میں مسرور ہوں

اسی فوج کے ساتھ محشر ہوں

مومن خاں نے اپنے فقہی مسلک کے اظہار میں بھی

مسلک اظہار | جرأت ایمانی سے کام لیا ہے اور صاف صاف
 لفظوں میں بتا دیا ہے کہ میں حدیث کا متبع، تقلید کا منکر اور خالص
 محمدی ہوں۔ لکھتے ہیں:

ارباب حدیث کا میں فرماں بردار ہوں تقلید کے منکروں کا سر دفتر ہوں
 مقبول روایت ائمہ۔ نہ قیاس یعنی کہ فقط مطیع پیغمبر ہوں
 ایک دوسری رباعی ہے

لے کلیات مومن از منہ ۱۴۳۷ھ / لے کلیات مومن ۵۵۳ھ

خالص ہوں محمدی سرادین اسلام گورائے ثواب ہو نہیں محبو کام
تقلید کی ٹھہری تو بنوں کا شیعہ کس واسطے چھوڑ دیجئے افضل ترمقام
ایک غزل کا مقطع ہے ع

مؤمن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

توحید و سنت ہے محبت اور اہل بدعت و ضلالت سے نفرت کا اظہار
کس جوش کے ساتھ کیا ہے لکھتے ہیں سہ

فروغ جلوہ توحید کو وہ برق جولاں کر کہ خرمن پھونکے لوئے ہستی اہل ضلالت کا
مرا جو سر ہو سرتا پا صفائے مہر پیغمبر مراجرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سنت کا
مجھے تیغ جوہر کہ کہ میرے نام سے خوں ہو دل صد پارہ اصحا اتفاق اہل بدعت کا
تحریم جہاد پر اعراض کرنے والوں کے جواب میں ایک رباعی کہی چرہ

یہ چند منافق سراپا بدعت ہے کفر و ضلال و فسق جنکی طینت
بتلاتے ہیں بدعتی امام حق کو گویا کہ جہاد ہے خلاف سنت
ان اشعار سے مومن خاں کا مسلک واضح ہے اسی لئے ان کے بعض

حنفی سوانح نگاروں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ "موجود اور عامل بالحدیث
تھے" چنانچہ ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی ان کے حالات کے ذیل میں ایک جگہ
لکھتے ہیں :-

تمام خاندان ان کا سخت کٹر قسم کا مسلمان، خود موجود،

۱۔ کلیات مومن ص ۶۳۔ ۲۔ کلیات مومن ص ۶۴۔ ۳۔ کلیات مومن ص ۶۵۔ ۴۔ کلیات مومن ص ۶۶۔

عامل بالحدیث، اور بیعت کے بعد اور بھی سخت ہو گئے تھے، چنانچہ اکثر و
 بیشتر (اشعار میں) مذہبی اصطلاحیں بھی آ جاتی ہیں۔ کبھی تو علانیہ یا اشاریہ
 میں دوسرے مذاہب والوں پر سودا کی طرح چوٹیں بھی کر جاتے ہیں
 ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۲ء میں وفات پائی۔ مہدی پورہ میں
وفات شاہ ولی اللہؒ کے خاندانی مقبرے کے پاس دفن ہوئے

مولانا ابوالحسن افغانی رح

مشہور اہل حدیث عالم مولانا حکیم عبدالشکور صاحب شکر اوی دضلع
گورکھ پور علاقہ میوات نے تاریخ نیوچھتری کے نام سے کوئی کتاب لکھی
ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے۔ ہم مولوی محمد اسراریل صاحب
ندوی مدرس دارالعلوم شکر اویہ کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس کتاب
کا کچھ حصہ جو بعض مجاہدین کے حالات پر مشتمل ہے اخبار الدہلیہ
میں شائع کر دیا ہے۔ اسی اخباری مضمون کو ہم یہاں نقل کر رہے ہیں
اس مضمون میں تین مجاہدوں کا تذکرہ خاص طور سے کسی قدر تفصیل کے
ساتھ لکھا گیا ہے۔ مولانا ابوالحسن افغانی۔ حاجی عبداللہ خاں۔ میانجی
کریم اللہ خاں۔ اب علی الترتیب ان تینوں بزرگوں کے حالات
۲۱ سندہ صفحات پر پڑھئے۔ حکیم عبدالشکور صاحب مولانا ابوالحسن افغانی
کے متعلق لکھتے ہیں:-

”آپ علاقہ میوات کے باشندے نہ تھے بلکہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں
علاقہ میوات میں وارد ہوئے تھے۔ آمد کا واقعہ اس طرح بیان
کیا جاتا ہے کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جب دہلی میں ہنگامہ شروع
ہوا تو سرحد کی اس جماعت میں سے جو مجاہدین کے نام سے
بہت بڑی شہرت رکھتی تھی ایک لاکھ پانچاویں جماعت انگریزوں کے

مقابلہ کرنے کیلئے ہندوستان میں چلی آئی تھی۔ اور ہنگامہ کے ابتدائی ایام میں انھوں نے باغی فوج کے ساتھ مل کر انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ بعد میں جب باغی فوج اور سلطان بہادر شاہ ظفر پیرانگرنیروں نے فتح پائی تو مجاہدین کی یہ مختصر سی جماعت دلی سے باہر نکل پڑی اور جہاں انکو راستہ اور موقع ملا دوسرے علاقوں میں چلے گئے۔ ان میں سچا حضرت نے میوات کا رخ کیا (۱) مولوی نور علی (۲) مولوی محمد مرید (۳) مولانا ابوالحسن افغانی (۴) حضور کھیتی والے (۵) ایام ہنگامہ کے بعد یہ لوگ میوات میں رہنے لگے۔ ان کے چاروں کا مشغلہ تبلیغ اور اشاعت دین کے سوا کچھ نہ تھا ان کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکا ہے اسکو ہم بدایت مولانا ڈاکٹر نذر محمد بادشاہ پوری (ضلع گوڑگانوہ) بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک بہت بڑے دیندار بزرگ اور عالم باعمل تھے، جماعت مجاہدین سے اچھا خاصا تعلق اور نسبت رکھتے تھے۔ روایت حسب ذیل ہے۔

”غالباً جولائی ۱۸۵۷ء کی بات ہے کہ چار اشخاص میرے پاس پہنچے جنکے خوبصورت چہرے کملائے ہوئے ہوئے تھے۔ مگر ایمانی جلالت شان انکی زبانوں سے مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے اور پھر کھانے پینے سے فارغ ہو کر

میں نے انہیں مکان میں آرام کرنے کیلئے کہا تھوڑی دیر انہوں نے آرام بھی کیا مگر ایک شخص ان میں سے کبھی کبھی کراہتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے پیر میں بندوق کی گولی لگی ہے۔ ہر چند اسکو نکالنے کی کوشش کی گئی مگر ناکامی رہی۔ میں نے کہا ذرا دکھاؤ۔ انہوں نے مجھے دکھایا۔ ان کے پیر میں گولی پھنسی ہوئی تھی مجھ سے نکالنے کو کہا۔ میں نے التا جراحی کے ذریعہ اسکو نکال لیا وہ اسقدر مضبوط دل کے آدمی تھے کہ عمل جراحی کرنے پر انہوں نے آہ بھی نہ کی۔ میں نے خراب ساختوں کو نکال کر انکی مرہم چٹی کر دی۔ ان چاروں کو ”بادشاہ پور“ کے شمال کی طرف دو فرلانگ کے فاصلے پر جو گنبد ہے اس میں ٹھہرا دیا۔ وہ کئی دن تک ٹھہرے رہے میں ان کو رات میں کھانا پہنچا دیا کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انگریزوں کو دہلی پر تغلب حاصل ہو گیا تھا۔ اور باغیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو چکی تھی۔ ایک دن صبح کو جو میں بازار میں نکلا تو چند آدمی یہ گفتگو کر رہے تھے کہ گنبد میں کچھ آدمی ٹھہرے ہوئے ہیں دن میں اندر رہتے ہیں۔ گا ہے ما ہے اکتے دکتے پیشاب پاخانہ کو بھی آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اب ان لوگوں کا راز فاش ہو چکا ہے ان کو گنبد میں رکھنا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ اسی رات کو میں ان حضرات کے پاس پہنچا اور افشائے راز کا واقعہ صبر

میں نے سنا تھا ان کے سامنے بیان کر دیا۔ یہ لوگ رات ہی کو میوات کیطرف چلے گئے۔ ان میں سے دو آدمیوں کو میں پہچانتا تھا باقی دو کو بعد میں بھی نہ پہچان سکا۔ پہلے بزرگ تو وہی ہیں جنکے پیر سے میں نے گولی نکال کر مرہم پٹی کی تھی۔ وہ مولوی محمد مرید تھے۔ جو فیروز پور جھر کے میں مقیم ہو گئے تھے اور دوسرے مولوی نور علی صاحب تھے جو ریاڑی میں مقیم ہو گئے تھے اور میوات کو ان سے بڑا فیض پہنچا (انتہی کلام)

(اسکے بعد حکیم صاحب لکھتے ہیں)

”ڈاکٹر صاحب کے اس بیان سے مجھے جستجو ہوئی کہ وہ دو حضرات کون بزرگ تھے جو مولوی نور علی اور محمد مرید صاحبان کے ساتھ تھے۔ میں نے میوات میں ان آدمیوں کی تلاش شروع کی تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک بزرگ تو وہ تھے جو موضع ”کھیتی کی“ ریاست اور میں خروانی خان کے یہاں مقیم تھے اور ساری عمر وہیں مقیم رہے۔ خروانی خانے میوات کے وہ رئیس تھے جنکے یہاں ہینڈ لونگر جاری رہتے تھے اور عام لوگ اس مجاہد کو ”حضور“ کہا کرتے تھے۔ دوسرے بزرگ وہ ہیں جو اہل میوات کیلئے ایک عرصہ تک غوبہ بنے رہے وہ بڑے سیاح اور صوفی و عالم بھی تھے اور موضع بھونری میں تقریباً چالیس سال تک مقیم رہے انھیں آخر عمر میں مایجو لیا ہو گیا تھا۔ یہ میوات کے نواح میں مولوی ابوالحسن کے نام سے مشہور تھے۔ حکیم صاحب کا بیان ہر کلمہ

ان چاروں میں سے میں نے مولوی نور علی، مولوی محمد مرید، مولانا ابوالحسن کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہ حضرات اپنی ساری عمر بیعتات میں رہے مگر مولانا ابوالحسن ہندوستان کی سیاحت کر کے پھر موضع بھونری میں مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ مولانا ابوالحسن کوئی معمولی لکھ پڑھے آدمی نہ تھے بلکہ وہ جملہ علوم و فنون کے بڑے بھاری جمید عالم تھے۔ فن مناظرہ میں یدِ طولی رکھتے تھے۔ تبلیغ دین کا بے پناہ جوش رکھتے تھے۔ انہوں نے تبلیغ کے سلسلے سارے ہندوستان کا سفر بھی کیا تھا۔ مگر آخر عمر میں وہ اپنے قدیم محسن "نٹھو نمبردار" کے مکان پر موضع بھونری ضلع بھرت پور میں مقیم ہو گئے تھے۔ بڑے باکمال بزرگ تھے۔ دہلی، اکبرہ وغیرہ بلادِ منہ سے بہت سے لوگ ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ علمِ کیمیا کے متعلق بھی ان کے بارے میں یہ عام شہرت تھی کہ وہ یہ علم جانتے ہیں۔ جس وقت انکی وفات ہوئی تو ان کے حجرے میں ستتر جوڑی سونے کے بٹن اور کچھ کٹھیا لیاے اور سنیاں پائی گئیں۔ ان کے اس اندوختہ سے بھونری اور گردونواح کے آدمیوں نے ایک عید گاہ تعمیر کرائی اور ان کا مزار بنوایا۔

مولانا ابوالحسن طبیعت کے بڑے تیز تھے، مطالعہ کے بہت شوقین تھے۔ آخری زندگی میں تصوف کی جانب مائل ہو گئے تھے۔ تصوف میں گفتگو ہونے کیساتھ ان کی زبان پر فتوحاتِ مکیہ اور احیاءِ العلوم کے مقولے بڑی جلدی سے آیا کرتے تھے۔ اپنی آمد کے ابتدائی برسوں میں ان کو بحث و نظر سے واسطہ پڑا۔ اہل حدیث اس کا رکھتے تھے اس لئے مختلف عالموں

ان کے مناظرے ہوئے یہاں تک کہ فیروز پور جھڑک میں جب حنفی اہلحدیث مناظرے کی تحریک اٹھی تو اسکی بحث و محیص میں آپ پیش پیش تھے۔ اور حضرت مولانا محمود حسن صدر مدرس دارالعلوم دیوبند سے مناظرہ کرنے کیلئے سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ آخر عمر میں آپ بھونری کی مسجد کے ایک حجرے میں مقیم ہو گئے۔ تعویذ لکھانے والوں کا تائبندھا رہتا تھا۔ خلق خدا نے ان سے بڑا فیض پایا اگر دین و نواح کے اضلاع کے مسلمان اور میوات کے باشندے انہیں اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ خود مجھے ان سے بارہا نیاز حاصل ہوا۔ آخر عمر میں اگرچہ ان کے دماغ میں خلل آگیا تھا مگر جب راستی پر آجاتے تھے تو بڑی اچھی گفتگو کیا کرتے تھے۔ اور ہر بات کا شافی جواب دیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق عوام و خواص میں بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔ سو سال سے زائد عمر میں وفات پائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اے

لے اخبار اہلحدیث دہلی بابت یکم اگست ۱۹۳۳ء

حاجی عبداللہ خاں

آپ موضع کانکر کھیڑہ تحصیل سنجارہ ضلع اور کے باشندے تھے۔
معتبر روایات کی بنا پر یہ سمجھا گیا ہے کہ جس وقت حضرت سید احمد صاحب
بریلوی کی تحریک جہاد اٹھائی گئی اس وقت جو قافلے اور مسافر ٹونک
اور دہلی میں آمد و رفت رکھتے تھے انھیں کے توسط سے آپ کو دینداری
کی نسبت پیدا ہوئی۔ اس زمانے میں راجستان کی آمد اس موجودہ
پختہ سڑک سے نہیں تھی جو آج دہلی کو راجستان سے ملاتی ہے بلکہ اس وقت
عام طور پر دہلی سے راجستان جانے والے یا تو دیواڑی سے جاتے تھے یا
اس راستے سے گذرتے تھے جو قصبہ سوسنہ سے اراڑی پر بت کو کاٹ
کر قصبہ تاوڑو کا راستہ پکڑتی ہے۔ تاوڑو سے تجارت کو جاتے ہوئے
موضع کانکر کھیڑہ راستہ میں ملتا ہے۔ حاجی عبداللہ خاں نے
ان راستہ چلنے والوں سے جو ٹونک اور دہلی کے درمیان آمد و رفت
رکھتے تھے۔ دینی سبق حاصل کیا۔ یہاں تک کہ آپ دہلی پہنچ کر احمد صاحب
بریلوی کے مرید ہو گئے۔ اور مولانا اسماعیل شہید کے قافلے کے ساتھ جنہیں
اور بھی بہت سے اہل بیوات تھے سرحد پہنچ گئے۔ اور وہاں سید صاحب
کے ہمراہ متعدد جنگوں میں شریک رہے۔ جب بالاکوٹ میں مولانا اسماعیل
اور حضرت سید احمد صاحب بریلوی شہید ہو گئے تو مجاہدین کے دو گروہ

بنے۔ ایک گروہ سرحد میں رہا، اور دوسرا گروہ عازم ہندوستان ہوا۔
 جب قدر بھی مجاہدین، حضرت سید احمدؒ اور مولانا اسماعیل شہید کے ہمراہ
 رہ چکے تھے اور انکی مبارک صحبتوں سے فیض پا چکے تھے ان سب نے
 اپنے اپنے وطن پہنچ کر لسانی جہاد شروع کر دیا۔ ان میں ایک ہمارے
 حاجی عبداللہ خاں بھی تھے اور انھیں کے ایک ساتھی میاں شیخ کریم اللہ
 گوبانوی بھی تھے۔

حاجی عبداللہ اگرچہ بہت زیادہ لکھے پڑھے، عالم فاضل نہ تھے مگر
 حضرت مولانا اسماعیل شہید کے فیض صحبت سے وہ تبلیغ اور اشاعت
 دین کا جذبہ بے پناہ رکھتے تھے۔ اس وقت کامیوات آج کامیوات نہ تھا
 بلکہ پورا علاقہ کفر و شرک و بدعات کی مکروہات سے پُر تھا۔ کھیرٹو ڈیوٹ
 دیوی، دیوتاؤں کو مانتے تھے، دینی تعلیم کا کوئی رواج نہ تھا۔ ہزاروں
 مواضعات میں سے چند مواضعات ایسے تھے جہاں مساجد تھیں، اس
 وقت جو گاؤں درگاؤں مساجد کے منار سے اور گنبد نظر آتے ہیں
 ان کا پتہ بھی نہ تھا۔ نوابہ معین الدین چشتیؒ اور شاہ مدارؒ اور سید سالار
 صاحبؒ کے مجاہدین مانتے ہیں آتے تھے اور اپنا نذرانہ اور بھینٹ لے
 جایا کرتے تھے۔

جب واقعہ بالا کوٹ ہو چکا تو خانہ داران دلی الہی کے بعض فیض یافتگان
 عالم بھی میوات کا دورہ کرنے لگے تھے جن میں مولوی سید محبوب علی اور
 مولوی حیدر علی ٹونسا کا نام بڑی جگہ سے ہمارے سامنے آجاتا ہے

۱۶۴

حاجی عبداللہ مرحوم اپنے طریقے سے ایک تبلیغی وفد مرتب کر کے میوات کے دورے کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان کی آمد کا حال بعض پرانے آدمیوں سے معلوم ہوا تھا۔ مشرقی میوات کے حصے میں اکثر ان کے دورے رہتے تھے چونکہ عقیدہ و عملاً اہل حدیث تھے اور شاہ اسماعیل شہید کے تربیت یافتہ اہل حدیث تھے اسوجہ سے ان کے فیض صحبت سے میوات میں حلقہ اہل حدیث قائم ہوا گوہار، شکرادہ، جلال پور، لاڈمکا، بنجارا کا وغیرہ میں انہوں نے اپنی رشتہ داریاں بھی کر لی تھیں۔ پھر یہ رشتہ داری کے تعلقات ایسے است آئے کہ بہت سے مقامات پر اہل حدیث پیدا ہو گئے۔ آج جو کچھ اہل حدیث میوات میں پائے جاتے ہیں یہ سب حاجی عبداللہ کا فیضان ہے چنانچہ جھانڈہ، شکرادہ، رہپوہ، جلال پور وغیرہ میں جو اہل حدیث کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے اس کا واحد سبب حاجی عبداللہ کے وہ رفقاء ہیں جن سے ہم نے اپنی مستعار زندگی میں ملاقات کی اور ان سب حالات کے مرتب میں ہم نے مدد ملی۔ ان حضرات کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔

(۱) میانجی کریم اللہ خاں گوبانی (۱۲) میانجی الف خاں شکرادی (۱۳) نتھو خاں نمبردار جلال پوری۔ (۱۴) حاجی سمیع خاں ساکر سوی (۱۵) میانجی عبدالغفور باولوی۔ (۱۶) پٹواری حاجی احمد خاں رہپوی (۱۷) مولانا ڈاکٹر نذر محمد خاں بادشاہ پوری۔ محرم اللہ

لے اخبار اہل حدیث دہلی بابت یکم اگست ۱۹۹۴ء

میاںجی کریم اللہ خاں

مولانا حکیم عبدالشکور صاحب شکر اوی لکھتے ہیں

”میاںجی کریم اللہ خاں موضع گوپانہ تحصیل نوح ضلع گوڑگانوہ کے باشندے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپکو دین و ایمان کی دولت کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا جبکی بنا پر اپنا تعلق دینداروں سے قائم کیا اور یہی تعلق دینی آپ کو سید احمد بریلویؒ تک کھینچ کر لے گیا جہاں آپ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے مرید ہو گئے اور مولانا اسماعیل شہید کے قافلے کے ساتھ سرحد پہنچ گئے۔ میاںجی مولانا شاہ اسماعیل شہید کے خاص معتمدوں میں تھے اور آپ کی جماعت میں شامل ہو کر متعدد جنگوں میں شریک ہوئے۔ شاہ شہیدؒ ہی کے اثر سے مسلک عمل بالحدیث اختیار کیا اور آخر عمر تک اسی پر گامزن رہے۔“

میاںجی موصوف معرکہ بالا کوٹ میں سید صاحب کے ساتھ تھے، مولانا غلام رسول تمہراس معرکہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”کریم اللہ خاں میواتی مولانا شاہ اسماعیل کی جماعت میں تھے، اس جماعت کو ملا لعل محمد قندھاری کے مورچے کے قریب متعین کیا گیا تھا۔ سب لوگ صبح ہوتے ہی مورچوں میں جا بیٹھے کریم اللہ خاں کو سید صاحب کی زیارت کے شوق نے روکے

رکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ مسجد بالا میں پہنچا تو آپ دعا دینا جاتا
 میں مشغول تھے مسجد سے دس پندرہ ہاتھ نیچے یعنی مغرب
 جانب ایک مورچہ شاہینچیوں کا تھا وہ سکھوں پر گولے پھینکتے
 تھے سکھوں کے گولے انکی طرف سے آتے تھے لیکن کوئی گولہ کسی کو
 لگتا نہ تھا۔ میں چلے ہوئے گولے اٹھا اٹھا کر شاہینچیوں کو دینے
 لگا۔ اس وقت مسجد یعنی مسجد بالا میں بڑا ہجوم تھا۔
 پھر حضرت کو اڑ مسجد کے کھول کر باہر نکلے اور بالا کوٹ کے
 نیچے کو روانہ ہوئے اور سب لوگ آپ کے پیچھے آپکے ہمراہ چلے
 جب نیچے کی مسجد کے قریب پہنچے کئی تنگ تھی تمام آدمی
 اس میں ٹھس گئے۔ اور ایک کئی مسجد کے داپنے طرف اور
 تھی، پھر حضرت تو مسجد مذکور میں تشریف لے گئے اور کچھ
 لوگ اس گلی میں گئے انہیں کے ساتھ میں بھی چلا گیا اور دھانوں
 کے کھیت میں پہنچ کر بندوق سکھوں پر لگانے لگا۔ اس (اشنا)
 میں حضرت امیر المومنین اس مسجد سے ہٹ کر کے آئے اور ہم
 لوگوں کے بائیں طرف جو سکھوں کا بڑا ہجوم تھا اُدھر چلے گئے۔
 اور جانبین سے بندوق کی باڑھ بھی چلتی تھی اور تلوار بھی چلتی
 تھی اور دھویں کی ایسی تاریکی تھی کہ دس قدم کا آدمی معلوم
 نہیں ہوتا تھا۔ ہوا مخالفت تھی تمام دھواں ان کا چاروں طرف
 آتا تھا۔

لے سید احمد شہید جلد دوم صفحہ ۳۹۵

معرکہ بالا کوٹ کے متعلق مختلف مجاہدوں کے بیانات مہر صاحب نے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں ان میں سے کریم اللہ خاں کا ایک بیان بھی ذکر کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

”کریم اللہ خاں کہتے ہیں اس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ کون کہاں ہے مولانا اسماعیل نے ہم لوگوں سے پوچھا کہ حضرت امیر المومنین کہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا اس مجوم میں جہاں تلوار چل رہی ہے وہاں ہوں گے۔ پھر مولانا تو ادھر چلے گئے..... جو غازی حضرت امیر المومنین کے مورچے سے آتا، یہی پوچھتا کہ حضرت امیر المومنین کہاں ہیں؟ خود میانجی کریم اللہ خاں بھی بڑی بہادری اور جلال بازی کے ساتھ اس معرکہ میں لڑے تھے، مہر صاحب لکھتے ہیں۔

”کریم اللہ خاں میواتی کی دائیں ہتھیلی پر گولی لگی تھی ایک گولی سے ان کی تلوار کا کندا ٹوٹ گیا تھا ایک زہرہ پوش سکھ نے ان پر تلوار کا وار کرنا چاہا لیکن گولی کھا کر زمین پر گر گیا، کریم اللہ خاں نے بڑھکے تلوار ماری جو زہرہ سے ٹکرا کر ٹیسرے ہو گئی۔ غازی کا ہاتھ بیکار ہو چکا تھا، جوتی کے نیچے تلوار کا سراد باکر سے سیدھا کیا۔ دو اور سکھ ان کی طرف بڑھے تو کریم اللہ خاں نے بندوق اٹھائی، وہ دو رہی رُک گئے، دوسری غازیوں کے ساتھ یہ بھی میدان سے باہر نکل گئے تھے“

۱۔ سید احمد شہید جلد دوم ص ۷۳۔ ۲۔ سید احمد شہید جلد دوم ص ۷۴

جنگ بالاکوٹ کے بعد ہندوستان واپس آ گئے اور کافی عرصہ تک ٹونک میں مقیم رہے جہاں پر شہیدین اور دیگر مجاہدین کے حالات مرتب کرانے میں کافی مواد فراہم کیا پھر ٹونک سے آپ نے میوات کا قصد کیا اور اپنے قدیمی گاؤں گوہانہ میں سکونت اختیار کی جہاں پر آپ نے کتاب و سنت کی نشر و اشاعت کو اپنا مقصد اعلیٰ قرار دیا اور بحمد اللہ آپ اس میں سو فیصدی کامیاب ہوئے۔

مولوی محمد اسراریل صاحب ندوی لکھتے ہیں

حضرت مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مرحوم نے میانخی کریم اللہ خاں سے ۱۳۷۱ھ میں ملاقات کی اور مجاہدین کے حالات ان سے دریافت کئے، میانخی موصوف نے ۱۳۷۱ھ میں اس جہاں فانی سے عالم جاودانی کو لبیک کہا، وفات کے وقت عمر سو سال سے زائد تھی۔ آپ کی ذات سے مسلک اہل حدیث کو کافی فروغ ہوا۔ ہمارے گاؤں موضع جھانڈہ میں بھی اہلحدیثیت آپ ہی کے ذریعہ پہنچی، اللہ تعالیٰ انکی قبر کو نور سے بھر دے۔ بڑے ہی بالکمال اور محبوب کتاب و سنت بزرگ تھے اے



تحریر کا

دورثانی

www.KitaboSunnat.com

(۱۸۰)

مولانا دلایت علیؒ

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم لکھتے ہیں۔

”فاجعہ بالاکوٹ کے بعد تمام ملک پر اداسی چھائی ہوئی تھی، ہجرت تتر بتر ہو گئی۔ اچھوں اچھوں کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جہاد کا سارا کام، درہم برہم ہوا چاہتا تھا کہ عظیم آباد پٹنہ محلہ صادق پور کے ایک فرد نے یہ گمراہ ہوا علم اپنے ہاتھوں سے تمام لپیٹا اور زندگی بھر اپنے سینوں سے لگائے رکھا۔ اور پھر اس ”فردِ کامل“ کے بعد اس کے بھائیوں، بھتیجیوں، عزیزوں اور ماننے والوں نے جس طرح اپنے خون سے اس نخلِ خزاں دیدہ کی آبیاری کی ہے وہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے۔۔۔۔۔ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد قیادت کی باگ مولانا دلایت علیؒ صادق پوری عظیم آبادی (مولودستدار) نے اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ ابھی وہ دکن میں تبلیغ و ارشاد کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ فاجعہ بالاکوٹ پیش آیا۔ امیر و شیخ کی شہادت

میں یوں تو شہید بالاکوٹ کے بعد ہی مجاہدین کا ایک گروہ سرحد پار پہنچ گیا تھا اور مولانا دلایت علیؒ کے سرحد پہنچنے (۱۳۶۲ھ) سے پہلے وہ مختلف امراء و شیخ ولی محمد کھلیتی، مولوی فیصل الدین دہلوی، بقیرہ صاحبؒ پر

کی خبر سنتے ہی وہ عظیم آباد واپس ہوئے اور دعوت و تبلیغ کی از سر نو تنظیم شروع کی ۱۱

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۵۶)

مولانا ولایت علی
کاملاً

یہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ بلاشبہ سید احمد شہید رحمہ اللہ کی زندگی میں اس تحریک میں حنفی اور اہل حدیث دونوں ہی مسلک کے لوگ برابر شریک رہے۔ اور سید صاحب دونوں ہی کی سرپرستی فرماتے رہے۔ مگر ان کی شہادت کے بعد اس تحریک کو زندہ رکھنے اور چلانے میں زیادہ حصہ اہل حدیث ہی کا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس تحریک کے آخری دور کے معاونین کے کچھ نام ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے :-

”گویا آخری دور میں اعانت مجاہدین کا اکثر و بیشتر کام زیادہ تر اہل حدیث حضرات ہی نے انجام دیا ہے۔“

بقید حاشیہ ص ۱۸ اور حاجی سید عبدالرحیم مرقی، اور مولانا عنایت علی کی سرکردگی میں اپنا فرض انجام دیتے رہے۔ لیکن ان دونوں ہندو ویرزن ہند مجاہدین اور ان کے ہمدرد انہیں کو اپنا امیر سمجھتے تھے اعلیٰ لئے جب وہ سرحد پہنچ گئے تو مرزا لطیف نے فوراً آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ باقی ملک کے اندر قوہ سید صاحب کی شہادت کے بعد ہی سے امیر کی حیثیت سے دعوت و تبلیغ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ (حاشیہ حوالہ مذکور)

پہلے سرگذشت مجاہدین ص ۶۳

ہم کو اس تحریک کی بوری تاریخ لکھنا مقصود نہیں بلکہ اس کے ساتھ صرف اہل حدیث کی وابستگی اہل ان کے خدمات کا اظہار مقصود ہے اس لئے اس سلسلے میں ہم انہیں افراد کا ذکر کر رہے ہیں جو اہل حدیث تھے۔ پس جب بقول مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم سید صاحبؒ اور مولانا اسماعیلؒ کی شہادت کے بعد اس تحریک کی قیادت کی باگ مولانا ولایت علیؒ کے ہاتھوں میں آئی تو اب ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ان کی خدمات کا ذکر کرنے سے پہلے ان کا مسلک واضح کیا جائے۔

مولانا ولایت علیؒ لکھنؤ میں عربی و دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ انہیں دنوں میں حضرت سید احمد شہیدؒ کا وہاں ورود مسعود ہوا۔ مولانا ولایت علیؒ سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پہلی ہی ملاقات میں ان کے گردیدہ ہو گئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ سید صاحبؒ ان کو اپنے ساتھ بریلی لے گئے اور مولانا اسماعیلؒ شہید کی تربیت میں دیدہ با۔

مولانا عبدالرحیمؒ صادق پوری لکھتے ہیں اور

”آپ جین قیام بریلی کے حضرت مولانا اسماعیل شہید کی جماعت میں بھرتی تھے۔ اور انہیں سے حدیث بھی پڑھا کرتے تھے۔ اور جب اپنی جماعت کے کام سے فرصت پاتے تو سید صاحبؒ کی صحبت میں جا بیٹھتے یا تنہا نماز و دعا میں مشغول رہتے۔ مولانا شہید نے اپنی جماعت میں آپ کو اپنا نائب مقرر کر دیا تھا مگر آپ کو اب اسوۂ حسنہ نبویؐ سے ایسا ذوق حاصل ہو چکا تھا کہ آپ اپنی جماعت

۱۸۴

والوں کی آپ خدمت کیا کرتے تھے (تذکرہ صادقہ ص ۱۱۱)

مولانا اسماعیل شہید ہی کی صحبت اور تعلیم و تربیت کا یہ فیض تھا کہ سنتوں پر براہ راست عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اور تقلیدی جکڑ بند یوں کی زنجیریں کٹ گئیں۔ اور بعد میں ان کی تبلیغی زندگی کا یہ ایک بڑا کارنامہ بنا۔ چنانچہ مولانا عبدالرحیم صادق پوری لکھتے ہیں:-

”آپ کی ترغیب تحصیل قرآن و احادیث اور وعظ و نصائح سے ملک ہندوستان میں عمل بالحدیث کا چرچا ہوا اور تقلید و تعصب کی ہاکمزور و مضحل ہونے لگی۔ کیونکہ قرآن و حدیث کی محبت اور ان کی ترویج نے حق کو روشن کر دیا جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ“ (تذکرہ صادقہ ص ۱۱۱)

مولانا مسعود عالم ندویؒ نے لکھا ہے کہ

”رو بدعت پر متعدد کتابیں شائع کیں۔ اور رب سے بڑھکر یہ کہ اپنے خاندان میں عمل بالسنت کی تجدید کی۔ صوبہ بہار اور بنگال میں نکاح بیوگان کا آغاز آپ ہی کے خاندان سے ہوا۔ اس سنت کو خوب جاری کیا، ہزاروں بیوہ عورتوں کے نکاح کرا دیئے۔۔۔۔۔ آپ کی ذات سے جو احیائے سنت ہوا اسکی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہیئے“

اس موقع پر مولانا ندویؒ نے چند سنتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ”ایک شخص عبدالغنی نگر نہسوی (جو زمرہ مساکین سے

تھے) کا عقد ایک بیوہ عورت سے تعلیم قرآن مہر قرار دے کر کر دیا۔ دہشتان کی پہلی اسلامی تحریک تھی یہ ایک ایسی بات ہے جو مولانا ولایت علی کے اہل حدیث ہونے کی صریح دلیل ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں کوئی حضفی مقلد اس سنت پر عمل کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کوئی حضفی عالم جس کو تقلید کا پاس ہو گا نکاح کی اس صورت کو صحیح کہے گا۔ مولانا مسعود عالم نے ان کی تبلیغی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

”دینیات کی تعلیم کے لئے گھر پر ظہر اور عصر کے درمیان قرآن و حدیث کا درس دیتے۔ آپ کے بڑے بیٹے مولوی عبداللہ (رحمۃ اللہ علیہ) قاری ہوتے دوسرے علماء تفسیر کی کتابیں ہاتھ میں لے کر بیٹھتے علماء کے علاوہ عام مزیدوں اور معتقدوں کی بڑی تعداد موجود ہوتی قرآن مجید اور بلوغ المرام کا لفظی ترجمہ مردوں عورتوں اور بچوں کو پڑھواتے۔ شاہ محمد اسحاق (رحمۃ اللہ علیہ) سے شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن اور مولانا شہید کے رسائل منگوا کر پہلے مطبع حسینی لکھنؤ میں طبع کرانے کی کوشش کی، مالک مطبع کے انکار پر آپ نے یہ خدمت اپنے ایک رفیق و عقیدتمند مولوی بدیع الزماں صاحب بردوانی کے سپرد کی جنہوں نے خاص طور پر ایک ٹائپ پرس خرید کر کے پہلی مرتبہ یہ کتابیں چھپوائیں نواب صدیق حسن خاں (رحمۃ اللہ علیہ) نے ان کے قنوج آنے اور وعظ کی تاثیر کا خاص طور پر ذکر کیا ہے..... لکھا ہے

کہ جامع مسجد قنوج میں چند جمعہ تک وعظ کیا۔ مجھ سے کہہ گئے کہ تم کتاب بلوغ المرام ضرور پڑھنا..... اس کہنے کا نتیجہ بعد ایک مدت دراز کے یہ ظاہر ہوا کہ میں نے بلوغ المرام کی شرح لکھی..... مولانا ولایت علی جب حج کو تشریف لے گئے تو اسی سلسلے میں یمن اور دوسرے مقامات کی سیاحت کی۔ اور یمن کے نامور محدث و عالم قاضی محمد بن علی شوکانی سے حدیث کی سند حاصل کی اور ان کی بعض تصانیف ساتھ لائے۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک

ان اقتباسات سے حسب ذیل چار باتیں معلوم ہوئیں
 (الف) عورتوں اور بچوں کو پڑھانے کے لئے قرآن مجید کے ترجمہ کے ساتھ "بلوغ المرام" کا انتخاب کیا۔ یعنی حدیث کی ایک ایسی مختصر کتاب جس میں بیشتر مسائل الہجریہ کے موافق اور حنفی مذہب کے خلاف ہیں اسی لئے مولوی محمد سبیل نے "شاندار ماضی" کا بیہیم طور پر صرف یہ لکھا ہے کہ قرآن و حدیث کا درس دیتے تھے۔ بلوغ المرام کا نام بتانے سے گریز کیا ہے۔

(ب) مولانا اسماعیل شہید راہجریہ کے رسائل منگوا کر چھپوایا اور ان کو شائع کیا۔

(ج) نواب صاحب کو ان کی نو عمری میں خاص طور سے بلوغ المرام پڑھنے کی نصیحت کی۔ اس نصیحت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے نواب

صاحب کو ایک عرصہ کے بعد اس کی شرح لکھنے کی توفیق بخشی۔ جس سے ایک طرف اگر حدیث کی خدمت ہوئی، تو دوسری طرف اہل حدیث مذہب کو بھی فی الجملہ قوت پہونچی۔

(د) امام شوکانی سے رجوع حنفی نہیں بلکہ سلفی محدث اور تقلید کے منکر و مخالف تھے، حدیث کی سند حاصل کی اور ان کی بعض تصانیف بھی اپنے ساتھ لائے۔ بعض تصانیف سے ”الدرر البہیہ“ مراد ہے جیسا کہ مولانا مسعود عالم ندوی نے حاشیہ میں اس کی وضاحت کر دی ہے اور لکھا ہے کہ ”الدرر البہیہ“ کا وہ نسخہ جو مولانا ولایت علی یمن سے ساتھ لائے تھے اب تک صادق پور میں محفوظ ہے اور راقم الحروف کی نظر سے گذر چکا ہے۔ — ”الدرر البہیہ“ کو کوئی حنفی عالم بھی پسند نہیں کر سکتا۔ یہ فقہ کی ایک ایسی کتاب ہے جس کے مسائل زیادہ تر اہل حدیث کے موافق اور خفیہ کے خلاف ہیں۔ اسی کے ساتھ اہل حدیث کے ایک خاص ”مہربان“ کی شہادت بھی سن لیجئے۔ مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں:-

”پٹنہ کے مولانا ولایت علی مرحوم معرکہ بالا کوٹ میں موجود نہ تھے۔ موصوف مولانا اسماعیل شہید کی اس جماعت کے خاص رکن تھے۔ جو مولانا شہید نے حجۃ اللہ پڑھنے کے بعد اس پر عمل کرنے والی ایک جماعت بنائی تھی یہ لوگ رنج یدین اور آمین بالجہر کیا کرتے۔“ (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک اشاعت دوم ص ۱۲۱)

بتلیئے اس شہادت کے بعد کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے اس بات کے ثبوت میں کہ مولانا ولایت علی علیہ الرحمۃ اہل حدیث تھے لیکن ان سب کے علاوہ ایک بڑا اور قوی ثبوت خود ان کی بعض تصانیف ہیں۔ ان کا ایک چھوٹا سا رسالہ ”عمل بالمحدیث“ ہے جو فارسی زبان میں ہے اور ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ تذکرہ صادقہ کے مصنف مولانا عبد الرحیم صادق پوریؒ کی ایک کتاب مجموعہ رسائل تسعہ کے نام سے شائع ہوئی ہے اس مجموعے میں مولانا ولایت علیؒ کے کئی رسائل شامل ہیں۔ انہیں میں یہ رسالہ ”عمل بالمحدیث“ اور ایک دوسرا رسالہ ”میسر الصلوٰۃ“ بھی ہے۔ انہی دونوں رسالوں کے کچھ اقتباس ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ جن سے اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ مولانا ولایت علیؒ مسلمان حنفی تھے یا اہلحدیث؟ رسالہ ”عمل بالمحدیث“ تو اس قابل ہے کہ پورا کا پورا یہاں نقل کر دیا جائے، لیکن اختصار کے خیال سے فی الحال ہم اس کی چند عبارتوں ہی کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اس رسالے کا سبب تالیف مولانا ہی کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں:-

مما بعد، چون کثرت سوال یاراں در	حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ چونکہ
اتباع احادیث و فقہ بریں فقیر وارد	حدیث اور فقہ کی پیروی کرنے کے باوجود
می گشت بدل گفتم کہ مختصرے یکبار	میں دوستوں کے سوالات اس فقیر کے
تحریر نمایم ہر سائلے عرض	پاس بکثرت آتے تھے اس لئے میں نے
دارم کہ رفع تکلیف بار بار و پیش	اپنے دل میں سوچا کہ ایک دفعہ ایک سالہ
دوستاں یادگار باشد،	مختصر سا لکھ دوں اور ہر پوچھنے والے کے

سامنے پیش کر دوں تاکہ بار بار کی تکلیف دو

ہو جائے اور دوستوں کے پاس یادگار رہے

اس رسالے میں تین تفصیلات ہیں پہلی فصل دین کی سمجھ کی خوبی اور فضیلت کے بیان میں، دوسری فصل تقلید کے محل جواز و عدم جواز کے بیان میں اور تیسری فصل قرآن اور حدیث کے سہل ہونے کے بیان میں۔ پہلی فصل میں تقویٰ الدین کی فضیلت اور اس کی حقیقت وغیرہ بیان کرنے کے بعد قرآن اور حدیث میں غور و فکر کرنے کے بارے میں لوگوں کے طرز عمل کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں

دیدن قرآن و حدیث و تامل در آن

بالکل موقوف نموند و ہر سخنے کہ در کتاب

نوشته بینند خواه موافق قرآن و حدیث

باشد خواه مخالف بے تکلف قائل آں می شوند

بعضے از ایشان قرآن و حدیث را مطلقاً نمی بینند

و بعضے اگر بی بینند بمعنی آں تا تامل نمی کنند

و بعضے اگر تا تامل می کنند فکر در نصائح

و اخبار قیامت و برزخ و ترک دنیا

و مثل آں می کنند اما استنباط احکام

احکام را مغرب غرض عنہا شمرده ہرگز قصد

تامل در آن نمی نمایند و اگر اچاناً

حکمی در قرآن و حدیث خلاف کتب

معتقد خود یا می یا بند۔ بعضے قرآن و حدیث را تاویل کردہ موافق از کتب

توفراغت حاصل ہو چکی ہے ہرگز اس میں تامل

ی نمایندہ دینی فہمند کہ مقصود اصلی اتباع قرآن و حدیث است، و بعضے ختم پوشی و گریز نیز ازاں مقام اختیار می کنند۔ از حال ایں جنیں فقہاء مجرب صادق خبر داده **رَأَتْ حَالِ فَقِيهِ غَيْرِ فَقِيهِ مَعَاذَ اللَّهِ** عن کل ذلک عیاذاً کثیراً۔

(۳۲)

کرنے کا ارادہ نہیں کرتے۔ اور اگر کبھی اپنے عقیدہ اور مذہب کی کتابوں کے خلاف قرآن و حدیث میں کوئی حکم پاتے ہیں تو بعض لوگ تو قرآن اور حدیث کے ظاہری معنی کو پھر چار کر اپنی کتابوں کے موافق کر لیتے ہیں اور اس کو نہیں سمجھتے کہ مقصود اصلی قرآن اور حدیث کی تابعداری ہے، اور بعض آدمی تو ایسے مقام سے بھاگتے اور نظر بچا کر کھل جانے کی راہ اختیار کرتے ہیں ایسے فقہاء کے حال سے مجرب صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے بوں خبر دی ہے کہ بہت سے فقہ کے حامل غیر فقیہ ہیں۔ ہم ان سب باتوں سے بار بار اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا ولایت علیؒ ایک ایسے عالم تھے جن کے نزدیک موجود مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کی پابندی ضروری تھی، اور جو اس بات کے قائل تھے کہ اب کسی اہل علم کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ قرآن اور حدیث سے شرعی احکام کا استنباط براہ راست کرے۔ اب تو ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ کسی معین امام کے اقوال و اجتہادات ہی کو اپنا دستور العمل بنائے اور انہی اقوال و اجتہادات کی روشنی میں قرآن و حدیث پر غور کرے۔ مولانا ولایت علیؒ تو اس ذہنیت سے ہر بار اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اور فرماتے ہیں معاذ اللہ عن کل ذلک عیاذاً کثیراً۔

فصل دوم میں لکھتے ہیں۔

باید دانست کہ انسان اگر عامی باشد جاننا چاہیے کہ جو آدمی ان پڑھ ہو اور
 و بسبب مشاغل دیگر از نوشت اپنے دوسرے مشاغل کی وجہ سے لکھنے
 و خواند دور ماند و اکتفا بر دریافت پڑھنے سے دور ہو اور علماء سے پوچھ
 از علماء نماید برائے آن مناسب لینے ہی پر اکتفا کرتا ہو تو اس کے لئے
 ایں است کہ از علماء محدثین و دیندار مناسب یہ ہے کہ علماء محدثین و دیندار
 کہ در دیانت و خوف خدا و الدنست سے جو دیانت اور خوف خدا میں، اور
 قرآن و حدیث مشہور شدہ باشند قرآن و حدیث کے جاننے میں مشہور ہوں
 سوال نمایند یاں طور کہ مارا دریں ان سے اس طرح سوال کرے کہ مجھے
 مسئلہ طور محمدی تعلیم نمایند اس مسئلہ کے بارے میں محمدی طریقہ

(ص ۳۳)

بتا سکیے

یہیجے! مولانا ولایت علیؒ ان پڑھ اور جاہل کے لئے بھی تقلید شخصی کو واجب
 نہیں کہتے۔ وہ اس کو یہ مشورہ بھی نہیں دیتے کہ مسئلہ پوچھنے کے لئے کسی ایسے عالم کے
 کے پاس جائے جو کسی خاص امام کے فتاویٰ اور مجتہدات کا ماہر ہو۔
 اور نہ یہ کہتے ہیں کہ اس کو کسی امام کا قول دریافت کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ کہتے
 ہیں کہ ان پڑھ بھی مسئلہ ایسے شخص سے پوچھے جو قرآن اور حدیث کا
 علم رکھنے میں مشہور ہو۔ اور اس سے بھی کسی فقہی مذہب کا طریقہ نہیں
 بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ دریافت کرے۔ اور قرآن و حدیث
 کی بات معلوم کرے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں :-

والگرم وطالب علم سنت و شوق تحصیل
علوم در دل دارد مناسب این صفت
کہ اول قرآن و حدیث بخواند
بعد ازاں بکتاب دیگر نظر
بمست گمارد تا آئینہ وار
ظاہر شود کہ رائے کدام
بزرگوار در کدام جا صواب
یافتہ و کجایار و خطا دیدہ
پس ہر مسئلہ کہ مصرح بقرآن
و حدیث یا بد در آن تہدینہ نہی
مجتہدین نکند کہ در مصراحت اجتہاد

اور اگر کوئی شخص علم کا طالب علم ہے اور
دل میں دینی علوم کی تحصیل کا شوق رکھتا ہے
تو اسکے لئے مناسب یہ ہے کہ پہلے قرآن
و حدیث پڑھے اسکے بعد دوسری کتابوں
پر نظر ڈالے تاکہ آئینہ کی طرح ظاہر ہو
جائے کہ کس بزرگ کی رائے نے کس
جگہ امر خفی کو پالیا ہے اور کہاں غلطی
ہوئی ہے۔ پس جو مسئلہ قرآن و حدیث
میں صاف صاف پادے اس میں کسی مجتہد
کی تقلید نہ کرے کیونکہ کھلے ہوئے
مسائل میں اجتہاد کو کچھ دخل نہیں

ہے۔

لا دخل نیست

بتائے اگر مولانا ولایت علی مقلد ہوتے اور تقلید کو ضروری جانتے تو طالب علم کو یہ کیسی شہ
دینے کہ اسکو پہلے قرآن اور حدیث پڑھنا چاہئے تاکہ مجتہدین کے خطا اور صواب کو پہچان سکے
چنانچہ آگے چل کر صاف لکھ دیا ہے

خلا اس اگر در کتب مجتہدین بر آید از ان چہ پیش
نمودہ درست آویز با قرآن و حدیث ضرورت
دگر نہ نسخ قرآن و حدیث از قول مجتہدین لازم
پرخاک مارنا ضروری چودہ مجتہدوں کے قول قرآن

خواہد آمد ۔ حدیث کا منسوخ ہونا لازم آئے گا ۔

مولانا دلائلیت علیٰ فرماتے ہیں ”بعضی نے یہ کہہ کر در خلائی حنفی مشہور شدن نیز از ضروریات دین سرت پس اگر مخالفت قول ابی حنیفہؒ نمودیم حنفیت نہ خواہد ماند ۔ یعنی بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خلائی میں حنفی مشہور ہونا بھی دین کی ضروری باتوں میں سے ہے ۔ اس لئے اگر ہم امام ابو حنیفہؒ کے قول کی مخالفت کریں گے تو حنفیت باقی نہ رہے گی ۔ اس کے بعد مولانا نے تفصیل جملہ اش باید فہمید اس کے جواب کی تفصیل سمجھنا چاہیے ۔ کہہ کر اس کا جواب دیا ہے ۔ جواب کے آخر میں لکھا ہے ”محققین را مقصود اتباع حق می شود نہ انتساب بہ مردمان“ ایسی تحقیق والوں کو حق کی پیروی مقصود ہوتی ہے نہ کہ لوگوں کی طرف منسوب ہونا ۔

مولانا بڑی جرات ایمانی کے ساتھ فرماتے ہیں ۔

اور انہیں وجہوں سے امام صاحب کے	وازمیں اسباب تلامذہ و دیگر علماء و
شاگرد اور دوسرے علماء بعض مقام میں	بعض مقام از مذہب ابی حنیفہ مختلف
امام ابو حنیفہؒ کے مذہب سے علحدہ ہو گئے	شدند و این مقلدان ہم وراں مقام
ہیں ۔ اور ان مقلدوں نے بھی ان مقامات	جانب علمائے دیگر اختیار کردہ اند و
میں دوسرے علماء کی جانب کو اختیار	تقلید نام را گذاشتند پس در بعض
کیا ہے اور امام کی تقلید کو چھوڑ دیا ہے	جا حنفی می شوند و بعض جا ابو یوسفی و
بعض جگہ حنفی ہوتے ہیں اور بعض جگہ	محمدی و جائے دیگر زفری و جائے
ابو یوسفی اور محمدی اور دوسری جگہ زفری	ابوالبیہ پس حنفیت ایشان کے

۱۹۴

اور کسی جگہ ابو الطیشی، انوار کی حنفیت کہا

باقی ماند ؟

باقی رہی ؟

بتائیے ! کسی حنفی مقلد کی گفتگو کے یہ تیود ہو سکتے ہیں ؟

یہ رسالہ ”عمل بالحدیث“ کے چند اقتباسات ہیں۔ اب رسالہ ”تدبیر العقولہ“ سے چند مسائل یہاں نقل کر دینا چاہتا ہوں جن سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا دلائی علی حنفی مقلد نہیں بلکہ عامل بالحدیث تھے۔ اس رسالہ میں الگ الگ فصل مقرر کر کے مسئلے بیان کئے گئے ہیں۔

”پانی کے بیان میں“ لکھتے ہیں۔

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الماء اذا كافت عاتین لم یحصل الخبث (ترجمہ) پانی جب ہوئے دو پیکھال تو نہ اٹھاوے نجاست کو مگر جب نجاست کی بویا رنگ یا مضر پانی میں پیدا ہوا پھر کتنا ہی پانی فریادہ ہوتا پاک ہے اس پانی کو بھلا چاہیے یہاں تک کہ نجاست کا رنگ دبو دمر جاتا رہے۔“

(ص ۵)

”طہارت کے بیان میں“ لکھتے ہیں

”غسل اور وضو کی نیت بدعت ہے ملاؤں نے بنائی ہے غضب تو یہ کیا کہ ہاتھ دھونے کی جدا اور منہ کی جدا۔ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ نیت دل سے علاقہ رکھتی ہے نہ منہ سے..... لڑکا جب تک دودھ پر رہے اس کے پیشاب کو دھنا ضرور نہیں۔ اگر لڑکی ہو تو ضرور ہے فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے انما یغسل من بول الا نقی وینفخ من بول الذکر (ترجمہ) دھویا جائے

پیشاب لڑکی کا اور پانی چھڑکا جاوے پیشاب پر لڑکے کے یعنی ایک چلو اٹھا کر اس پر مارا جاوے ۔

”فرض نماز کے بیان میں“ جو فصل مقرر کی ہے اس کے ذیل میں مسافر کے لئے جمع تقدیم اور جمع تاخیر و دنوں صورتوں کو جائز بتایا ہے۔ بلکہ احناف پر ہجرت تمام کرنے کے لئے یہ بھی لکھا ہے کہ ”شیخ عمر جوہنے میں نفی مذہب کے سفتی اور پیشوائے انہوں نے سفر میں جمع کا فتویٰ بھی دیا ہے۔ اور وہ فتویٰ ہندوستان میں دہراد اور مشہور ہوا (ص ۸۲)

اسی فعل میں یہ مسئلہ بھی لکھا ہے کہ جس کا لڑکا گورے نہ اترے اس لڑکے لئے نماز پڑھنی درست ہے۔ اور اس کی دلیل میں وہ حدیث نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی امامت کرتے تھے اس حال میں کہ اپنی نواسی اُمّہ بنت ابوالعاس کو اپنے کندھے پر بٹھائے رکھتے۔ جب رکوع رادر سجدہ میں جاتے تو اتار دیتے اور جب سجدہ سے اُٹھتے تو پھر اُمّہ کو اپنے کندھے پر بٹھا لیتے۔

حاشیہ میں لکھا ہے ”و در مفتاح الصلوٰۃ آورده کہ گھر گن بچہ ہمراہ اور باشند کہ وہن ملو بستہ باشند نماز جائز است پس باز بچہ آدم بچہ سگ بہتر نیست“ یعنی (حنفی مذہب کی کتاب مفتاح الصلوٰۃ میں لایا گیا ہے کہ اگر کتے کا بچہ جس کا منہ باندھ دیا گیا ہو نمازی کے ہمراہ ہو تو اسکی نماز جائز ہے (مولانا فرماتے ہیں) پس باز بچہ آدم بچہ سگ بہتر نیست یعنی آدمی کے بچہ سے کتے کا بچہ بہتر نہیں ہے (جب کہ کتے کے بچہ کو ساتھ لیکر نماز پڑھنا

جائز ہے تو آدمی کے بچہ کو گود میں لیکر نماز کیوں جائز نہیں ہوگی؟
 حنفیہ جنازہ کی نماز میں سورہ فاتحہ کی تلاوت کے قائل نہیں ہیں لیکن
 مولانا ولایت علیؒ نے اس رسالہ میں نماز جنازہ کی جو ترکیب لکھی ہے اس
 میں بتایا ہے کہ دعائے بعد الحمد کی سورہ پڑھے اس کی دلیل میں حدیث
 پیش کی ہے۔ اسی طرح حنفیہ غائبانہ جنازہ پڑھنے کے بھی قائل نہیں ہیں۔
 اور جب مردہ دفن ہو جائے تو اس کی قبر پر جاکر نماز جنازہ پڑھنے کے لئے
 چند قیود اور شرطیں بیان کرتے ہیں۔ مگر مولانا کسی شرط و قید کے بغیر ان دونوں
 باتوں کے قائل ہیں۔ لکھتے ہیں:-

اور جو مردہ دفن ہو چکا ہے تو نماز اس کی قبر پر جاکر پڑھے اور جو
 کوئی ایک بھی مسلمان قبر پر کسی طرح حاضر نہ ہو سکے تو نماز اس کی
 دور ہی سے پڑھ لے (ص ۷۷)

ان تصریحات کی روشنی میں کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا ولایت علیؒ مسلک
 فقہی کے اعتبار سے اہل حدیث نہیں، حنفی تھے۔

”تذکرہ صادق“ کی بعض عبارتوں کی بنا پر مولانا
 ایک شبہ اور اس کا
 جواب

شبہ کا بھی ازالہ کر دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ”تذکرہ صادق“ کی پوری بات سامنے ہو تو شبہ
 آپ سے آپ دور ہو جائیگا۔

”تذکرہ صادقہ کے مولف لکھتے ہیں۔“

”آپ کی ترغیب تحصیل قرآن و احادیث امد و عطا و نفع سے ملک
ہندوستان میں عمل بالحدیث کا چرچہ ہوا اور تقلید و تعصب کی بنا
کمزور و مٹا دیا۔ کیونکہ قرآن و حدیث کی محبت و دان کی
ترویج نے حق کو روشن کر دیا جہل و حق الباطل۔ اور آپ
کے مریدان مسائل حنفیہ پر جب تک وہ کسی حدیث صریح غیر
منسوخ کے مخالف نہ ہوتے عمل کرتے۔ کیونکہ سارے عمل کا خلاصہ
اللہ کی خوشنودی کا ڈھونڈنا ہے نہ کہ اختلاف پیدا کرنا۔ اگر یغرن
پیش نظر رہے تو یہ اختلاف خود خشک اور ڈھیلی پڑ جائے گا۔“

فرمائیے! یہ کیسے حنفی اور مقلد تھے جن کے دعوے اور نفع اور قرآن و حدیث
کی تحصیل کی ترغیب سے تقلید کی بنیادیں ہل گئیں۔ اور ہندوستان میں بلا و رستا
حدیث پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ مذکورہ بالا اقتباس پر غور کیجئے۔ اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اور ان کے عقیدتمندوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حنفی مذہب
کے مسائل کو قرآن اور حدیث پر پیش کرتے تھے۔ جو مسائل قرآن اور حدیث
کے خلاف معلوم ہوتے ان کو چھوڑ دیتے اور جو موافق ہوتے ان کو مان لیتے۔
بس یہی جو اہل حدیث کا مذہب۔ اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد اگر کوئی
شخص اپنے آپ کو اہل حدیث کہلوانے کے بجائے حنفی کہلوانا پسند کرتا ہے
تو کرے ہمیں اس پر اعتراض نہیں ہے۔ اخاف کیساتھ ہمارا حقیقی اختلاف
نام کا نہیں ہے بلکہ اصول کا ہے۔ نام کا اختلاف تو محض ظاہری اور تعارفی ہے۔

مولانا ولایت علیؒ کس اعتبار سے اپنے کو حنفی کہتے تھے اس کی وضاحت کے لئے ایک مناظرہ کا واقعہ یہاں قابل ذکر ہے۔

مولانا عبدالرحیم مولفؒ "تذکرہ صادقہ" لکھتے ہیں:

"اس مدت حق کی روز افزوں ترقی اور اشاعت قرآن و احادیث و یکھکر کوتاہ ہیں لوگوں نے مولوی محمد فصیح صاحب غازی پوری کو دوشیزا انعام کے وعدہ پر علماء حق سے مناظرہ کرنے کے لئے مدعو کیا مناظرہ کے دن مولوی ولایت علی صاحب نے مولوی محمد فصیح کی سائلہ ہمراہیوں کے دعوت کی۔ بہت سے علماء اور فضلاء اور خاص و عام جمع ہوئے مگر مولانا (ولایت علیؒ) نے مولوی محمد فصیح صاحب کو ملحد کمرہ میں ایجا کر دیکھو مکہ مجلس عام میں گفتگو ہونے سے انسان حق کے قبول کرنے سے شرم کرتا ہے اور اصرار پیدا نہ ہوتا ہے) بجا خری چند اشخاص ان سے فرمایا کہ میں حنفی المذہب ہوں مامد یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ اگر کوئی حنفی کسی حدیث صریح غیر منسوخ کو دیکھ کر کسی مسئلہ فقہی کے خلاف عمل کرے تو وہ مذہب حنفی سے خارج نہیں ہوتا بغضاًئے قول امام علیہ الرحمۃ "اتروا قوطی بخبر الرسول"۔ دوسرے قول کو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں ترک کر دو) یہ کلمہ مناظر صاحب کے فہم عالی میں آگیا اور انھوں نے حق کی طرف داری کرتے ہوئے مجمع عام میں باوازا بلند فرمایا کہ یہ جماعت حق پر ہے۔ احادیث الرسول پر عامل ہونے سے

کوئی شخص حنفیت سے خارج نہیں ہوتا۔ ہمارا اور ان کا مسلک ایک ہے۔ اس روز جلسہ برخواست ہو گیا۔ مگر حجب مناظر صاحب اپنے قیام گاہ محلہ لودیکڑو واپس گئے تو ان کے مریدوں نے اور بن لوگوں نے ان کو دعوت دی تھی سخت فخل اور شرمندہ کیا۔ اور آپ کو دوبارہ برسر عام بحث کرنے پر مجبور کیا اور چند دیگر علماء خصوصاً مولوی اعظم الحق صاحب کو ان کی تائید کے لئے مقرر کیا۔ چنانچہ مولوی محمد فیصیح صاحب مع سعادین بحث کے لئے مولوی الہی بخش صاحب کے مکان پر تشریف لائے۔ مولانا ولایت علی صاحب نے بحث کے لئے مولوی فیاض علی صاحب کو اور ان کی اعانت کے لئے مولوی حکیم ارادت حسین صاحب کو بھیج دیا۔ حکیم صاحب کتابیں کھول کھول کر مقامات بحث عنہ دکھاتے جاتے۔ اس مرتبہ بھی مولوی محمد فیصیح صاحب نے اعتراف حق کیا مگر اس با ضرورت مباحثہ بالا اختصار قلمبند کر کے مناظر مولوی محمد فیصیح صاحب غازی پوری سے اقرار و تخطی کر لئے گئے۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ پابند مذہب حنفی اگر بوجہ تریج بالدلیل کسی حدیث صحیحہ غیر منوٰخ پر مثل رفع یدین۔ آمین بالجہر وغیرہ کے عمل کرے تو وہ اپنے امام کے اتباع سے خارج نہیں ہوتا۔ (تذکرہ صادقہ ص ۱۱۹)

دیکھیے مولانا ولایت علیؒ اپنے کو حنفی المذہب سے لے نہیں کہتے کہ ان کے نزدیک فقہ حنفی کے سب مسائل حق ہیں۔ اور نہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان مسائل کو

اب قرآن و حدیث سے جانچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف اس اعتبار سے اپنے کو حنفی المذہب کہتے ہیں کہ حدیثوں پر ان کا عمل امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کے اس ارشاد کے مطابق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مقابلہ میں میرا قول چھوڑ دو اور حدیث پر عمل کرو۔ حتیٰ کہ وہ علماء جن کو انھوں نے مولوی محمد فصیح صاحب غازی پوری حنفی کے مقابلے میں مناظرہ کے لئے بھیجا تھا انھوں نے رفیع بدین اور آمین بالجہر تک کو اسی اصول کے ماتحت صحیح ہونا منوالیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ مولانا ولایت علی بھی اسی کے قائل تھے۔ کیونکہ یہ علماء مولانا ولایت علی ہی کی طرف سے گئے تھے اور جو کچھ گفتگو انھوں نے کی وہ مولانا کی نیابت اور وکالت میں کی۔ یہ دونوں مولانا کے عزیز اور ان کی تعلیم و تربیت سے خاص طور پر فیض یافتہ تھے۔

الحاصل اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مولانا ولایت علی عقیدہ اور مسلک کے اعتبار سے اہلحدیث ہی تھے مگر چونکہ مجاہد مبلغ اور داعی تھے اور ان کے نزدیک تحریک جہاد کے ساتھ ساتھ ان مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کا اہم کام مقدم تھا جو طرح طرح کی بدعات و خرافات کے علاوہ شرکیہ مراسم تک کی گندگیوں میں مبتلا تھے اور ان کے دل و دماغ پر جاہل پیروں اور دنیا پرست مولویوں کا قبضہ تھا جو اپنے فانی اغراض کی خاطر نام کے بہانے فتنہ برپا کرتے جیسا کہ بعد میں ہوا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ اَدْعَاۤیَ سَبِّیْہِ بِرَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ رَاۤیَہُ رَبُّکَ الْمُنْتَرِ

کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ، کے مطابق مولانا نے نام کی بحث میں الجھنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ ورنہ آخر یکبارہ بات ہے کہ خود مولانا یا ان کے صحبت یافتہ بزرگوں کے قدم جہاں جہاں پہنچے ہر جگہ انہیں سنتوں کا احیاء اور رواج ہوا جن کے اہلحدیث قائل ہیں۔ اور حقیقت کے بجائے اہلحدیثیت کو فروغ ہوا۔ گادوں کے گادوں اور علاقے کے علاقے اہلحدیث ہو گئے جیسا کہ آئندہ صفحات میں اس کا ذکر آئے گا۔

مولانا ولایت علیؒ کے خاندان اور
دوسرے اقرباء کا مسلک لکھتے ہیں :-

”مولانا رائے بریلی میں تربیت پا کر وطن گئے تو زندگی کا ایک ایک لمحہ وعظ و تبلیغ کے لئے وقف کر دیا۔ انہیں کی کوشش سے ان کا خاندان اور دوسرے اعزہ و اقربا سید صاحب سے وابستہ ہوئے۔ مثلاً مولانا کے والد مولوی فتح علی، ان کے بھائی مولانا غنی علی، مولانا طالب علی اور مولانا فرحت حسین۔ ان کے اقربا میں سے مولانا شاہ محمد حسین، مولوی الہی بخش، مولانا احمد العہ، مولانا نجی علی، مولانا فیاض علی، مولوی قمر الدین، مولوی باقر علی، غرض ان سے تعلق رکھنے والوں میں ایک بھی فرد ایسا باقی نہ رہا جس نے سید صاحب کی ارادت کا حلقہ اپنی گردن میں نہ ڈال لیا ہو، اور ان حضرات کی قربانیاں تاریخ مجاہدین کا نہایت شاندار اور

درخشاں باب ہیں : (سرگزشت مجاہدین ص ۲۲۵)

جب دلائل اور شواہد سے وضاحت کے ساتھ یہ ثابت ہو گیا کہ مولانا ولایت علی اہل حدیث تھے تو اب اسی سلسلے میں ہم چاہتے ہیں کہ مولانا موصوف کے خاندان اور دوسرے اعزہ و اقرباء کے مسلک کے متعلق بھی بات صاف ہو جائے۔ کیونکہ بقول مہر صاحب ان حضرات کی قربانیاں بھی تاریخ مجاہدین کا نہایت شاندار اور درخشاں باب ہیں۔

ابھی اوپر سرگزشت مجاہدین کے حوالے سے جو اقتباس پیش کیا گیا اس میں مولانا عنایت علی کا ذکر بھی ہے۔ یہ مولانا ولایت علی کے منجملے ہیں۔ ان کو مولانا ولایت علی نے بنگال کے خط میں تبلیغ و ہدایت کے لئے مقرر فرمایا ان کے حالات میں لکھا ہے کہ:-

آپ نے بار اول مسلسل سات برس اس خط میں قریہ تقریبہ نہایت جانفشانی اور حلم کے ساتھ گشت فرمایا۔ لاکھوں خلقت کو قعر ظلمت سے نکال کر شمع ہدایت کا گرویدہ کر دیا۔ اور قرآن و احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی طرف توجہ دلایا۔ جناب کے مہتر شہین اوہان کی اولاد آج تک خط بنگال میں محمدی کے لقب سے ممتاز ہیں۔ (تذکرہ صادقہ ص ۱۳۳)

اہل حدیث ہی کا دوسرا نام "محمدی" بھی ہے۔ سید احمد شہیدؒ کی جماعت میں جو گروہ مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کی زیر تربیت تھا وہ محمدی کہلاتا تھا۔ چنانچہ ایک انگریز نے سید صاحب کی جماعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ:-

۲۰۳

دو مختلف اور متضاد گروہوں سے مرکب تھی جنہیں متحد رکھنے میں وہ
(یعنی سید صاحب) مدت العمر سعی رہے۔ ان میں سے ایک گروہ کے
سردار مولوی عبدالحی اور مولوی کرامت علی جو پوری تھے جو اہل سنت
کا طریقہ رکھتے تھے۔ اور دوسرے گروہ کے سردار مولوی اسماعیل تھے جو چاروں
اماموں کی تقلید سے آزاو تھے اور براہ راست حدیث کو اپنا ماخذ
قرار دیتے تھے۔ خود سید احمد صاحب عمل کے اعتبار سے خفی تھے مگر
اوسی کے ساتھ مولوی اسماعیل صاحب کی جماعت کی سرپرستی کرتے تھے
جو اپنے کو محمدی کہتے تھے۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۰۷)

مولانا شاعر اللہ صاحب امرتسری مرحوم کو کون نہیں جانتا کہ وہ پنجاب سے نکل کر
دوسرے مقامات کے جلسوں اور مناظروں میں بھی تشریف لیجا یا کرتے تھے۔ ۲۵
اپریل ۱۹۱۲ء کے اخبار ”الہجریٹ“ میں بنگالہ کے اپنے ایک سفر کا کچھ حال شائع
کیا ہے ضلع دمکا اور ضلع مرشد آباد کے متعدد گھاؤں مثلاً دلال پور، اسلام پور،
جنگی پور، سورج نرائن پور وغیرہ میں جانے کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے اسی سلسلے
میں لکھتے ہیں:-

”اس کے علاوہ میں اس سفر میں یہ بات بھی سوچتا رہا کہ بنگالہ میں اہلحدیث
جماعت کی اتنی کثرت کیسے اور کس ذریعہ سے ہوئی؟ تو مجھے بتلایا گیا
کہ جناب مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی صاحبان کی یہ برکت

ہے۔“ (الہجریٹ جلد دہم ص ۲۶)

ان شواہد کے بعد کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے اس بات کے ثبوت میں کہ مولانا غلامی

مسک اہل حدیث تھے۔

○ مولانا ولایت علیؒ کے ایک خاص عزیز اور خلیفہ مولانا فیاض علیؒ تھے۔ مولانا ولایت علیؒ کے مسلک کے بارے میں گفتگو کے سلسلے میں مولوی محمد فیض صاحب غازی پوری حنفی کے ساتھ مناظرہ کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس میں گذر چکا ہے کہ مناظرہ بھی مولانا فیاض علیؒ تھے جنہوں نے حنفی مناظرے پر اقرار کر لیا کہ ”حنفی مذہب کا پابند اگر بوجہ ترجیح بالدلیل کسی حدیث صحیحہ غیر منسوخ پر مثل نفع یدین آئین بالجہر وغیرہ کے عمل کرے تو وہ اپنے امام کی اتباع سے خارج نہیں ہوتا۔“ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فیاض علیؒ کے نزدیک یہ مسائل حدیث صحیحہ غیر منسوخ سے ثابت ہیں۔ اور دلیل کی رو سے انہیں پر عمل کرنا راجح ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک نزاعی مسائل کو دلیل سے جانچنا چاہئے کہ کون راجح ہے اور کون مرجوح، کون قوی ہے اور کون ضعیف۔ اور ایسا کرنے والا حنفی مذہب سے خارج نہیں ہوگا۔

ابجدیث بھی یہی کہتے ہیں کہ آج جو لوگ تقلید شخصی کو واجب کہتے ہیں اور اپنے آپ کو امام ابو حنیفہؒ کا مقلد بتاتے ہیں، وہ درحقیقت امام صاحب کے پورے اور سچے مقلد نہیں ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں نے امام صاحب کے قول اتکو اقوالی بخبر الرسول حدیث رسولؐ کے مقابلہ میں میرا قول چھوڑ دو اور اذا صح الحدیث فهو مذہبی وجب صحیح حدیث سے کوئی بات ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ پس اصول کو ماننے والا اور عملاً اس کو برتنے والا اگر اپنے کو حنفی کہتا ہے تو کہے حقیقتہً وہ اہل حدیث ہے۔

اس کے علاوہ مولانا فیاض علیؒ کے اہلحدیث ہونے کا ایک بڑا ثبوت ان کا رسالہ فیض الغیوض ہے۔ یہ رسالہ بھی مجموعہ مسائل تسعہ میں (جس کا ذکر گذشتہ نمبر میں آچکا ہے) شامل ہے۔ اصل رسالہ فارسی زبان میں ہے اس کا ترجمہ مولوی الہی بخش صاحب بہاریؒ نے کیا ہے اسی ترجمہ کے ساتھ یہ رسالہ شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ مجموعہ رسائل تسعہ کے ص ۱۱۱ سے شروع ہو کر ص ۱۳۲ پر ختم ہوا ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک تمام باتیں تقلید اور عمل بالحدیث ہی کے متعلق سوال اور جواب کے عنوان سے بیان کی گئی ہیں۔ اس کا ایک ایک حرف اہل حدیث مذہب کے مطابق ہے۔ آتنا ہی نہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس میں بڑی بصیرت کے ساتھ بہترین انداز میں اہلحدیث مذہب کی پوری پوری ترجمانی کی گئی ہے سوالات کے جواب میں حسب موقع آیت اور حدیث کے علاوہ تائید کے لئے بکثرت علمائے سلف کے اقوال بھی نقل کئے گئے ہیں۔ مختصر طور پر کچھ اقتباسات ہم یہاں پیش کرتے ہیں:-

سوال از علمائے ربانین و فقہائے	علمائے ربانین و فقہاء را سخین سے
را سخین کسے کہ بدرجہ اجتہاد زریبہ	سوال ہے کہ جو شخص اجتہاد کے درجہ
است خواہ عالم باشد خواہ عامی عمل	پر نہیں پہنچا ہو خواہ وہ عالم ہو یا
بر حدیث نمودن اور اجازت است	جاہل اس کو حدیث پر عمل کرنا جائز
یا نہ مبنیوار تو جروا۔	ہے یا نہیں؟

جواب الحکم للہ و هو الحکم الحاکمین	جواب۔ حکم اللہ ہی کے لئے ہے اور وہ
------------------------------------	------------------------------------

عالمیکہ بناویل عبارت عارف است
 و ناسخ را از منسوخ می فهمد و صحیح را از
 ضعیف می شناسد و برکت متداوله
 محدثین قدرت می دارد عمل بر حدیث
 نمودن اورا جائز است باتفاق امام
 اعظم و صاحبیه رحمہم اللہ تعالیٰ ،
 اما کسی کہ عامی باشد عمل بر حدیث
 نمودن اورا ہم واجب است نزد
 امام اعظم و محمدؐ خلفا لابانی یوسف

 سوال : تابع مجتہدے را اگر حدیثی
 صحیح صریح غیر منسوخ مخالف قول امام
 خود رسد عمل بر حدیث نماید یا بر
 قول امام ؟ و اگر بر قول امام کند و
 حدیث را ترک سازد حال او عند اللہ
 چیست ؟ بیان کنید این مسئلہ را از اقوال
 سبب حاکموں سے بڑا حاکم ہے جو عالم
 کہ عبارت کا مطلب بیان کرنا جانتا
 ہے ، اور ناسخ کو منسوخ سے امتیاز
 کرنا پہچانتا ہے اور صحیح کو ضعیف
 سے جدا کرتا ہے اور محدثین کی متداول
 کتابوں کے سمجھنے کی قدرت رکھتا ہے
 اس کو حدیث پر عمل کرنا جائز ہے
 اس پر اتفاق ہے امام اعظمؒ ابو حنیفہؒ
 اور ان کے دونوں شاگرد امام ابو یوسفؒ
 و امام محمدؒ کا لیکن وہ شخص جو عامی (رجل)
 ہے سوا اسکو بھی حدیث پر عمل کرنا واجب ہے
 امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک امام
 ابو یوسفؒ اس کے خلاف ہیں
 سوال :- ایک شخص ایک مجتہد کا مقلد ہو
 اگر اسکو کوئی ایسی صحیح صریح غیر منسوخ حدیث
 ملے جو اس کے امام کے قول کے مخالف ہو تو
 اس کو اپنے امام کے قول پر عمل کرنا چاہیے
 یا اس حدیث پر ؟ اگر وہ اپنے امام کے
 قول پر عمل کرے اور حدیث کو چھوڑ دے
 تو اسکا حال اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا ہوگا ؟

فقہائے عظام دھونیائے کرام بتوفیق
 اللہ الملک العلّام
 جواب: وقتیکہ کسے حدیث صحیح صریح
 غیر منسوخ یا بدعمل بر حدیث نمودن
 اور واجب است بلکہ از عبارت
 پدایہ وغایتہ البیان و بحر الرائق و در مختار
 و عنایہ وغیرہ کہ بالاندک و لاندک مفہوم
 می شود کہ اگر حدیث صریح ہم نباشد
 بلکہ احتمال تاویل یا نسخ داشته باشد
 و اطلاع بر تاویل و نسخ آن نشود آن
 وقت ہم غیر مجتہد را عمل بر ظاہر آن
 حدیث کردن واجب است و
 استفسار از کرام مفتی و مجتہد لازم
 نیست نزدیک امام اعظم و محمد رحمہما
 و نزدیک ابی یوسف نیز وقتیکہ عامی جاہل
 محض نباشد ہمیں حکم است و ہر کہ
 حدیث یا آیت معارض قول امام خود را
 ترک سازد و عمل بر قول امام خود کند
 شیخ اکبر محی الدین ابن العربی رضی اللہ عنہ
 اس سلسلہ کو فقہاء اور صوفیاء کے اقوال
 سے بیان کیجئے۔
 جب کوئی شخص حدیث صحیحہ غیر منسوخ پاوے
 تو اسکو اس حدیث پر عمل کرنا واجب ہے
 بلکہ ہدایہ وغایتہ البیان و بحر الرائق و در مختار
 و عنایہ وغیرہ کی جو عبارت اور پر مذکور ہوئی
 اس سے سمجھا جاتا ہے کہ اگر حدیث صریح بھی نہ
 ہو بلکہ احتمال تاویل یا نسخ کا رکھتی ہو اور
 اسکی تاویل اور نسخ پر اطلاع نہ ہو تو قوت
 بھی غیر مجتہد کو اس نط پر حدیث
 پر عمل کرنا واجب ہے اور کسی مجتہد اور مفتی
 سے پوچھنا لازم نہیں ہے نزدیک امام
 اعظم اور امام محمد رحمہما۔ اور امام ابی یوسف
 کے نزدیک بھی جس وقت کہ عامی جاہل محض
 نہ ہو یہی حکم ہے۔ اور جو شخص کہ اس حدیث
 یا آیت کو جو اس کے امام کے قول کے مخالف
 ہے ترک کر دے اور اپنے امام ہی کے قول
 پر عمل کرے اس کی نسبت شیخ محی الدین
 ابن العربی رضی اللہ عنہ جو علمائے

لہ یہ عبارتیں اس رسالہ میں مذکور ہیں یہاں ہم نے اختصار کے خیال سے ان کو نقل نہیں کیا ہے ۱۲ رحمانی

کہ از علمائے ابرار و امام صوفیائے ابرار اور صوفیائے کبار میں سے
کبار است آنکس را در کتاب فتوحات ہیں کتاب فتوحات مکیہ میں
مکیہ گمراہ و خارج از دین خدا و شریعت فرماتے ہیں کہ وہ شخص گمراہ اور خدا
است کے دین سے خارج ہے

اس سلسلے میں مولانا فیاض علیؒ نے تقلید کی مذمت اور مخالفت کے
بارے میں بہت سی کتابوں کی عبارتیں اور علمائے سلف کے اقوال کثرت سے نقل
کئے ہیں مثلاً لکھتے ہیں :-

وقال الشيخ الكردی فی رسالته اور شیخ کردریؒ نے اپنے رسالہ میں
ان طریقة المشائخ الصوفیة فرمایا ہے کہ سنت کی اتباع کرنا ہی مشائخ
عموماً و طریقة الاکابر النقشبندیة صوفیہ کا عموماً اور اکابر نقشبندیہ کا
خصوصاً اتباع السنة النبویة خصوصاً طریقہ ہے۔ ان کا طریقہ کسی معین
و عدم التقید بمذہب معین مذہب کی پابندی نہیں ہے اور
اد قول عالم صدق محقق و لیس کسی سچے محقق عالم کی تقلید ان
التعصب بمذہب معین من کا شیوہ ہے اور مذہب معین پر تعصب
اداب القوم و اخلاقهم انتہی کرنا آداب و اخلاق صوفیہ سے خارج ہے

کتبہام فقہائے عظام و صوفیائے کل فقہائے عظام اور صوفیائے کرام
کرام ازیں معنی مملو و مشحون است کی کتابیں اس مضمون سے بھری پڑی
اگر ہمہ را ذکر کنم یک بار شتر گردو ہیں اگر ہم ان سب کو ذکر کریں تو ایک اونٹ کا

قال الشيخ عبد الوهاب الشعاني في
اليواقيت والجواهر روى عن أبي حنيفة
انه كان يقول لا ينبغي لمن لم يعرف
دليل ان يفتي بكلامى وكان الامام مالك
يقول ما من احد الا وما خذ من كلامه
ومردود عليه الا رسول الله صلى الله
عليه وسلم وروى المحاكم البهقي
عن الشافعي انه كان يقول اذا
صح الحديث فهو مذاهبى وفي رواية
اذا رأيتكم كلامى يخالف الحديث
فاعملوا بالحديث واضربوا بكلامى
الحائط وكان الامام احمد يقول
ليس لاحد مع الله وسوله كلام
لا تقلدنى ولا تقلد من انا ولا الازد
ولا الفخى ولا غيرهم وخذ الاحكام
من حيث اخذها من الكتاب و
السنة انتهى

وقال السيوطى في كتابه السرد على
من اخذ الى الامرض معزياً الى

بوجہ ہو جا۔ شیخ عبد الوہاب شہرانی یواقیت
والجواہر میں لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ
فرماتے تھے کہ جو شخص میری دلیل کو نہیں
جانتا اس کو لاکھ نہیں ہے کہ میرے قول پر
فقوی رہے۔ اور امام مالک فرماتے تھے
کہ کوئی شخص نہیں ہے مگر اس کا قول لیا بھی جاتا
ہے اور رد بھی کر دیا جاتا ہے رسول اللہ صلی
علیہ وسلم کے حاکم اور تبعی نے امام شافعی سے
روایت کیا ہے کہ وہ کہتے تھے جب حدیث صحیح
ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ اور کیا طاعت
میں ہے کہ جب میرے کلام کو حدیث کے خلاف
دیکھو تو حدیث پر عمل کرو اور میرے کلام کو
دیار پر مار دو۔ اور امام احمد فرماتے تھے
کہ اللہ اور رسول کے ساتھ کسی کے کلام کو وزن
نہیں کیا جاتا۔ ہرگز میری تقلید نہ کرنا اور
نہ مالک کی نہ اوزاعی کی نہ شافعی کی نہ
ان کے علاوہ کسی اور کی۔ بلکہ تم بھی احکام آپ سے
لو جہاں سے ان لوگوں نے لیا ہے یعنی کتاب اور
سنت سے۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ کیا امام

کتاب التلخیص هل اباح مالک و ابو حنیفۃ کما انشأ فی قط لحد تقلیدہم
 حاشا للہ من هذا بل انہم قد ہوا
 عن ذلك ومنعوا منه ولم یفسحوا
 فیہ انتھی و فی روضة العلماء عن
 الامام ابی حنیفۃ اترکوا قولی بخیر
 الرسول و خیر الصحابة
 وقدوة المحمدين ابن حزم
 ابن حنبل تقلید را کہ حدیث صحیح را
 مترک و ساز و بر مسائل قیاسیہ امام
 خود عمل نہاید حرام نوشتہ حیث قال
 فی کتاب النہد الکافیۃ فی علم الاصول
 التقلید حرام ولا یجوز لاحد ان
 یاخذ قول احد غیر رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم بل یبطل
 مولانا فیاض علی نے اسی جواب کے ذیل میں اپنی تائید میں شاہ ولی اللہ صاحب
 اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی کتابوں سے بھی عبارتیں نقل کی ہیں۔ آخر میں
 مولانا اسماعیل شہید کی ایک عبارت بڑی عقیدت سے پیش کی ہے
 لکھتے ہیں :-

و محدث اکل، فقیہ بے بدل، عالم
 باعمل، واصل الی اللہ، شہید
 فی سبیل اللہ، حضرت مولانا اسماعیل
 علیہ الرحمۃ در کتاب صراط مستقیم
 نوشتہ کہ در اعمال اتباع مذاہب
 اربعہ کہ رائج در تمام اہل اسلام
 است بہتر و خوب است لیکن
 علم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را منحصر
 در علم یک شخص از مجتہدین نداند
 بلکہ علم نبوی منتشر در آفاق گرویدہ
 است بموجب مقتضیات وقت
 بہر کسی رسیدہ و بعد آں کہ کتب مصنف
 شدہ جمعیت آں علوم ظاہر گشتہ پس
 در ہر مسئلہ کہ حدیث صحیح صریح غیر
 منسوخ یا بد اتباع پیچ مجتہدہ را
 نمکند و اہل حدیث را مقتدائے خود
 شناسد و بدل محبت ایساں دارد
 و تعظیم ایساں لازم شمرد کہ حاملان
 علم پیغمبر اند و بنوعی فائدہ مصابحت

و محدث اکل، فقیہ بے بدل، عالم
 باعمل، واصل الی اللہ، شہید
 فی سبیل اللہ، حضرت مولانا اسماعیل
 علیہ الرحمۃ در کتاب صراط مستقیم
 نوشتہ کہ در اعمال اتباع مذاہب
 اربعہ کہ رائج در تمام اہل اسلام
 است بہتر و خوب است لیکن
 علم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را منحصر
 در علم یک شخص از مجتہدین نداند
 بلکہ علم نبوی منتشر در آفاق گرویدہ
 است بموجب مقتضیات وقت
 بہر کسی رسیدہ و بعد آں کہ کتب مصنف
 شدہ جمعیت آں علوم ظاہر گشتہ پس
 در ہر مسئلہ کہ حدیث صحیح صریح غیر
 منسوخ یا بد اتباع پیچ مجتہدہ را
 نمکند و اہل حدیث را مقتدائے خود
 شناسد و بدل محبت ایساں دارد
 و تعظیم ایساں لازم شمرد کہ حاملان
 علم پیغمبر اند و بنوعی فائدہ مصابحت

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

لا واجب الا ما اوجبه الله تعالى واجب وہی ہے جس کو اللہ نے واجب
 وله الحكم ولم يوجب على احد كذا کیا ہے کیونکہ وہی حاکم ہے اور اللہ نے
 ان يمتدھب بمتدھب رجل من کسی پر واجب نہیں کیا ہے کہ وہ
 الائمة فاي مجابهة تشريع جديد اماموں میں سے کسی امام کے مذہب کو
 اپنا مذہب بنائے لہذا اس بات کو واجب
 قرار دینا ایک نئی شریعت نکالنا ہے
 آیت اِتَّخَذُواْ اَحْبَابَهُمْ وَرُءُوسَهُمُ اَهْلًا سَابِقًا قَدْ دُونَ اللّٰهِ کی تفسیر
 میں حضرت عدی بن حاتم کی مرفوع روایت نقل کرنے کے بعد مولانا فیاض علی
 نے لکھا ہے :-

پس از آیت کریمہ حسب تغیر رسول اللہ پس اس آیت کریمہ سے حسب تغیر
 صلی اللہ علیہ وسلم مستفاد گشتہ کہ تقلید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معلوم ہوا
 بحت را واجب گردن دانستن کہ تقلید محض کو واجب کرنا اور آیات
 آیات و احادیث اعراف نمودن و احادیث کے تتبع سے منہ پھیرنا شرک
 شرک است العیاذ باللہ ہے اللہ پناہ دے ۔

مولانا فیاض علیؒ نے اس خیال فاسد کی بھی پرزور تردید کی ہے کہ
 اجتہاد مطلق ائمہ اربعہ پر ختم ہو گیا۔ ائمہ اربعہ کے بعد کوئی مجتہد مطلق پیدا
 نہیں ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔ فرماتے ہیں :-

حکم اختتام اجتہاد مطلق بر ائمہ اجتہاد مطلق کے ائمہ اربعہ پر اور
 اربعہ و اختتام اجتہاد فی المذہب اجتہاد فی المذہب کے علامہ نسفی پر

برعلاوہ نسفی تعصب بحت است
درجم بالغیب و محض خالی از دلائل و
برایں است بلکہ ناشی از ضلال بین
اخبار بالغیب خاصہ رب العالمین است
قال اللہ تعالیٰ و عندہ مفاتیح الغیب
ختم ہو جانے کا حکم لگانا محض تعصب ہے
اور بغیر دیکھے پتھر پھینکنا ہے اور دلائل و
برایں سے بالکل خالی ہے بلکہ صریح مگر وہی
ہے کیونکہ غیب کی خبر و نیاز رب العالمین کا
خاصہ حق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اسی کے
پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔

اپنے جواب کی تائید میں مولانا ظہیر الدین
عبارتیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

ولجد انما راجع جمعا ز علماء بدرجہ اجتہاد
مطلق مستقل رسیدہ اند و احداث
مذہب جدیدہ نمودہ و مذہب بعضے
آہنہ شیوع یافتہ مثل ابی ثور کہ از ائمہ
مشہورین و مجتہد مستقل بود . . .
. . . و مثل محمد بن اسماعیل بخاری
کہ صاحب مذہب مستقل بود . . .
. . . و مثل داؤد ظاہری کہ مجتہد مستقل
بود . . . و مثل ابی جعفر محمد بن جریر
طبری کہ صاحب مذہب مستقل بود
. . .
ائمہ اربعہ کے بعد علماء کی ایک جماعت
اجتہاد مطلق مستقل کے درجہ کو پہنچی ہے
اور مذہب جدید کی بانی ہوئی ہے ان
میں سے بعض کا مذہب شائع بھی ہوا جیسے
امام ابو ثور ہیں جو مکہ مشہورین میں سے ہیں
اور مجتہد مستقل تھے اور جیسے
محمد بن اسماعیل بخاری ہیں یہ بھی مستقل مذہب
دلے تھے لہذا جیسے داؤد ظاہری
میں اور ابو جعفر محمد بن
جریر طبری ہیں دونوں صاحب مذہب
مستقل تھے

اپنی اس بات کے ثبوت میں مولانا نے کبار علمائے سلف کے اقوال باحوالہ پیش کئے ہیں۔ ہم نے اختصار کے خیال سے ان کو حذف کر دیا ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں :-

العصر جلد علمائے مجتہدین کے بعد از
ائمہ اربعہ شدہ اند قرن ثانی بعد قرن
الی یومنا پند کہ مذہب بعض انہا
شیوع یافتہ و مذہب اکثر انہا
دراز مسد فاسدہ سبب تعصب
متعصبین شیوع نیافتہ اگر اسای ہمہ
آہنہا ذکر کردہ شود یک فقر عظیم گردد
و حال ہر اقلیم دریا متن مشکل، در ملک
مالینی در ملک ہندوستان در دوازده
صدی حضرت شیخ الشیوخ مولانا شاہ
حلی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ گذشتہ
آمد کہ تبحر علم و اجتہاد شان از تصانیف
شان ظاہر است، کتاب حجتہ الدربالباغہ
بینہ قریب آں است بر وسعت علم و آہنہا
شان، و بعدہ صاحبزادہ والاتبار یعنی
حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ

حاصل کلام علماء مجتہدین جو ائمہ اربعہ کے
بعد کیے بعد دیگرے ہمارے اس زمانے
تک ہوئے ہیں بعض کا مذہب تو شائع
ہوا اور اکثر کا مذہب خراب زمانوں میں
متعصبوں کے تعصب کی وجہ سے رواج
نہیں پاسکا اگر ان سب کے نام لکھ جائیں
تو ایک بڑا فقر ہو جائے اور ہر ملک کا حال
معلوم ہونا بھی مشکل ہے۔ ہمارے ملک
ہندوستان میں بارہویں صدی میں حضرت
مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس
سرہ گذرے ہیں جن کا تبحر علم و اجتہاد
ان کی تصنیفات سے ظاہر ہے۔ کتاب
حجتہ الدربالباغہ قوی دلیل ان کے وسعت
علم و اجتہاد کی ہے۔ ان کے بعد از ائمہ
صاحبزادے حضرت شاہ عبدالغفرینہ
قدس سرہ بھی اجتہاد کا منصب

نیز منصب اجتہادی داشتند ^{نصف} ثانی دلیل بین برآن است، و در زبان قاضی اکمل، محدث بے بدل شیخنا مولانا محمد اسماعیل علیہ الرحمہ ملکہ اجتہاد با تم الوجوہ می داشتند، جم غفیر و مجمع کثیر از علمائے ربانین در ملک ہندوستان قائل بملکہ اجتہاد حضرت ایشاں ہستند ملکہ صیت علم شاں تابلاد عرب رسید افضل علمائے مکہ معظمہ الشیخ عبداللہ سراج قائل صحت علم و ملکہ اجتہاد حضرت ایشاں بود اگر چندے در دیار عرب قیام می فرمود صیت علم حضرت شاں تمام جہان را فرامی گرفت و کسانیکہ در حق حضرت ایشاں طعن می کنند محض تعصب و عناد است اعتبار را نشاید المعاصر اصل المنافرہ.... و مجتہد فی اللہ با وفی بعض المسائل صد ہا قرن بعد قرن بودہ اند ذکر اسامی انہا را این

رکعتھے تھے ان کی تصانیف بھی اس کی روشن دلیل ہیں۔ اور ہمارے زمانے میں فاضل اکمل، محدث بے بدل شیخنا مولانا محمد اسماعیل علیہ الرحمہ اجتہاد کا ملکہ پورے طور پر رکھتے تھے۔ ملک ہندوستان میں علماء ربانین کی ایک بڑی جماعت ان کے ملکہ اجتہاد کی قائل ہے بلکہ ان کے علم کا شہرہ بلاد عرب تک پہنچ گیا ہے۔ مکہ معظمہ کے افضل ترین عالم شیخ عبداللہ سراج مولانا اسماعیل کے وسعت علم اور ملکہ اجتہاد کو مانتے تھے۔ اگر مولانا شہید دیار عرب میں کچھ دن قیام فرماتے تو ان کے علم کی شہرت تمام جہان میں پھیل جاتی۔ جو لوگ ان طعن کرتے ہیں یہ ان کا محض تعصب اور عناد ہے جو قابل اعتبار نہیں ہے۔ معاصرت اصلی سبب ہے نفرت کا... دیہ مجتہد مطلق کا ذکر تھا اسے مجتہد فی اللہ

مختصر ہرگز متحمل نیست بلکہ احاطہ اور مختہد فی بعض المسائل تو یہ تو ہر
اسامی شان متعذر
نہانے میں سیکڑوں ہوسکتے ہیں اس
مختصر رسالے میں ان سب کے نام
ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے بلکہ
ان سب کے ناموں کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔

اختصار کے باوجود یہ اقتباسات کافی طویل ہو گئے مگر ناکدے سے خالی
نہیں ہیں۔ صادق پور کے ان مجاہد بزرگوں کے متعلق بعض بڑوں نے بھی لکھ دیا
ہے کہ ”وہ حنفی تھے۔ اچلہ پیشیت تو ان کے ہاں بہت بعد میں آئی۔ اس لئے
اس غلط فہمی کو دور کرنے کی ضرورت تھی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جس نے عمل بالحدیث
اور تقلید کی نسبت اتنی صاف صاف باتیں لکھی ہوں۔ جو مرد و نسا سب اربعہ
میں سے کسی ایک کی تعیین اور پابندی کو عامی یعنی جاہل کے لئے بھی ضروری نہ
جانتا ہو۔ جو ائمہ اربعہ پر اجتہاد مطلق کے ختم ہو جانے کے عقیدہ کو نہ مانتی اور
ضلال بین، قرار دیتا ہو۔ اس کی نسبت ہم کس طرح یہ دعویٰ تسلیم
کر لیں کہ وہ اچلہ پیشیت نہیں بلکہ حنفی اور مقلد تھے؟ حاشا ثم حاشا۔

○ جاں نثاران راہ حق صادق پوریوں میں ایک بزرگ مولانا کچی علی
علیہ الرحمہ بھی ہیں۔ یہ مولانا فیاض علی مذکور کے بھائی ہیں جو عمر میں مولانا

لہ ظاہری انتساب اور تسمیہ کے اعتبار سے اہل حقیقت ان کے ہاں بعد میں آئی ہو تو آئی ہو۔

لیکن عقیدے کے اعتبار سے یہ حضرات یقیناً بہت پہلے اہل حدیث ہو چکے تھے ۱۲

فیاض علی سے دس برس چھوٹے تھے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ امین و رفیع الیدین کی مندرکہ سنت کا اچھا رصوبہ بہار میں آپ ہی نے فرمایا ۵
(تذکرہ صادقہ ص ۶۶) بتائیے! اس کے باوجود ان کو حنفی سمجھا جائے
یا اہل حدیث؟

○ ”تذکرہ صادقہ“ کے مؤلف مولانا عبدالرحیم صادق پوری بھی انگریز کے مستوی رہ چکے ہیں جس کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔ یہ مولانا ولایت علیؒ کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ انھوں نے مولانا محی علیؒ کے متعلق مذکورہ بالا الفاظ جس انداز میں لکھے ہیں یہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا عبدالرحیم بھی اہل حدیث تھے۔ اس لئے کہ کسی حنفی عالم سے یہ بہت بعید ہے کہ وہ امین اور رفیع الیدین پر عمل مندرکہ ہونے کو ”سنت کا مروہ ہونا“ اور اس کے رواج پانے کو ”سنت کا زندہ ہونا“ قرار دے۔ یہ تو وہ حضرات ہیں جن کے متعلق خصوصیت کے ساتھ ہم کو اہل حدیث ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔ اب رہے وہ حضرات جن کا معاملہ معروض سکوت میں ہے۔ نہ ان کے حنفی ہونے کا کوئی واضح ثبوت ہے اور نہ اہل حدیث۔ تو ان کی نسبت ہم کہہ سکتے ہیں کہ بقول مولانا غلام رسول تہر جب یہ لوگ مولانا ولایت علیؒ کی کوشش اور ان کے وعظ و ارشاد سے متاثر ہو کر اس تحریک میں داخل ہوئے تھے تو ظاہر یہی ہے کہ جو مسلک مولانا ولایت علیؒ کا تھا وہی ان حضرات نے بھی اختیار کیا ہوگا۔ لہذا جب تک اس کے خلاف کوئی واضح دلیل نہیں ملے گی ہم ان سب حضرات کو بھی اہل حدیث ہی قرار دیں گے۔ اس موقع پر ہم مولانا محمد علیؒ کا ایک بیان بھی قابل

ذکر سمجھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:-

”مولانا ولایت علی کی تحریک کے متعلق ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ مولانا اسماعیل شہید کی اس خاص جماعت کو جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، زندہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اسی لئے مولانا نذیر حسین اور نواب صدیق حسن جیسے عالم بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں“ (شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک) مولانا اسماعیل شہید کی یہ ”خاص جماعت“، کون تھی؟ سندھی صاحب ہی نے ہمیں بتایا ہے کہ ”یہ وہی لوگ تھے جو رفع یدین اور آئین بالہر کیا کرتے تھے“ اور بقول سندھی صاحب مولانا ولایت علی ”اسی جماعت“، کو زندہ کرتے اور باقی رکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ تو اب صاف ظاہر ہے کہ مولانا ولایت علی کی کوشش اور دعوت و تبلیغ سے جو لوگ اس جماعت میں داخل ہوئے ہوں گے انہوں نے وہی مسلک اختیار کیا ہوگا جس پر یہ ”خاص جماعت“ عمل پیرا تھی۔ پس مولانا سندھی کے اس ”نکتہ“ سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ مولانا ولایت علی کے اعزہ و اقرباء (جن کی قربانیاں تاریخ مجاہدین کا درخشاں باب ہیں) سب اہلحدیث تھے۔ اسی لئے حضرت میاں صاحب مولانا نذیر حسینؒ اور جناب نواب صاحبؒ اس تحریک کے حامی اور معاون تھے۔ اور اس کے برخلاف مولانا محمود حسن دیوبندی اور ان کے متبعین اس تحریک سے بالکل الگ ہے ان لوگوں نے اس کے بجائے اپنا تعلق ترکوں سے قائم کیا جو حنفی تھے۔ ان حضرات کے فقہی مسلک کے متعلق بجز اللہ بات صاف ہوگئی لہذا وقت آگیا کہ اب ہم ان کی مجاہدانہ خدمات آپ کے سامنے پیش کریں۔

مولانا ولایت علی کی مجاہدانہ
خدمات کا نہایت مختصر اور اجمالی تذکرہ
 ان حضرات کے حالات ان کی دینی خدمات، اور ان کے جہاد وغیرہ کی تفصیلات پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ بالخصوص مہر صاحب کی کتاب اس موضوع پر نہایت جامع اور آخری کتاب ہے۔ اس لئے ہم تفصیلات میں تو جانا نہیں چاہتے، البتہ سلسلہ بیان کا ربط قائم کرنے کے لئے مختصر چند باتیں یہاں ذکر کر دیتے ہیں جن کا زیادہ تر مآخذ یہی شائع شدہ کتابیں ہیں۔

مولانا ولایت علی سید احمد شہید کے ساتھ ہجرت کر کے بغرض جہاد سرحد پار گئے تھے۔ لیکن سید صاحب نے انھیں باصرہ دعوت تبلیغ کی غرض سے حیدر آباد (دکن) بھیج دیا۔ جہاں کم و بیش چار سال یہ خدا انجام دیتے رہے، بالاکوٹ میں سید صاحب نے اور مولانا اسماعیل رح کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور اسی اثنار میں مولانا کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا تو مولانا حیدر آباد سے برہان پور، سیونی، نرسنگھ پور، جبل پور ہوتے ہوئے عظیم آباد پہنچے۔ اور اصلاح عقائد و جہاد کا مقصد پیش نظر رکھتے ہوئے بہار، بنگال، اڑیسہ، اور الہ آباد میں دعوت تبلیغ کا منظم سلسلہ قائم کر دیا۔ طریق تبلیغ یہ تھا کہ مولانا خود ان کے مقرر کئے ہوئے داعی ایک ایک قریے اور ایک ایک موضع میں جاتے مسلمانوں کو پابند شریعت بناتے، مسجدیں آباد کرتے اور ارشاد و ہدایت کا مستقل سلسلہ جاری کر دیتے۔ مذکورہ بالا تمام مقامات پر آج تک اہل حدیث موجود ہیں جو

ان بزرگوں کی مساعی جمیل کی یادگار ہیں۔ مولانا ولایت علی اور ان کے سنبھلے بھائی مولانا عنایت علی پوری سرگرمی سے دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے اور ان کی نگاہیں اس امر پر جمی ہوئی تھیں کہ وقت اور ماحول کے سازگار ہوتے ہی موزوں مقام سے جہاد کا آغاز کر دیں۔ یہاں تک کہ سرحد پار کے سکھوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ان کی حکومت میں ابتری پیدا ہوئی اور میدان عمل میں قدم رکھنے کا سازگار موقع پیدا ہو گیا۔

سید ضامن شاہ نے رجو کاغان کے رہنے والے اور ان دنوں سکھوں سے برسرِ پیکار تھے۔ مولانا ولایت علی کو دعوت بھیجی کہ آپ تشریف لائیں اور یہاں آغاز جہاد کے لئے جو سازگار فضا پیدا ہو چکی ہے اُس سے فائدہ اٹھا کر اسلامی حکومت کے استحکام و استواری کا بندوبست کریں۔ مولانا نے اپنے بھائی مولانا عنایت علی کو بھیجنے کی تجویز کی۔ وہ اس وقت بنگال میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ انھیں سرحد جانے کا پیغام ملا تو دو ہزار مجاہدین ساتھ لیکر عظیم آباد پہنچے۔ جس سے انگریزی حکومت کے کارکنوں میں تشویش پھیل گئی۔ مولانا ولایت علی نے مصلحت و دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے جمعیت منتشر کر دی۔ اور فیصلہ کیا کہ تمام لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹا کر یکے بعد دیگرے جائیں۔ اور سکھوں کے علاقے سے گزرنے کی اس کے سوا کوئی مصورت نہ تھی۔ چنانچہ جمادی الاخری ۱۲۵۹ھ (جولائی ۱۸۸۷ء) سے چار چار پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں کی ٹولیاں روانہ ہونے لگیں۔ اور غالباً چار پانچ چھینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

۲۲۲

مرحوم سپنج کر مولانا عنایت علی نے سکھوں کے ساتھ کئی لڑائیاں لڑیں ایک مکتوب سے جو ذی قعدہ ۱۲۶۳ھ (اکتوبر ۱۸۴۶ء) کا مرقوم ہے واضح ہوتا ہے کہ مولانا عنایت علی سادات کاغان اور دوسرے مقامی لوگوں کی مدد سے ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ (دسمبر ۱۸۴۴ء) میں بالاکوٹ پر قابض ہو چکے تھے۔ وہیں انھیں باقاعدہ امیر جہاد تسلیم کیا گیا۔ سید ضامن شاہ کاغانی نے بھی ان کی اطاعت قبول کر لی اور اس پاس کے علاقوں کو سکھوں کے قبضے سے آزاد کرانے کے لئے زیر دست جہاد شروع ہو گیا۔ تقریباً دو سال کے بعد راور بعض بیان کے مطابق تین سال کے بعد ۱۲۶۲ھ (۹ اکتوبر ۱۸۴۷ء) کو مولانا ولایت علی بھی علاقہ مجاہدین میں پہنچ گئے۔ مولانا کے ساتھ مجاہدین کے علاوہ جنگی سامان تھیں گھوڑے اونٹ وغیرہ بھی تھے۔ مولانا کے پہنچنے کے بعد ۱۲۶۲ھ (۹ اکتوبر ۱۸۴۷ء) کو جمعہ کے دن مولانا عنایت علی نے امارت کا پورا بار مولانا ولایت علی کے حوالے کر دیا۔ اور جملہ مجاہدین نے آپ کے ہاتھ پر بیعت امارت کی۔

(سرگزشت مجاہدین)

اس وقت کشمیر کے راج گلاب سنگھ ڈوگرہ اور مجاہدین کے درمیان جنگ جاری تھی۔ راجہ کو شکست ہوئی اور اس نے انگریزوں کے سائے میں جا کر پناہ لی۔ جو اس وقت تک پنجاب کے ایک معقول حصہ پر قابض اور ملکی معاملات میں پوری طرح ذخیل ہو چکے تھے۔ پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد نہ صرف پنجاب بلکہ سکھوں کا پورا مقبوضہ انگریزی عملداری میں آ گیا۔ حکومت نے مولانا ولایت علی کو اطلاع دی کہ اب گلاب سنگھ پر حملہ کرنا خود

۲۲۳

انگریزی حکومت سے لڑائی مول لینا ہوگا۔ حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ جب تک ان پر براہ راست زد نہ پڑے، مجاہدین سے ٹکرنے کی جائے۔ اور انھیں سکھوں سے لڑنے دیا جائے۔ مجاہدین اور سکھوں میں سے جس کی بھی شکست ہو، سرکار انگریزی کا بہر حال فائدہ ہے

اسی لئے شروع شروع مجاہدین سے رک ٹوک نہیں کی گئی، لیکن جب پنجاب کا پٹا حصہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تو مجاہدین حکومت کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے۔ مجاہدین بھی خواہ مخواہ حکومت سے نبرد آزما ہونا خلافت مصلحت خیال کرتے تھے مگر پھر بھی درہ دہت کے مقام پر مجاہدین اور انگریزی فوج کے درمیان لڑائی ہو گئی۔ جس میں مجاہدین کو شکست ہوئی۔ اس لڑائی نے مجاہدین کے لئے قیام کی کوئی جگہ باقی نہ چھوڑی۔ کئی سال کی محنت سے جہاد کے لئے جو مرکز بنایا گیا تھا وہ جھن گیا۔ مولانا ولایت علی اور مولانا غنی علی دونوں بھائی گرفتار کر کے انگریزی فوج کی حراست میں پٹنہ واپس بھیج دیئے گئے واپسی پر پٹنہ کے محسٹریٹ کے روبرو حاضر ہو کر دو سال کے لئے چمکدینا پڑا کہ شہر سے باہر نہ جائیں گے۔ البتہ ان کے ساتھیوں میں سے میرا ولاد علی ساکن سورج گڈھ ضلع مونگیر کسی طرح بچ کر نکل گئے اور مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ ستھانہ پہنچ گئے۔ اور اب اسی اپنا مرکز بنایا۔

مولانا ولایت علی دو سال تک دطن میں رہ کر تبلیغ و تذکیر کرتے رہے، مختلف علاقوں میں خاص مبلغ بھیجے۔ اپنے منجھلے بھائی مولانا غنی علی غازی کو پھر بنگال بھیجا اور تمام مشاغل اس طرح جاری کر دیئے کہ

۲۲۲

عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ اب مولانا سرحد کا رخ نہیں کریں گے حکومت بھی مطمئن ہو گئی لیکن پورے سال قیام کے بعد جب چٹکے کی معاد ختم ہو گئی تو پھر سرحد کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا۔

۱۳ شوال ۱۳۹۵ھ (۲۹ ستمبر ۱۹۷۶ء) کو گھر بار چھوڑا
سرحد کی طرف مستقل ہجرت اور مستقل ہجرت کے راستہ میں قدم رکھا

مولانا ابھی علی راہن مولانا الہی بخش، اور چند احباب مولانا کے ساتھ روانہ ہوئے چلتے وقت اپنے خلیفہ اکبر مولانا عبداللہ اور مولانا فیاض علی راہن مولانا الہی بخش سے فرما گئے کہ سفر کا سامان مکمل کر کے اہل و عیال کے ساتھ ایک ہفتہ کے اندر موضع گڈھانہ میں آکر ملو۔ پورے نفلہ کے افراد کا تخمینہ دو اڑھائی سو سے کم نہ ہو گا۔ پیچھے مکان پر صرف پانچ مرد رہ گئے اور دو عورتیں۔

اس ہجرت کی قربانیوں کی بابت تہر صاحب لکھتے ہیں:۔
 مولانا ولایت علی اس گھرانے کے فرزند تھے جو بہار کے لوسار میں شمار ہوتا تھا۔ بہت بڑی جاگداد کے مالک تھے اور ان کے تمام اقربا بھی روسا ہی میں محسوب تھے۔ لیکن دیکھتے عشق حق اور خدمت دین کے جذبہ صادقہ نے کس طرح اُن سے سب کچھ چھڑا دیا اور اس زندگی کی تڑپ دل میں پیدا کر دی جس میں تکلیفوں، اذیتوں اور پریشانیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ کارنامے صرف ارباب عزیمت انجام

ہے کہتے ہیں۔ مولانا ولایت علی اور ان کے اکثر اقربا سید صاحب کے فیض تربیت سے یقیناً رباب عزیمت کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ (سرگزشت مجاہدین ص ۱۲)

ہجرت کے دوران میں کہاں کہاں پہنچے دہلی میں ورود اور قیام اسکی پوری تفصیل اور کیفیت تاریخ سے معلوم نہ ہو سکی۔ اتنا ملتا ہے کہ پہلے گڑھانہ میں ٹھہرے جو عظیم آباد سے سات کوس جانب مغرب واقع ہے۔ آگے گئے تو کوٹلہ رورانا پورا اور فطروں کے درمیان کے رئیس حاجی امام علی نے بڑے اہتمام سے دعوت کی تیاری کی۔ مولانا نے روک دیا اور فرمایا کہ ہم صرف وہ ستو کھائیں گے جو آپ کے مزار عین (ہل چلانے والے) کھاتے ہیں۔ آ رہ میں جو دھری ہدایت بشیر رئیس اعظم نے پرتکلف دعوت کرنی چاہی اُسے بھی روک دیا اور صرف کچھ پٹری پکوائی۔ اس کے بعد غازی پور میں مولوی محمد فصیح کے ہاں قیام کا ذکر ہے۔ یہاں سے رخصت ہو کر قریہ بقریہ شہر بہ شہر وعظ و نصیحت اور ہدایت کرتے ہوئے ڈیڑھ برس کے بعد دہلی پہنچے۔ دہلی میں مولانا تقریباً دو مہینے ٹھہرے رہے۔ یہ بہادر شاہ ظفر کا زمانہ تھا۔ بادشاہ نے دعوت نامہ بھیج کر قلعہ معلیٰ میں بلایا۔ مولانا پچھتر آدمیوں کے ساتھ قلعے میں پہنچے۔ بادشاہ نے تخت سے اتر کر لب فرش تک آپ کا استقبال کیا۔ مصافحہ اور معانقہ کے بعد اپنے ساتھ بٹھایا۔ خاطر تواضع کے بعد آپ نے وعظ شروع کیا اور یہ آیت تلاوت کی **اجلسوا انما الحیوة الدنیاء لعب و التوفیق و الریفة و**

نَفَاخُوْهُنَّ مِنْكُمْ اَلَا يَهْجُبُ عَنْ اَبْنَاءِ شَدِيْدٍ پَر پھونچے تو وزیر اعظم نے آپ کے کان میں کہا کہ بادشاہ سلامت کے سامنے عذاب کے بیان کرنے کا دستور نہیں ہے۔ جو عالم یہاں وعظ کہتے ہیں وہ صرف جنت ہی کا بیان کرتے ہیں۔ لیکن مولانا بے تکلف عذاب قبر نگار، حشر و دوزخ کے عذاب کی شدت شد و مد کے ساتھ دل گیر طریقے سے بیان کرتے رہے جس سے بادشاہ، شہزادگان، زینت محل و بادشاہ کی بیگم اور تمام مہمکین مجلس بے حد متاثر ہوئے اور زار زار رونے لگے۔ بعد وعظ ظفر شاہ نے فرمایا کہ میں نے بھی درباب ترک دنیا کچھ اشعار کہے ہیں۔ آپ نے ارہے سننے کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ وہاں سے رخصت ہو کر دوبار قیام گاہ پر پہونچے تو پچاس خوان کھانوں کے مطبخ شاہی سے پہونچے۔ اوکھیلے ایک انگریز کا بیان ہے کہ دہلی میں مولانا کے وعظ بڑے شوق سے سنے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بادشاہ کے سامنے جہاد کا وعظ کیا جس پر اس نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔

رمضان کا مہینہ قریب آ گیا تھا اور بادشاہ دہلی سے روانگی اور
 استھانہ میں ورود
 کی خواہش تھی کہ مولانا رمضان قلعہ معلوٰی میں گذاریں تاکہ قلعہ کے لوگ ان کے ساتھ نماز تراویح ادا کریں اور وعظ سنیں لیکن ریڈیٹنٹ نے مولانا کے متعلق ایسے انداز میں پرسش شروع کر دی تھی کہ کڑ کاوش کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا لہذا زیادہ ٹھہرنا قرین مصلحت نہ سمجھا گیا اور مولانا معذرت کر کے

۱۲۶

روانہ ہو گئے۔ جیسا پار پہونچے تو رمضان کا چاند دیکھا وہاں سے کوچ کر کے اور منزل در منزل طے کرتے ہوئے لدھیانہ کے قریب پہونچے۔ کھنہ میں کچھ دن مولانا عنایت علیؒ کا انتظار کرتے رہے جو مولانا ولایت علیؒ سے کم و بیش مہینے بعد شعبان ۱۳۶۶ھ (جون ۱۹۴۸ء) کو وطن سے روانہ ہوئے تھے۔ کھنہ یا لدھیانہ میں دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوئی یہاں سے دونوں بھائی چند ہمارہیوں کو ساتھ لیکر سرحد کی طرف روانہ ہوئے اور ربیع الآخر ۱۳۶۷ھ (۱۱ فروری ۱۹۴۸ء) کو ستخان پہنچ گئے۔ ان کے اہل و عیال بھی آٹھ روز کے بعد وہیں پہنچ گئے۔

”تذکرہ صادقہ“ میں مرقوم ہے کہ ”مولانا ستخانہ میں قیام اور وفات اپنے زمانے کے فنون حرب سے بھی خوب

واقف تھے۔ گھوڑے کی سواری، دریا میں تیرنا، تیر اندازی، بندوق چلانا، پٹا، بانا، اور تلوار چلانے میں بڑی مہارت تھی“ مہ صاحب کی تحقیق کے مطابق سرحد پہنچنے کے بعد صرف بیس مہینے مولانا کو زندگی کی سہلت ملی، ابھی ابتدائی انتظامات، اور جہاد قتال کی تیاریوں ہی میں مصروف تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دار فانی کو چھوڑ دینے کا پیغام آ گیا۔ آپ نے خذہ پشانی کے ساتھ اس پیغام کو لبیک کہا اور رحمت الہی کی آغوش میں پہنچ گئے۔ آپ کا انتقال سید صاحب کی شہادت کے بعد ۲۲ محرم ۱۳۶۹ھ (نومبر ۱۹۴۸ء) میں ہوا۔ ستخانہ کے قریب مرکز کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ”تذکرہ صادقہ“ کے بیان کے مطابق چونتھ سال کی عمر پائی۔ رب غفور

اس مہاجر اور غازی فی سبیل اللہ کی تربیت پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے
آمین۔

مولانا عنایت علی

مولانا ولایت علی کی وفات کے بعد بالاتفاق سب مجاہدین نے مولانا
عنایت علی کو اپنا امیر تسلیم کر لیا۔ یہ شروع سے آخر تک اپنے بھائی کے ساتھ
ان کے تمام کاموں میں دست و بازو بنے رہے۔ سید صاحب سے محبت
کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی کبھی آرام نہیں کیا۔ پہلے سید صاحب کے
احکام کے مطابق تبلیغ و جہاد میں مصروف رہے۔ ان کی شہادت کے بعد
اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی کے مشوروں اور ہدایت کے مطابق
اعلاء کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کی شان عزیمت کا اندازہ
اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اپنے بڑے بھائی کی سعیت میں ہندوستان سے
مستقل ہجرت کا ارادہ کیا تو آپ کی والدہ ماجدہ نے ضلع گیا کے ایک
گاؤں کا وثیقہ آپ کے حوالہ کر دیا تھا۔ آپ نے بے گاؤں بیس یا بائیس ہزار
روپے میں ایک رگیں کے ہاتھ بیچ دیا۔ اور دوسرے معاملات سے دست
برداشت کی ایک تحریر لکھ دی۔ اندازہ فرمائیے کہ خوش حالی اور فائز الہی
کے کتنے مہتمم بالشان سامان انھیں میسر تھے، لیکن ان میں سے کوئی چیز انھیں

راہ حق میں مجاہدانہ اقدام سے نہ روک سکی۔ (سرگزشت مجاہدین ص ۲۸)

ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ جہاد فی سبیل اللہ یا اس کی **غزوات** تیار یوں اور اہتمام میں صحرے میں ہوا۔ حادثہ بالاکوٹ کے بعد جب سید ضامن شاہ کا غانی نے مولانا ولایت علی کو سرحد آنے کی دعوت دی تو مولانا نے انھیں (مولانا عنایت علی) کو امیر مجاہدین بنا کر بھیجا۔ جہاں پہنچ کر ایک مدت تک راجہ گلاب سنگھ ڈوگر والی کشمیر سے لڑتے رہے مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں۔

مولانا عنایت علی غازی کی صبح جگمیدان جنگ تھی اور وہیں

ان کے حقیقی جوہر کھلتے تھے۔ ان کے جہاد کے چار دور ہیں۔

① پہلا دور سید صاحب کی معیت میں، جب تک

وہ وہاں سے دوسری مہم پر نہ بھیج دیے گئے۔

② دوسرا دور مشہد بالاکوٹ کے تقریباً تیرہ برس بعد شروع ہوتا ہے

جب وہ سید ضامن شاہ کی درخواست پر اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی

کے حکم سے بالاکوٹ گئے۔ یہ جنگ ساڑھے چار برس جاری رہی۔ یوں تو اپنے

جارحانہ حملوں سے آپ نے شروع ہی میں ضامن شاہ کے قلعے، کل علاقے اور پورے

واپس دلا دیئے تھے۔ مگر گلاب سنگھ کے مکر و فریب اور مقامی ہمدردوں کی

غداری نے مجاہدین کو تتر بتر کر دیا۔ اور وہ سرکار انگریزی کی شرطوں کے خلاف

وطن لوٹنے پر مجبور ہو گئے۔

③ مولانا عنایت علی مزاج کے تیز تھے ہجرت کے بعد سرحد پہنچ کر انکی

خواہش تھی کہ کچھ ہونا چاہیے۔ جہاں داود خاں والی ارب رجوانگریزوں کا طیف تھا، اس کی شرارت کے باعث آپ نے چیڑھ چھاڑ کر نا چاہی۔ مگر مولانا ولایت علی نے بعض مصالح کے باعث اس کو منظور نہیں کیا۔ یہ بات گرم مزاج غازی کو ناگوار معلوم ہوئی اور وہ تین چار سو آدمیوں کے ساتھ بڑے بھائی سے علیحدہ ہو کر منگل تھانہ سہد عباس کے پاس جا رہے۔ اور ان کی املاک و فوج کی نہایت خلوص اور ہوشیاری کے ساتھ نگہداشت کی۔

④ مولانا ولایت علی کی انتقال کے بعد آپ منگل تھانہ سے ستھانہ (مجاہدین کا بڑا مستقر) واپس آئے اور تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت امارت کی۔ اُس وقت جنگ کے دو محاذ تھے۔ ایک ستھانہ اور دوسرا نارنجی اور منگل تھانہ۔ مولانا عنایت علی پہلے نارنجی میں ٹھہرے، پھر منگل تھانہ میں وہاں مجاہدین کو شکست ہوئی تو آپ نے ستھانہ کا قصد کیا۔ لیکن راستہ ہی میں پیام (جل آپہونچا) (پہلی اسلامی تحریک) مولانا تھر لکھتے ہیں۔

جب تک مجاہدین کا مرکز ستھانہ کی سرزمین میں تھا، ان کی پریشیں ضلع ہنراہ پر ہوتی تھیں۔ منگل تھانہ پہنچنے کے بعد مولانا عنایت علی نے مجاہدین کو جس علاقہ پر یورشوں کے لئے تیار کیا وہ ستمہ کا علاقہ تھا۔ یعنی ضلع پشاور اور ضلع مردان کا میدانی علاقہ۔ اوکنے (ایک انگریز) نے لکھا ہے کہ مولانا عنایت علی نے اپنے ہمراہیوں کے دل میں انگریز کافروں کے خلاف نفرت کی

آگ بجھڑکانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی۔ مجاہدین روزانہ قواعد کرتے بلکہ بعض اوقات دن میں دو مرتبہ۔ قواعد میں فضائل جہاد کے متعلق نقلیں پڑھی جاتیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد بیشت کی شادمانیوں کے بارے میں وعظ کہے جاتے اور انھیں تلقین کی جاتی کہ صبر و استقامت سے اُس وقت کا انتظار کرو جب برطانوی ہند کی تسخیر کی موعودہ ساعت آپہنچے گی۔

(سرگزشت مجاہدین ص ۲۸۹)

پچھلے صفحات میں اس کا ذکر آچکا ہے کہ مولانا عنایت علی کی جہادی سرگرمیوں کا چوتھا دور مولانا ولایت علی کے انتقال کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ بھی پہلے گزر چکا ہے کہ وہ انگریزوں کے حلیف والی امرب پر حملہ کرنا چاہتے تھے مگر مولانا ولایت علی نے اجازت نہیں دی۔ جب ان کی امارت کا زمانہ آیا تو ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ جہاں دادخواں والی امرب سے ٹکرنے لگے وہیں ہو گئی۔ چنانچہ ۱۲۵۲ھ اور ۱۲۵۳ھ کے درمیان مجاہدین اور سرکار برطانیہ کے درمیان جو کشمکش اور چھیڑ چھاڑ جاری رہی اس کا نہایت مختصر بیان درج ذیل ہے۔

پٹنہ کے کلکٹر (۱۲۶۵ھ) ریلوں شانے لکھا ہے کہ۔

”برطانوی حکومت اب زیادہ دیر تک حقائق سے آنکھ نہیں بند کر سکتی تھی۔ ۱۲۵۲ھ کے موسم بہار ہی میں ”ایک سرحدی جنگ“ کی تجویز زیر غور آچکی تھی۔ اسی سال ان لوگوں نے ہمارے

۲۳۲

حلیف، ریاست امرب کے سردار پر حملہ کیا جس سے برطانوی حکومت ایک فوج بھیجنے پر مجبور ہوئی۔

”۱۸۵۱ء میں ہماری فوج کے متعدد افراد ”باغیوں“ سے خط و کتابت کے الزام میں ماخوذ اور سزا یا بھروسے“

”۱۸۵۲ء میں ان کا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔ استھانہ کیمپ میں برطانوی علاقے سے آدمی اور روپیے کی آمد براہِ جاری تھی اور ہماری فوج سے ان کی باغیانہ خط و کتابت پکڑی گئی۔ ان مجاہدین نے بڑی چالاکी سے یہ چاہا تھا کہ ہماری چوتھی ویسی سپاہ متعینہ راولپنڈی کی وفاداری داغدار ہو جائے۔“

”میں یہاں ان زیادتیوں، توہین اور قتل کے واقعات کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا جو ۱۸۵۱ء والی جنگ سرحد کا باعث ہوئیں۔ اس پوری مدت (۱۸۵۱-۱۸۵۲ء) میں مجاہدین نے سرحدی قبائل کو برطانوی حکومت کے خلاف برسرِ کار رکھنے کی کوشش کی۔“ منظر نے لکھا ہے۔

”۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۲ء کے درمیان ہمیں مختلف وقتوں میں سولہ مہم جاری کرنا پڑی، جن میں ۱۳ ہزار تربیت یافتہ فوج سے کام لیا گیا۔ اس دوران میں استھانہ کی نوآبادی گو سرحد کے طول و عرض میں جہاد کی روح بھڑکاتی رہی، پھر بھی ہماری فوج سے راست ٹکسر نہ لے کر انھوں نے عقلمندی کا

ثبوت دیا،

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک از مسلمانانہ

مولانا عنایت علی کے غزوات کے متعلق یہ چند اشارات میں تفصیلات اور سرگزشت
مجاہدین میں ملاحظہ کیجئے۔

مولانا اور مجاہدین کے لئے زیادہ تر زمین ہندوستان

سے بھیجی جاتی تھیں۔ ان کے ہم خیال وہم مشرب

اصحاب بہار اور بنگال میں بکثرت موجود تھے

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ

اور مالی مشکلات

جو خفیہ طور پر چندے کر کے سرحد بھیجتے تھے۔ یہ سلسلہ براہ جاری رہا اور سارا

نظام حسن و خوبی کے ساتھ چل رہا تھا کہ اسی دوران میں ۱۸۵۷ء کو میرٹھ

سے اس ہنگامے کا آغاز ہوا جسے انگریزوں نے "خدر" قرار دیا اور اہل

ملک اسے "آزادی کی جنگ" قرار دیتے ہیں۔ اس ہنگامے نے جا بجا

انگریزوں کے لئے سخت نازک حالات پیدا کر دیئے تھے۔ مجاہدین کے لئے

اقتدات کا یہ بڑا ہی اچھا موقع تھا لیکن اتفاق کی بات ہے کہ حالات

نظر بہ ظاہر جسے سازگار تھے، بعض ناگہانی حوادث و وقائع کے باعث

اتنے ہی نام سازگار ہو گئے۔

یہ ہنگامہ شروع ہوتے ہی انگریزوں نے دریائے سندھ کے تمام

گھاٹوں اور کوہستانی علاقے کے راستوں کی نگرانی کا نہایت سخت انتظام

کر لیا تھا، جس کے بعد کسی قاصد کے لئے ہندوستان سے کوئی رقم مرحد

پہونچنا ممکن نہ رہا تھا۔ صادق پور (پٹنہ) کے مرکز پر پہرے بٹھا دیئے

۲۳۴

گئے تھے، نیز مولانا احمد الشہ، شاہ محمد حسین اور مولوی واعظ الحق کو نظر بند کر دیا گیا تھا۔ یہی حضرات قمیس جمع کرنے اور بھیجنے کے مختار و ذمہ دار تھے (سرگذشت مجاہدین)

مواصلات کے سلسلے کے منقطع ہو جانے کی وجہ سے مجاہدین سرحد کے لئے بڑی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ فاقے پر فاقے ہونے لگے۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوری بھی مجاہدین کے لئے روپے اور سامان فراہم کرنے والوں کے سرگرم شریک اور معاون تھے ان کا بیان ہے کہ:

۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے راہ پر خطر تھی، شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا، اہلک تسلسلہ میں تھے، جانوں کو امن نہ تھا۔ پھر کس کو ہوش تھا اور کیونکر ممکن تھا کہ سرحد کے پار فاقہ کشوں کے لئے کوئی سامان کیا جاسکتا؟ مسلسل فاقہ کشی نے حالت تباہ کر دی اور ختوں کی کوپلوں اور پتوں پر اصحاب صفہ کی سنت ادا ہونے لگی۔ چند ماہ مسلسل غلہ پر نظر تک نہ پڑی۔ اجابتیں خون آلود ہونے لگیں۔ آپ کے (یعنی مولانا عنایت علی کے) پاس جو کچھ نقد تھے آپ مہاجرین والہاں پر صرف کر چکے، اور وہ تھا ہی کیا؟ اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ اب ادھر ساتھیوں کی بدگمانیاں اور طعنے شروع ہو گئے۔ زندگی تلخ تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ اگلی اُمم مضطر ہو کر مَتی نَصَبِ اللہ پر پکار اٹھی تھیں:

(تذکرہ صادقہ ص ۱۳۸)

مہر صاحب لکھتے ہیں ۔

جنگ نارنجی کے بعد یہ جنگ جولائی اور اگست ۱۸۵۷ء میں ہوئی تھی مولانا عنایت علی کی مالی حالت بے حد خراب ہو گئی ۔ کچھ مدت تک وہ ساہوکاروں سے قرض لیکر گزارہ کرتے رہے اس اثنا میں لشکریوں کو تنخواہ بھی نہ دی جاسکی ۔ اب ایک طرف بعض افراد نے مجبور ہو کر تنخواہ کا مطالبہ کیا ۔ دوسری طرف ساہوکاروں نے اپنی رقموں کے لئے تقاضا شروع کر دیا ۔ مولانا کے لئے یہ بڑا ہی نازک وقت تھا ، انھوں نے اپنی تمام قابل فروخت چیزیں بے تکلف بیچ ڈالیں ، اور سب سے پہلے ساہوکاروں کا قرضہ اُتارا ۔ جو رقم باقی رہ گئی اُسے ادا کرنے کے لئے سیدنجیب بنگالی نے ضمانت دیدی ، مجاہدین میں سے کچھ لوگ خورد و نوش کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ادھر ادھر بکھر گئے مولانا کے پاس ایک قیمتی مشکي گھوڑا تھا ۔ انھوں نے مقرب خاں رئیس پنجتار کو پیغام بھیجا کہ گھوڑا خرید لے تاکہ اس کی قیمت سے واجبات ادا کئے جاسکیں ۔ اس نے کچھ توجہ نہ کی ۔ ملا صاحب کو بٹھا کر یہ کیفیت معلوم ہوئی تو انھیں بڑا افسوس ہوا اور خود گھوڑا خرید لینا چاہا ۔ معلوم نہ ہو سکا کہ ملا صاحب کی اس خواہش کا نتیجہ کیا نکلا ؟ ۶۷

علامت وفات

مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں :-
یہی لیل و نہار تھے کہ سرکار انگریزی نے

شہداء میں پشاور سے جنرل کاٹن کی سرکردگی میں چھ ہزار فوج کے
ساتھ مجاہدین پر حملہ کر دیا مگر مارے مارے شاہ مارا شاید ایسے
ہی موقع پر کہا گیا ہو۔ مجاہدین کی اچھی خاصی تعداد مردانہ وار
دو شجاعت و کیر شہید ہوئی۔ کچھ پہاڑوں میں چھپ گئے۔
مولانا عنایت علی نے ستمانہ کا قصد کیا مگر راستہ ہی میں جنمی
کے مقام پر داعی اجل کو لبیک کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
(پہلی اسلامی تحریک ص ۷۷)

مہر صاحب نے لکھا ہے کہ :-

مولانا پر بخار کا ایسا شدید حملہ ہوا جس سے بے ہوشی طاری
رہنے لگی، اس وقت وہ غالباً پرگنہ منصور جدون کے مقام
فور دبانڈہ میں تھے۔ وہاں سے ان کی چارپائی اٹھا کر جنمی کی
جانب روانہ ہوئے، کوہ جنمی کی چڑھائی پر بخار بہت تیز ہو گیا
اور مولانا نے کاغذ اور قلم و دوات طلب کی۔ شاید کچھ لکھنے
کا ارادہ نہ تھا۔ عین اسی حالت میں سکرات موت کا عالم طاری
ہو گیا اور کمزوری اتنی بڑھ گئی کہ لکھنے کی سکت نہ رہی، ان کے
لڑکے نے پوچھا آپ کے بعد امیر کون ہو؟ کچھ نہ فرمایا اور جان
جان آفریں کے سپرد کر دی۔ صحیح تاریخ وفات کسی

نے نہیں بتائی، لیکن اتنا معلوم ہے کہ ۶ شعبان ۱۲۴۴ھ مردہ ۲۲ مارچ ۱۸۲۷ء تک وہ زندہ تھے۔ غالباً اس سے ایک دو روز بعد انتقال کیا۔

مولانا غلام رسول مہر نے مولانا عنایت علی مولانا کے متعلق مہر صفا کے حالات لکھنے کے بعد آخر میں ان کی شخصیت کے تاثرات کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

مولانا کے جوش حمیت اور گرمی طبیعت کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن انھوں نے اللہ کی راہ میں عزیمت و استقامت کا جو عظیم القدر نمونہ پیش کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جس وقت سے سید صاحب کے ساتھ ان کا تعلق پیدا ہوا، اسی پورے زندگی دینی کاموں کے لیے وقف کر دی۔ بنگال میں جس اعلیٰ پیمانے پر انھوں نے دین کی تبلیغ فرمائی اس کی کیفیت تفصیلاً پہلے پیش کی جا چکی ہے۔ پھر وہ سادہ سا ادب کا غان اور اہل ہزارہ کو لے کر جس مردانگی سے سکھوں کے خلاف جہاد آرا ہوئے وہ بھی اعادہ کی محتاج نہیں۔ آخری دور میں مولانا نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ خدا کی راہ میں جہاد پھولوں کی سیج نہیں۔ وہ اپنا سب کچھ خدا کے لئے قربان کر چکے تھے۔ لیکن دیکھئے آخری دور میں انھیں کس درجہ روح فرسا آلام و مصائب سے ساقط پڑا

۲۳۸

پیرمہ پلے نہ تھا۔ جو سامان پاس تھا بیچ ڈالا، اکوتا فرزند صاحب
 فراش۔ اس کی بچی بیمار، اپنی حالت حد درجہ نازک، ہر صحت
 دشمنوں کا ہجوم، امتحانوں اور آزمائشوں کے اس سیل میں قدم
 استوار رکھنا صرف انھیں ارباب ہمت کا کام ہے۔ جن کے سامنے
 فرض بطور فرض موجود ہو، دنیوی راحیوں اور آسائشوں
 سے انھیں کسی نوع کا سروکار نہ ہو۔ اور صرف رضائے باری تعالیٰ
 پر نظر ہو۔ یہ منزل بڑی کٹھن ہے لیکن مولانا عنایت علی نے
 جس شانِ خداکاری سے اسے طے کیا اسکی مثالیں ہر جگہ نہیں
 مل سکتیں۔ ان کے سامنے صحابہ کرامؓ کا اسوہ حسنہ تھا جنہوں
 نے دینِ حق کی اشاعت میں اپنی جانیں بے دریغ قربان کر دیں
 یہی اسوہ قوموں کے لئے دنیا اور آخرت میں سرخروئی کا واحد
 ذریعہ ہے۔ (سرگزشت مجاہدین ص ۳۲)

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ
 اور میاں صاحب
 سید احمد اور مولانا اسماعیل (الشہیدین) کی
 تحریک جہاد کا اجمالی اور مختصر تاریخی سلسلہ
 بیان پچھلے اوراق میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے
 تک پہنچا ہے۔ ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے۔ اس سلسلے میں علمائے
 الہمدیث کی بے نظیر جانی اور مالی قربانیوں کے حیرت انگیز اور روزِ ناک
 واقعات انشاء اللہ آپ کے سامنے آئیں گے۔ لیکن یہاں پہنچ کر مناسب
 معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے اس سلسلہ بیان کو ملتوی کر دیا جائے

اور اس کے بجائے اسی موقع پر ۱۸۵۷ء کے ان بعض حوادث اور واقعات کا جائزہ لے لیا جائے۔ جن کی بنا پر حضرت میاں صاحب سید ندیم دہلوی علیہ الرحمہ کی شخصیت کو رواستہ یا نادانستہ طور پر (مطعون اور بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور ان کے بعد پوری جماعت اہلحدیث کو راضی کی ہو یا حال کی بلا کسی تخصیص اور استثناء کے) ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے۔

پہلی بات جس کا طعنہ اہلحدیثوں کو دیا گیا ہے وہ یہ ہے
پہلا طعنہ اور اس کا جواب
 کہ اسے سرخیل جماعت سید الطائفہ مولانا سید ندیم حسین صاحب دہلوی نے بھی سیاست سے کنارہ کشی کر لی۔ انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد پر دستخط نہیں کئے۔ دوسرے اکابر علماء عصر کے دستخط تھے لیکن مولانا مرحوم کے دستخط اس پر نہ تھے۔

اولاً۔ تو تاریخ کی روشنی میں یہ دعویٰ ہی قطعاً غلط ہے کہ "تمام اکابر علماء عصر نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیدیا تھا صرف میاں صاحب اس کے مخالف تھے" مندرجہ ذیل شواہد پر غور کیجئے:-

○ امیر شاہ خاں صاحب لایک شخص گزرے ہیں جو دیوبندی حلقے میں بڑے معتبر راوی مانے گئے ہیں۔ ان کو علماء، مشائخ، اور بزرگوں کی حکایت بکثرت یاد تھیں۔ ان کی بیان کردہ حکایات کو دیوبندی حضرات نے کتابی صورت میں مرتب کر کے "ارواحِ ثلاثہ" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

۲۴۰

انہیں امیر خاں کا بیان ہے کہ ”غدر میں بہت علماء مخالف تھے اور کہتے تھے کہ یہ جہاد نہیں ہے۔ انہیں میں میں میر محبوب علی صاحب (دہلوی) بھی تھے، اور آپ وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے لوگوں کو غدر سے روکتے تھے..... (ارواح ثلاثہ ص ۲۲۴)

یہ میر محبوب علی دہلوی کون ہیں؟ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے شاگرد، بلکہ ”شاندازِ ماضی“ کے مصنف مولانا سید محمد میاں نے ان کو ان مخصوص علماء میں شمار کیا ہے ”جو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی تربیت گاہ سے تربیت پا کر ہندوستان کے آفتاب و مہتاب بنے“ (ملاحظہ ہو علماء ہند کا شاندازِ ماضی جلد ۲ ص ۴۹ و ص ۵۵)

ایک یہی نہیں، بلکہ بقول امیر خاں صاحب ”بہت“ سے ایسے علماء تھے جو اس ہنگامہ کو اسلامی جہاد ہونے کا فتویٰ نہیں دیتے تھے۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے زیادہ معتبر راوی کون ہوگا۔ دیوبندی ہی حلقے کے ایک ممتاز عالم مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کے متعلق ان کا بیان ہے کہ:-

”جہدِ قسمتی سے مولانا کی رائے یہ ہی تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔“ (نقشِ حیات جلد دوم ص ۴۲)

”تذکرہ مشائخ دیوبند“ کے مصنف نے مولانا شیخ محمد تھانوی کے حالات میں لکھا ہے کہ:-

۲۴۱

بڑے پایہ کے لوگوں میں سے ہیں، علوم ظاہر و باطن میں کامل تھے۔ اپنے زمانہ میں محدث تھانوی کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے ذی علم لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ علوم ظاہرہ میں خاندان ولی الہی کے فیض یافتہ ہیں تکمیل علم دہلی میں رہ کر کی اور حدیث اور تقریباً تمام فنون شاہ محمد اسحق صاحب دہلوی سے حاصل کئے حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب سے نسبی تعلقات بھی تھے علم حدیث میں کافی مہارت رکھتے تھے (تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۷۷)

مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں:

تھانہ بھون کے یہ بزرگ مولانا شیخ محمد تھانوی محدث کے نام سے مشہور ہیں، آپ کی رائے ۱۸۵۷ء کی تحریک حریت کے خلاف تھی۔ (آگے لکھتے ہیں) شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں جن کے مسلک پر مولانا اشرف علی صاحب کاربند ہیں اور شیخ الہند کی جماعت کی سیاست کو غلط مانتے ہیں، مولانا اشرف علی صاحب کے سوانح حیات جو شائع ہو چکے ہیں ان میں تصریح ہے کہ آپ مولانا شیخ محمد صاحب کے مسلک کے پیرو ہیں۔ مولانا شیخ محمد اور امیر امداد اللہ ایک ہی مرشد کے خلیفہ ہیں۔ اور اسی مسئلہ جہاد پر آپس میں مخالف ہو گئے۔ اور جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

۲۴۲

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۲۶۲ و ص ۲۶۵)

غور فرمائیے! یہ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ اور شاہ محمد اسحاق کے تربیت یافتہ اور فیض یافتہ حضرات ہیں۔ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتوے پر دستخط نہیں کئے۔ اگر دوسرے بہت سے علماء عصر کو نظر انداز بھی کر دیا جائے۔ تو کوئی بھی انصاف سے بتائے کہ کیا حنفی مکتب فکر کے اعلیٰ درجہ والوں کا برکات و توفیق میاں صاحب کے سر سے تغرد کا الزام دور کرنے کے لئے کافی نہیں ہے؟ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس باب میں صرف میاں صاحب کا نام لیا جاتا ہے اور دوسرے حضرات کے ناموں کا اظہار کرنے سے گریز کیا جاتا ہے؟

ان سب کے علاوہ ایک بڑی بات جو اس موقع پر قابل غور ہے وہ یہ کہ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ جنہوں نے ابتدا میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیکر انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کا فتویٰ دیا تھا اور انگریزی حکومت کی ملازمت تک کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ خود ان کی روش بھی بعد میں تبدیل ہو گئی تھی۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم فرماتے ہیں:-

دہلی میں جب انگریزی حکومت قائم ہوئی تو علماء و ثقافت کا عام مسلک یہ رہا کہ انگریزی ملازمت سے اجتناب کیا جائے۔ شاہ صاحب کا بھی ابتداء میں یہی مسلک تھا۔ جب کمپنی نے کلکتہ میں قاضی القضاۃ کا عہدہ قائم کیا اور اس کے

۲۴۲

لے لکھنؤ لکھا تو لکھنؤ سے ایک استفتا رشاہ صاحب کے نام گیا تھا، شاہ صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر اس سے احتراز واجب ہے..... لیکن جب انگریزی حکومت پر کچھ عرصہ گزر چکا تو انگریزوں کی کوششیں جو وہ شمالی ہند میں مسلمانوں کی تالیفِ قلب کے لئے برابر کئے جا رہے تھے، بہت کچھ کامیاب ہونے لگیں، حتیٰ کہ وہ وقت آگیا خود شاہ صاحب تیار ہو گئے کہ اپنے دلا دمولوی عبداللہ کو میرٹھ کے مفتی عدالت ہونے کی اجازت دے دیں، اور مدرسہ عزیزی کی طرف سے ان کا عام پیش کریں۔ اس وقت شاہ غلام علی خان نقاہ والے زندہ تھے انھوں نے جو تہی یہ بات سنی نہایت رنج و کیمیدہ خاطر ہوئے اور شاہ صاحب کے نام خط لکھ کر اظہارِ تعجب کیا۔ شاہ صاحب نے اس کے جواب میں ایک مفصل خط لکھا ہے اس میں حضرت یوسفؑ اور فرعون کے معاملہ سے استدلال کرتے ہیں اور انہی باتوں پر زور دیتے ہیں جن کا چند سال پہلے لکھنؤ والے مکتوب میں بحث و مدرد کر چکے تھے۔

ڈاکٹر منسٹر نے اپنے رسالہ انڈین مسلمانز میں شاہ صاحب کے اس خط کا ترجمہ نقل کیا ہے۔ ان کے مجموعہ فتاویٰ میں جو مقبول پریس نے شائع کر دیا ہے دونوں تحریریں موجود ہیں :

(نقش آزاد ص ۳۳ و ص ۳۱)

۳۴۴

ثانیاً - ۱۸۵۷ء کی عام شورش اور ہنگامے کو بکرمیاں صاحب نے
اسلامی جہاد (بشرط معتبرہ) اور دینی جنگ ہونے کا فتویٰ نہیں دیا تو وہ
چند تفریعات (الف) یہ تو کوئی طعنہ کی چیز نہیں ہے۔
(ب) اور نہ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مطلقاً سیاست
سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

(ج) یا یہ کہ وہ انگریزی حکومت کے وفادار تھے اور اپنی وفاداری کا
مظاہرہ کرنے کی غرض سے انھوں نے یہ کام کیا تھا۔

(د) یا یہ کہ ان کی اس روش (یعنی جہاد کے فتوے پر دستخط نہ کرنے)
کا یہ اثر ہوا کہ اُن کے وقت سے لیکر آج تک اہلحدیث کے علماء اور شاخ
نے سیاست اور عملی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

بات کے ہر پہلو کو دلائل کی روشنی میں وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے
ہم نے تفریعات پر نمبر لگا دیے ہیں۔ تفریعات کے انہیں نمبروں کی
ترتیب سے اسباب ہماری مندرجہ ذیل معروضات کو ٹھنڈے دل سے
پڑھئے اور سوچئے کہ حق وانصاف کا تقاضا کیا ہے؟

تفریع الف کے متعلق مولانا سعود عالم ندوی لکھتے ہیں.....

اسی دوران میں شہرہ کا پیر آشوب
حادثہ پیش آیا اور گو مجاہدین اور ان کے معاونین ایک دینی نظام سے
وابستہ ہونے کی وجہ سے اس قومی لڑائی میں غیر جانبدار رہے، پھر بھی
پٹنہ کے کمشنر مسٹر ٹیلر نے مولانا احمد اللہ صادق پوری وغیرہ کو بہت دق کیا

..... راسی موقع پر حاشیہ میں لکھا ہے ہماری غرض یہ ہے کہ مجاہدین جماعتی حیثیت سے شہداء کی قومی لڑائی سے الگ رہے شہداء کے ہنگامے کو ایک قومی جنگ سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ اسی لئے سید صاحب کے مانتے والے ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کے بعد اس سے الگ رہے۔ (پہلی اسلامی تحریک) مولانا غلام رسول مہر نے اس ہنگامے کی بابت ۴۶ صفحوں کی ایک مستقل کتاب ہی لکھی ہے جس کا نام ہی ۱۸۵۷ء ہے۔ اس میں اس ہنگامے کے اسباب، حالات اور نتائج بڑی تفصیل سے پیش کئے ہیں۔ چنانچہ اسباب کی بابت مختلف نظریات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں

”ان میں سے بعض اسباب یقیناً درست ہیں اور بعض بالکل بے سرو پا ہیں، مثلاً اسے خالص اسلامی تحریک قرار دینا اس لئے کہ اس کے کارفرماؤں اور کارکنوں میں ہندو اور مسلمان دونوں کی شرکت کسی ثبوت کی محتاج نہیں (ص ۳۱) اس کے بعد پھر لکھتے ہیں۔

”جنگ آزادی کا بنیادی اور اساسی سبب ایک اور صرف ایک تھا، اور وہ یہ کہ انگریزی حکومت اجنبیوں کی حکومت تھی۔ ابتدا میں انہیں مختلف دیسی حکمرانوں کے ماتھے پر، ایجنڈا اور مختار سمجھ کر قبول کیا گیا، جب معلوم ہوا کہ انہوں نے خروانی

۲۴۶

اور عیاری سے سب کچھ سنبھال لیا تو ان کے خلاف ہم گیر
نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ کوئی بھی غیرت مند محب وطن اجنبی
تسلط کو بہ طیب خاطر برداشت نہ کر سکتا تھا۔ میر جعفر
یا اس جیسے دوسرے آدمیوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا جاسکتا
آپ سرسید کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ ”قوم نے غروں کی
حکومت اٹھا دینے کے لئے اقدام کیا: یا تھیونلس ملکات
کی تعبیر کے مطابق سمجھ سکتے ہیں کہ ”یہ ایک قومی تحریک تھی
جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کو غروں کے تسلط سے نجات
دلائی جائے“

باقی رہے دوسرے اسباب جن کا ذکر سرسید نے کیا ہے
یا جن کا ذکر شدہ کے متعلق عام کتابوں میں ملتا ہے تو وہ
سب اصل بنیادی سبب کے لئے تقویت و استحکام کے

(ص ۲۲)

باعث بنے
مہر صاحب نے کتاب کے آخر ضمیمہ کے ذیل میں اپنی اسی
بات کو پھر دہرایا ہے، اور اس کی تائید میں ایک انگریز کے
مضون کا اقتباس بھی پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

”میں نے کتاب میں ایک سے زیادہ مرتبہ عرض کیا کہ شداء
کی تحریک عام تھی، ملک کے تمام حصے اور اس میں بسنے والے
تمام طبقے اس سے متاثر ہوئے۔ بعض لوگ وقتی حالات کی

۲۴۷

سازگاری سے فائدہ اٹھا کر میدان عمل میں آگئے، بعض قیادت سے محمدی کے باعث کچھ نہ کر سکے۔ بیشتر انگریزوں کا خیال تھا کہ اسلامی بغاوت ہے۔ اس لئے کہ مسلمان اس تحریک میں بہت پیش پیش تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فرقہ وارانہ تحریک نہ تھی، اور اس کی غرض سیاسی آزادی تھی۔ اگرچہ فوج میں اس کا آغاز چربی والے کارکنوں سے ہوا۔

اس کے بعد مہر صاحب نے لاہور کے انگریزی اخبار ”پنجابی“، بابت ۱۱ جولائی ۱۸۵۷ء کے حوالے سے ایک مضمون کا کچھ حصہ نقل کیا ہے جس کی بابت انہوں نے لکھا ہے کہ ”غالباً کسی انگریز نے لکھا تھا“ مہر صاحب کا نقل کردہ حصہ یہ ہے۔

”اس میں شک نہیں کہ موجودہ جنگ مذہبی نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اور ”دین“ دین کے جس نعرے سے ہندوستان کے طول و عرض میں گونج پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی تہ میں تمام باشندگان ہند کی کوشش یہ ہے کہ اجنبی اور غیر ملکی حکومتی سے آزادی حاصل کریں۔ یہ محکومی زیادہ سے زیادہ تلخ و ناخوش گوار محسوس کی جا رہی ہے، اس لئے کہ یہ اہل ملک کے قدیم مرغوبات و میلانات کی بے حرمتی پر مبنی ہے اور یہ محکومی ایک ایسی طاقت کی طرف سے عائد ہوئی ہے جسے مفتوحین سے رنگ، عقیدے، زبان رائے، عادات، خیالات، احساسات یا تصورات و اقلویات

۲۴۸

میں کسی بھی نوع کی یکسانی نہیں ہے

(۱۳۵۵ء ۱۳۵۶ء)

ان اقتباسات کے پڑھنے کے بعد میں میاں صاحب اور دوسرے اکابر علماء عصر کی فراست ایمانی، اور بالغ نظری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حقیقت کو تاریخ کے محققین نے تحریک کے منظر و پس منظر کا پوری طرح جائزہ لینے اور ہزاروں صفحات کا مطالعہ کرنے کے بعد پایا ہے، اس کو ان حضرات نے پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا تھا۔ محققین کے فیصلے کے مطابق جب یہ جنگ مجموعی حیثیت سے محض "قومی جنگ" تھی۔ اور اس کو خالص اسلامی تحریک قرار دینا بالکل بے سرو پا ہے۔ اس کی تہ میں غیر ملکی حکومت سے سیاسی آزادی حاصل کرنے کے سوا اور کوئی دوسری بنیادی غرض نہ تھی بالفاظ دیگر اس عام شورش اور ہنگامے کا مقصد یہ نہ تھا لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا د تاکہ اللہ کا کلمہ اونچا ہو کر رہے، تو پھر ہمیں اُن علماء کو جنہوں نے اس عام ہنگامے کو اسلامی جہاد (قتال فی سبیل اللہ) ہونے کا فتویٰ نہیں دیا تھا۔ بطعون کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ کہیں ہمیں تو غلطی پر نہیں ہیں؟ نامناسب نہ ہو گا اگر اس موقع پر ایک حدیث نقل کروں۔

عن ابی موسیٰ قال سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الرجل یقاتل شجاعة و یقاتل	حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو اپنی بہادری دکھانے کے
--	---

حمیة و یقاتل ریا عای ذلک
فی سبیل اللہ فقاتل رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم من قاتل
لتکون کلمة اللہ ہی العلیا نہی
فی سبیل اللہ .
(صحیح مسلم ج ۲ و بخاری ص ۲۳ ج ۱)

لئے لڑتا ہے، یا کسی بات کو اپنے لئے عار سمجھ کر
اس عار کو دور کرنے کیلئے لڑتا ہے، یا شہرت
کیلئے لڑتا ہے، تو ان میں سے کوئی جنگ
فی سبیل اللہ کی راہ میں ہے، رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان میں سے
کوئی بھی فی سبیل اللہ نہیں ہے، فی سبیل اللہ

صرف وہ لڑائی ہے جو اس مقصد سے لڑی
جائے کہ اللہ کی بات غالب اور اونچی ہو کر رہے
اس موقع پر لفظ "حمیة" خاص طور سے قابل غور ہے۔ اس کی تفسیر
امام نوویؒ نے کی ہے ہی الانفة والفیوة والھامامة عن عشیرتہ یعنی کسی
بات کو عار سمجھ کر اس سے بیناری اور ناگواری ظاہر کرنا۔ یا کسی بات پر بغیر
آنا، یا اپنی قوم، قبیلہ، خاندان کی حمایت کرنا۔ حدیث کی اس تشریح اور
تاریخ کے مذکورہ بالا بیانات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ شرعی نقطہ نظر سے
آپ کا یہ طعنہ کہاں تک درست ہے ؟

لیکن واضح رہے کہ ۸۵۷ء کے ہنگامے کو جن لوگوں نے مذہبی جنگ کے
بجائے قومی جنگ کہا ہے، ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ جتنے لوگوں نے اس
جنگ میں حصہ لیا وہ سب کے سب ایسے ہی تھے۔ کسی کا مقصد بھی دین کا
تحفظ اور کلمۃ اللہ کا اعلاؤ نہ تھا۔ حاشا ثم حاشا۔ بلکہ یہ بات اس جنگ
کی مجموعی حیثیت کے لحاظ سے کہی گئی ہے۔ ورنہ افراد کے اعتبار سے بلاشبہ

۲۵۰

ایسے بہت سے حضرات نے بھی اس میں حصہ لیا ہے جن کا خلوص مسلم، جن کے امدادوں کی پاکیزگی، عزائم کی سر بلندی اور مقاصد کی نیکی شہادت سے بالائے شبہ ہے۔ اس وقت اس ہنگامے کی عام اور مجموعی حیثیت زیر بحث ہے افراد اور شخصیات پر گفتگو کرنا پیش نظر نہیں ہے۔

تفریع ب کے متعلق | کسی خاص ہنگامے اور لڑائی میں (عدم شرکت کی تشریح و وجہ بیان کرتے ہوئے) شرکت نہ کرنے

سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ میاں صاحب نے سیاست سے بالکل ہی علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ جبکہ مولانا سندھی (رحم) کو اہلحدیثوں سے خاص طور پر بغض اور عداوت تھا) یہ اعتراف کرتے ہیں کہ

”مولانا نذیر حسین دہلوی اور مولانا عبداللہ غزنوی بھی مولانا ولایت علی کی پارٹی سے خاص تعلق رکھتے تھے“

(سیاسی تحریک ص ۱۳۲)

ذیل کا اقتباس ایک جگہ پہلے بھی گزر چکا ہے، مگر ضرورت کا تقاضا ہے کہ ایک بار پھر اس کو نقل کیا جائے۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں۔

”مولانا ولایت علی کی تحریک کے متعلق ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ مولانا اسماعیل شہید کی اس خاص جماعت کو جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، زندہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اسی لئے مولانا نذیر حسین اور نواب صدیق حسن جیسے عالم بھی ان کا ساتھ دیتے

(سیاسی تحریک ص ۱۳۲)

ہیں“

مولانا ولایت علی اور ان کی پارٹی کے ساتھ خاص تعلق رکھنے والے اور ان کا "ساتھ دینے والے" کی خدمت یہ گمان کرنا کہ اس نے سرت سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، یقیناً افسوسناک بدگمانی ہے۔ اس پارٹی کا ساتھ دینے والے اتنے خفیہ اور رازدارانہ طریقے سے امداد کا کام انجام دیتے تھے کہ سب کی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں تھیں۔ حتیٰ کہ انگریز بھی میاں صاحب کے متعلق قانونی طور پر اس "جرم" کا ثبوت دینے سے قاصر رہا۔ ۱۹۶۴ء کے مقدمہ بغاوت میں جس کا ذکر آگے اپنے موقع پر آئے گا، میاں صاحب بھی ماخوذ ہوئے اور کم و بیش ایک سال تک راولپنڈی جیل میں نظر بند رہے۔ اس دوران میں تفتیش ہوتی رہی مگر "جرم" ثابت نہ ہو سکا اس لئے رہا کر دیئے گئے۔ لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ حضرت میاں صاحب واقعی سرحد پار کے مجاہدین کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رکھتے تھے اور نہ ان کی کسی قسم کی امداد کرتے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر نے سید نصیر الدین دہلوی کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا طویل تذکرہ لکھا ہے۔ اُسی کے ذیل میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مولوی صاحب نے (یعنی سید نصیر الدین دہلوی نے) جو اعلام نامے پیچھے وہ تمام مسلمانوں کے نام تھے۔ لیکن ایک مکتوب میں انھوں نے اپنے خاص مخاطبین کے نام بھی درج کر دیئے ہیں جو اس غرض سے یہاں پیش کئے جاتے ہیں کہ

۲۵۲

اول مولوی صاحب کے دائرہ دعوت کی وسعت کا اندازہ ہو جائے، دوسرے یہ معلوم ہو جائے کہ اس تاریک دور میں کون کون اصحاب دعوت حق کے خیر مقدم میں پیش پیش تھے؟
(مرگد شرت مجاہدین ص ۱۷۳)

اس کے بعد مہر صاحب نے ناموں کی جو تفصیل پیش کی ہے ان میں شیخ اکل حضرت میا نصاحب سید نذیر حسین محدث و ملوی کا نام نامی بھی ہے، بقول مہر صاحب اس سے معلوم ہوا کہ اس تاریک دور میں حضرت میا صاحب بھی دعوت حق کا خیر مقدم کرنے میں پیش پیش تھے۔

انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتوے پر دستخط نہ کرنے کا یہ مطلب نکالنا کہ میا صاحب

تفریع ج کے متعلق
گورنمنٹ انگلشیہ کے وفادار تھے۔ اور اپنی وفاداری کا مظاہرہ کرنے کی غرض سے انھوں نے یہ کام کیا تھا۔ یا تو غلط قسم کی حسن ظنی ہے۔ یا افسوسناک بدگمانی۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں یہ دونوں ہی جذبات کام کر رہے ہیں۔ یعنی انگریزی اقتدار کے دور میں جو لوگ انگریزوں کی وفاداری ہی کو خوبی اور کمال سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے جذبات کے ماتحت ازراہ حسن ظنی میا صاحب کو بھی انگریز کا وفادار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ ان کے زعم میں میا صاحب کی نیک نامی اسی میں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ غلط قسم کی حسن ظنی ہے۔ اسی کا شکار ہو گئے ہیں میا صاحب کے سوانح نگار مولوی فضل حسین صاحب

مظفر پوری اور بعض دوسرے حضرات ۔

دوسری طرف کچھ ایسے لوگ ہیں جو ملک کی آزادی کے بعد جماعت
الہدیت کو دانستہ یا نادانستہ طور پر بدنام کرنا چاہتے ہیں اس لئے
ایسے واقعات کے متعلق وہ بدگمانی سے کام لے رہے ہیں ۔ اور اپنی
بدگمانی کے ثبوت میں خود میاں صاحب کا کوئی قول پیش کرنے یا ان
کی کسی عبارت کا حوالہ دینے کے بجائے انگریزوں کی چٹھیاں دکھاتے
ہیں ، یا مولوی فضل حسین صاحب جیسے لوگوں کے اقوال سامنے لاتے
ہیں ۔ حالانکہ اس شدید الزام کے ثبوت کے لئے یہ دلیلیں ہرگز کافی
نہیں ہیں ۔

اس معاملہ میں قول فیصل میاں صاحب ہی کا کلام ہو سکتا ہے لیجئے
ہم میاں صاحب کا وہی قول یہاں نقل کرتے ہیں جس کو الحیاء بعد المماۃ
کے مصنف و مولوی فضل حسین صاحب مظفر پوری نے ”گورنمنٹ
انگلشید کے ساتھ وفاداری“ کے نمایاں عنوان کے ذیل میں ذکر کیا ہے
میاں صاحب فرماتے ہیں ۔

میاں وہ ٹکڑ تھا، بہادر شاہی نہ تھی، وہ بیچارہ بوڑھا بہادر
شاہ کیا کرتا، حشرات الارض خانہ براندازوں نے تمام دہلی کو
خراب، ویران، تباہ، برباد کیا، شرائط امارت و جہاد بالکل
مفقور تھے، ہم نے تو اس فتوے پر دستخط نہیں کیا، تھر کیا کرتے
اور کیا لکھتے (الحیاء بعد المماۃ ص ۷)

۲۵۴

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس عبارت سے کس طرح میاں صاحب کے ”جذبہ وفاداری“ کا ثبوت ہوتا ہے۔ جبکہ انھوں نے برملا یہ فرمایا ہے کہ اس فتوے پر دستخط نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس ہنگامے میں امارت اور جہاد کے شرائط بالکل مفقود تھے۔ یعنی کسی شرعی امیر کے ماتحت اور اس کے احکام و ہدایات کے مطابق یہ جنگ نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ ایک بھیڑ تھی جو کسی ضبط و نظم کے بغیر اور شریعت اسلامیہ کی جنگی تعلیمات کی پیروی کا لحاظ نہ کرتے ہوئے لوٹ مار، اور قتل و غارت کا بازار گرم کئے ہوئے تھی، بالفاظ دیگر اس فتوے پر دستخط نہ کرنے کا محرک وفاداری کا جذبہ نہیں تھا، بلکہ اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ میاں صاحب کے نزدیک کتاب و سنت کی روشنی میں اس پر اسلامی جہاد کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔

اب رہا یہ کہ میاں صاحب نے اس وقت کی جو صورت حال بیان فرمائی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟ تو اس کے جاننے کے لئے ہم تاریخ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی نے ”غزوہ دہلی“ کے افسانے کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو کئی حصوں میں چھپی ہے اس وقت اس کا دوسرا حصہ چارے ساٹنے ہے۔ اس کے مختلف مقامات سے کچھ اقتباسات ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے بہادر شاہی حکومت کی کس پیرسی کا حال پڑھئے۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں:-

بادشاہ کا حکم شاف و نادرس ہی مانا جاتا تھا اور شہزادوں کو تو کوئی پوچھتا تک نہ تھا کہ تم ہو کس مرض کی دوا۔ سپاہیاں لکل بے سری ہو گئی تھیں۔ نہ بگل کو مانتے تھے نہ افسروں کی سنتے تھے اور نہ اپنا متعلقہ کام انجام دیتے تھے۔ فوج کی گنتی تو ایک طرف رہی، سمجھی ہو رہی بھی نہیں رہی (۲۹)

”ہلٹر بازی“، اسے میاں صاحب کا مقصد ہی تھا کہ اس شورش میں نہ کوئی امیر تھا اور نہ کوئی مامور۔ نہ کوئی اصول تھا اور نہ کوئی قانون۔ جس کے جی میں جو آتا تھا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب کے بیان کے مطابق جب تنخواہ دار سپاہ اور فوج کا یہ حال تھا کہ وہ بہادر شاہ کے قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ تو پھر دوسروں کا کیا کہنا۔

اس ہنگامے کو جن لوگوں نے برپا کیا تھا اور جس مقصد سے کیا تھا اس کا اعلان انھوں نے پہلے ہی کر دیا تھا جیسا کہ خواجہ صاحب نے لکھا ہے۔ ”غدر ہونے سے تقریباً ایک مہینہ پہلے یکم اپریل ۱۸۵۷ء کو ایک اشتہار اس مضمون کا جامع مسجد دہلی میں چسپاں کیا گیا تھا کہ اگر می کو دہلی لوٹی جائے گی اور بڑا کشت و خون ہوگا مگر اس وقت حکام نے اس طرف توجہ نہیں کی اور معمولی بات سمجھ کر ہنسی میں ٹال دیا گیا۔ شمالی و مغربی اضلاع کے اخبارات نے بھی اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ عام لوگ بھی بے فکر اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہے۔ یہاں تک کہ اگر می کا وہ

۲۵۶

خوفناک دن آگیا۔ اور میرٹھ کے مفسدین کا ایک گروہ صبح کے وقت، رنجے کشتیوں سے دریا عبور کر کے شہر میں داخل ہو گیا۔

اس کے بعد کیا کیا ہوا اس کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ صاحب لکھتے ہیں:-
 اس کے بعد بلوائی دیوان عام کی طرف گئے وہاں
 دو معصوم مسیں بھٹیں ان کو بھی ان سنگدلوں نے نہ چھوڑا اور
 بندوق کا نشانہ بنا دیا۔ وہاں سے نکل کر سیدھے دریا گنج
 کا رخ کیا اور یہاں آکر تمام مکانوں کو آگ لگا دی۔ یہ مکانات
 زیادہ تر انگریزوں کے تھے۔ اس عرصہ میں ایک اور جھڑپ
 مفسدوں کی شہر میں گھس آئی اور اتنے ہی شہر کے بچوں اور
 شہدوں سے کہا کہ تم لوگ شہر کو خوب لوٹو ہمیں اس سامانِ نعمیت
 میں ہاتھ لگانا حرام ہے۔ جو بلوائی دریا گنج کو جلا رہے تھے
 انھوں نے وہاں پانچ انگریزوں اور دو سیموں کو اور مار ڈالا
 جب دریا گنج جل کر خاک سیاہ ہو گیا تو وہاں سے مفسد
 بٹیک کی کوچی پر گئے، اس کو بھی آگ لگا کر جلا ڈالا، اور پانچ
 فرنگیوں کو جان سے ہلاک کر دیا۔ پھر وہاں سے کو توالی گئے
 اور بد معاشوں سے کہہ دیا کہ شہر کو لوٹو۔ کو تو وال خوف زدہ
 ہو کر کو توالی چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اور کوئی تدبیر غریب غریبا
 کے بچانے کی نہ کی۔ کو توالی سے سکتے صاحب مرحوم کی کوچی پر

۲۵۷

پہنچے مگر اس کو آگ نہیں لگائی۔ لیکن وہاں گرجا اور گرجا کے
 قرب وجوار میں جس قدر مکانات تھے سب میں آگ لگا دی
 اور جلا کر خاک کا ٹوہیر کر دیا۔ اور جس قدر میمیں اور فرنگی تھے
 سب کو مع ننھے ننھے بچوں کے قتل کر ڈالا (ص ۳۱).....
 دہلی کے گرد و نواح کے جس قدر دیہاتی تھے سب اٹھ کھڑے
 ہوئے اور لوٹ مار شروع کر دی (ص ۳۲)..... فساد یوں
 نے جب دہلی کو اچھی طرح لوٹ لیا تو دوسو سو گڑکانوہ کی طرف
 گئے اور وہاں بھی فتنہ و فساد لوٹ گھسٹا اور آتش زنی کا بار
 گرم کر دیا (ص ۳۳)..... دریا گنج میں جس قدر عیسائی
 رہتے تھے وہ سب فساد کے روز ایک کوٹھے پر جمع ہوئے
 اور تین چار دن تک وہاں قائم رہے..... جب تک
 یہ لوگ کوٹھے پر رہے کھانے پینے کی کوئی چیز ان کے پاس
 نہیں پہنچی۔ غریب معصوم ننھے ننھے بچے بھوک پیاس سے
 ہلک رہے تھے۔ ان کم بخت سنگدلوں نے لڑکیوں سے کہا
 کہ اگر تم نیچے اتر آؤ تو ہم تمہیں کھانا پانی سب کچھ دیدیں
 گے۔ مگر جب وہ معصوم نیچے اترے تو فوراً قتل کا اشارہ
 کیا اور سب معصوموں کو ذبح کر ڈالا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد
 قتل عام شروع ہو گیا (ص ۳۴)..... غرضیکہ اس فساد
 میں نہایت سخت وحشیانہ ظلم و ستم کئے گئے بچے رحم مادر سے

۲۵۸

نکالے گئے، ننھے ننھے بچے تلوار اور نیزوں کی نوک پر اٹھا کر بازاروں میں فخریہ پھرائے گئے۔ عورتوں کو برہنہ کر کے نہایت ذلت و خواری سے قتل کیا گیا۔۔۔۔۔ (ص ۶۳)

ان اقتباسات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس ہنگامے میں حصہ لینے والوں کے ظلم و ستم کا نشانہ صرف انگریزوں کی جان و مال اور انھیں کی عورتیں اور بچے نہیں تھے بلکہ شہر کے دوسرے باشندوں کو بھی خوب لوٹا کھسوتا گیا۔ اور جان و مال تباہ کیا گیا۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے ایک جگہ اس کے متعلق صاف صاف بھی لکھا ہے۔ لکھتے ہیں :-

مفسدین نے صرف انگریزوں ہی کے ساتھ ظلم و زیادتی نہیں کی بلکہ شہر والوں کیساتھ بھی وہ وہ ظلم کئے کہ الامان والحفیظ، دہلی شہر ہمیشہ سے دولت مند مشہور ہے، مفسدین خوب جانتے تھے اسی لئے خوب جی کھول کر اسے لوٹا۔ ایک ہندوستانی جو اس درمیان یعنی ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء جون تک دہلی میں تھا شہر کی کیفیت اس طرح بیان کرتا ہے کہ مفسدوں نے شہر کے باشندوں کا ایک گھوڑا بھی نہیں چھوڑا۔ سب چھین لے گئے۔ اکثر و کاندلاں کو محض اس قصور پر جان سے مار ڈالا کہ وہ واجبی قیمت مانگتے

تھے۔۔۔۔۔ شہر کے باشندے اور وکاندار سب ہی افسوس کرتے تھے۔ اہل حرفہ کی حالت فاقہ کشی تک پہنچ گئی تھی۔ بیوہ عورتیں مکانوں میں بیٹھی رویا کرتی تھیں، اور صبح سے شام تک

۲۵۹

مفسدین کو بدو عادی کرتی تھیں..... مفسدوں کو شہر
 میں جہاں نقد روپیہ نظر آتا فوراً لوٹ لیتے تھے، یہ سب
 روپیہ ابھی تک سپاہیوں کے قبضہ میں تھا اور خزانہ شہر
 میں ایک جگہ داخل نہیں ہوا تھا۔ بعض رجمنٹوں کے پاس
 اس قدر روپیہ جمع ہو گیا تھا کہ وہ بمشکل حرکت کر سکتے تھے
 (ص ۲۴)

تاریخ کی اس شہادت کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ صورت حال کی
 نسبت میاں صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ لفظ بلفظ صحیح ہے
 یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو اس صورت حال کا حوالہ دیتے ہوئے جب
 میاں صاحب نے خود ہی اپنے دستخط نہ کرنے کی وجہ بتادی ہے تو
 اب اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ مولوی فضل حسین صاحب یا ان
 کے جیسے کسی دوسرے عقیدتمند کا اس سے ”جذباتہ و فاداری“ پر استدلال
 کرنا، درحقیقت اپنے جذبات کی ترجمانی ہے، میاں صاحب کی نہیں۔
 اسی لئے بعض حنفی مورخین نے بھی مولوی فضل حسین صاحب کی اس
 روش کو ناپسند کیا ہے۔ اور اس کو ”سعی لا حاصل“ کہا ہے۔ چنانچہ مفتی
 انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی نے ”علمائے حق اور ان کی مظلومیت
 کی داستانیں“ کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس کے ص ۱۰۹ تا ص ۱۱۰ پر میاں
 صاحب کے کچھ خطرات بھی لکھے ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں: ”
 فضل حسین مظفر آبادی نے الحیاۃ بعد الماتہ میں میاں صاحب کے

وقت کا لحاظ رکھ کر وفادار ثابت کرنے کی سعی لا حاصل کی ہو۔

(ص ۱۱)

حقیقی صاحب کا مطلب ظاہر ہے کہ جن چیزوں سے میاں صاحب کے ”وفاداری“ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان میں سے کسی سے بھی یہ مدعا حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے وقت کی مصلحت کے لحاظ سے اگرچہ یہ کوشش کی گئی مگر یہ کوشش لا حاصل اور بے نتیجہ ہے۔

اب دوسرے نقطہ نظر کو لیجئے۔ یعنی یہ جو ہم نے کہا ہے کہ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد اس دستخط نہ کرنے والی بات کو طنز و تعریض اور تنقیص و توہین کی شکل میں پیش کرنے والے بدگمانی سے کام لے رہے ہیں تو مذکورہ بالا تفصیلات سے ہماری اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ جب معلوم ہو گیا کہ میاں صاحب کے نزدیک دلائل شرعیہ کی رو سے مسئلہ کی نوعیت یہی تھی کہ اس پر اسلامی جہاد کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ تو اب خواہ مخواہ ان کی نیت پر حملہ کرنا، اور بلا وجہ اس کو ”وفاداری“ کے جذبے پر محمول کرنا، بدگمانی نہیں تو اور کیا ہے؟

مولانا غلام رسول مہر نے اس معاملہ میں بہت مناسب اور معتدل راہ اختیار کی ہے۔ انھوں نے اس ہنگامے میں شریک ہونے اور نہ ہونے کو ایک ”اجتہادی مسئلہ“ قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس بارے میں علماء کا اختلاف، نقطہ نظر کا اختلاف تھا۔ اس لئے اجتہاد کی رو سے ان کی رائیوں کی بابت خطایا صواب کا حکم تو لگایا جاسکتا ہے، لیکن ان

میں سے کسی کو ملزم گرداننے اور مطعون کرنے کا ہم کو حق نہیں ہے۔ مہر صاحب لکھتے ہیں۔

۱۸۵۷ء میں ملک کے اندر جگہ جگہ آزادی کی جدوجہد کی گئی، اگرچہ دہلی یا دوسرے مقامات کے بعض بزرگوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک کو درست ماننے سے انکار کر دیا تھا، تاہم ان میں سے بعض نہایت بلند پایہ افراد اس میں شریک رہے۔ مثلاً بزرگان دیوبند، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مولانا سرفراز علی جوہوری، مولانا رحمت الشکر لہنوی..... بہر حال یہ اجتماعی مسئلہ تھا ایک گروہ نے اس پر ایک نقطہ نگاہ سے غور کیا، دوسرے نے دوسرا نقطہ نگاہ پیش نظر رکھا۔ ایک کی رائے یہ تھی کہ آزادی حاصل کرنے کے جو ممکنات پیدا ہو گئے ہیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اور جس حد تک مسلکی قوتوں کو منظم کیا جاسکتا ہے، کر دینا چاہیے۔ دوسرے گروہ کی نظر اس پہلو پر گئی کہ ملکی قوتوں میں تنظیم نہیں، اور تحریک نے فی الجملہ ہنگامہ عام کی حیثیت اختیار کر لی ہے، جسے عرفاً بیلوا کہتے ہیں اور شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں پہلے گروہ کی رائے صائب تھی اور دوسرے گروہ کو اگرچہ ملزم نہیں گردانا جاسکتا، تاہم اس کی رائے صائب نہ تھی۔ اس نے ذرائع کے باب میں حد درجہ

مبالغہ آمیز تصور مناسب سمجھا، جس میں مقصد نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بلاشبہ تحریک کی بے تنظیمی کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، یہاں تک کہ اگر کہا جائے ناکامی کا سب سے بڑا سبب بے تنظیمی ہی تھی تو یہ غلط نہ ہو گا۔ بے تنظیمی ہی کے باعث بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جن کے لئے اخلاقی یا قانونی یا شرعاً کوئی وجہ جواز پیش نہیں کی جاسکتی مثلاً دہلی یا جھانسی یا کان پور یا بعض ایسے ہی دوسرے مقامات پر انگریزوں کا قتل یا بعد حوالگی و ستار کہ ان پر قاتلانہ حملے، ذمہ دار آدمی نہ خود ایسے افعال کے مرتکب ہو سکتے تھے اور نہ کسی دوسرے کو ارتکاب کا موقع دینے کے لئے تیار ہو سکتے تھے۔۔۔۔۔

(۱۸۵۷ء ۳۵۵)

اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ مہر صاحب کے اس بیان میں بھی میاں صاحب کی بہت سی باتوں کی تصدیق و تائید موجود ہے

تفریع کے متعلق کم از کم میرے لئے تو بڑا دروانگیز اور تکلیف پہنچاؤ چھو تو یہی وہ تو بین آمیز الزام ہے جو وہ ثابت ہوا ہے۔ میں نے جس وقت ان نفروں کو پڑھا کہ سرخیل علماء مولانا سید نذیر حسین کے وقت سے لیکر اب تک آپ کے علماء و مشائخ نے سیاست اور عملی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا، تو روز و کرب سے تھلا اٹھا۔ اور کہی دنوں تک اس کی چیخیں محسوس کرتا رہا۔ بالآخر اسی

۲۶۳

اضطراب اور بے چینی کے عالم میں فیصلہ کیا کہ اس ظلم اور بے انصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی ہے، خواہ انجام کچھ بھی ہو۔ تکلیف کا احسا اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب یہ دیکھتا ہوں کہ علماء کے جمود و خود کی ذمہ داری "سرخیل علماء مولانا سید نذیر حسین" کے سر ڈالی جا رہی ہے۔ حالانکہ تاریخ اس الزام کا قطعاً ساتھ نہیں دیتی۔

یہ سمجھنا یقیناً غلط ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں میاں صاحب شامل نہیں ہوئے، اس کا یہ اثر ہوا کہ اُسی وقت سے علماء اہل حدیث سیاسیات سے الگ ہو گئے۔ اور ایسا الگ ہوئے کہ کبھی کسی نے، کوئی حصہ نہیں لیا۔ میں آگے چل کر انشاء اللہ اس کو ثابت کروں گا کہ تاریخ آزادی کا کوئی دور ایسا نہیں ہے۔

جس میں اہل حدیث علماء اور عوام نے حصہ نہ لیا ہو۔ سب سے پہلے اسی ۱۸۵۷ء ہی کی تحریک کو لے لیجئے۔ مولانا مہتر صاحب اسکی نسبت لکھتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں بھی اہل حدیث علماء نے حصہ لیا ہے

سید صاحب کے خلیفہ اور ان کی جماعت مجاہدین کے امیر مولانا عنایت علی صادق پوری بھی اس تحریک کے ساتھ تھے، بلکہ انگریزوں کا خیال ہے کہ مردان میں رجمنٹ ۵۵ء کی بغاوت مولانا عنایت علی ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اور خود انھوں نے نارنجی علاقہ سرحد میں محاذ قائم کر کے جنگ شروع کر دی تھی۔ (۱۸۵۷ء ص ۳۵۳)

۲۶۴

مولانا عنایت علیؒ کا اہلحدیث ہونا ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ بنگال اور بہار کے اہلحدیث بڑی تعداد میں ان کے ساتھ تھے اور ہر طرح ان کے معاون و مددگار تھے۔

○ ————— مہر صاحب نے مقدمہ انبالہ جس کی تفصیلات لپینے موقع پر آئندہ پیش کی جائیں گی کے ملزمین کے ذیل میں مولوی جعفر صاحب تھانویؒ (اہلحدیث) کا نام بھی ذکر کیا ہے۔ اور ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے :-

”بعض بیانات کے مطابق یہ شخص ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بھی چند ساتھیوں کو لے کر انگریزوں کے خلاف لڑنے کی غرض سے دہلی گئے تھے۔“ (سرگزشت مجاہدین ص ۸۵)

○ ————— مولانا سید جلال الدین احمد جعفری بنارسى ابن مولوی سید عبدالاعلیٰ ایک ممتاز اہلحدیث عالم گذرے ہیں۔ ان کے حالات میں مولوی ابوبکھی امام خاں صاحب نوشہروی لکھتے ہیں:-

اکثر علوم متعارفہ اپنے والد ماجد اور مولوی احمد اللہ صاحب محدث (بنارسى) سے پڑھ کر کانپور اور دہلی تشریف لے گئے، دہلی میں مولوی محمد اسماعیل صاحب سے تکمیل فرمائی۔ اور حدیث کی تکمیل مولانا عبدالحق محدث (بنارسى) سے عمل بالحدیث اہل سنت کا دلولہ بھی انھیں بزرگ کے فیض صحبت سے پہنچا چنانچہ مولوی خرم علی صاحب، سے مسئلہ فاتحہ خلف الامام

میں آپ کا مناظرہ مشہور ہے، اکی سچشہ پر آپ نے بربان،
 فارسی رسالہ فاتحہ الصواب فی قراءۃ فاتحہ الکتاب، محرم ۱۲۵۶ھ
 میں تصنیف فرمایا۔ پھر اس کا خلاصہ بربان اردو ہمام ازبۃ اللباب
 فرمایا جو مطبع، سعید المطابع میں طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ آپ
 بے حد ذہین تھے حفظ قرآن کا شوق ہوا تو روحان کی پہلی کوالنزام
 کیا دن میں ایک پارہ حفظ کر لیتے اور شب کو تراویح میں سناتے
 خاندان میں ہر غلطی کا رواج آپ ہی کی سی سے ہوا.....
 آپ کی تصنیفات میں علاوہ فاتحہ الصواب و ربدۃ اللباب
 حسب ذیل کتابوں کا بھی پتہ لگتا ہے۔

زبدۃ القوانين، انبساط عبارۃ الکافیہ، فرنگ اخوان الصفا
 قواعد اردو وغیرہ۔ (ترجم علمائے حدیث ہند جلد اول ص ۳۲۵)

اں اقتباس سے جب یہ معلوم ہو گیا کہ سید صاحب موصوف اہل حدیث
 تھے، تو اب اس کے ساتھ ایک دوسرا اقتباس پڑھئے۔
 جناب مفتی اسحاق صاحب شہابی اکبر آبادی موصوف کی شان میں
 لکھتے ہیں:-

ہا اپنے والد اور مولوی احمد الشہنشاہی کے شاگرد تھے، سند حدیث
 مولوی عبدالحق بنارس سے لی، عامل بالحدیث و متبع سنت نبوی
 دقائع و متقی تھے۔ جید الحافظ، آنچناں بود کہ مدیکر و نیک پارہ
 کلام مجید حفظ نمود و وقت شرب پارہ و رمضان تراویح کی خواند

۲۶۶

آپ نے بھی پنکاسہ ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا مگر حکومت کے شکنجے سے بچ گئے۔ زبدۃ القوانین (صرف و نحو) و شرح کافیہ یادگار سے ہے۔ بنارس کالج میں پہلے مدرس تھے ۱۲۷۹ء میں بصرہ ۵

سال وفات پائی۔

(ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۱۳۷-۱۳۸)

یہ بات ہم شروع ہی میں عرض کر چکے ہیں کہ حادثہ بالاکوٹ کے بعد تحریک جہاد کی قیادت اہلحدیث علماء کے ہاتھوں میں آئی۔ اس لئے اہلحدیث تو بڑی تعداد میں سرحد ہمارے مجاہدین اور ان کے معاونین میں شامل تھے۔ اور ان کے متعلق مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا یہ بیان آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ ”مجاہدین اور ان کے معاونین ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس قومی لڑائی میں غیر جانبدار رہے“ تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ آنا دہلی کی یہ جدوجہد اہلحدیث افراد کی شرکت سے یکسر خالی ہو۔ اور انہوں نے اس میں بالکل ہی حصہ نہ لیا ہو۔

۱۸۵۷ء کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک

ملک کی کوئی بھی سیاسی تحریک ایسی نہیں ہے جس میں اہلحدیث افراد نے حصہ نہ لیا ہو۔ کانگریس، تحریک

بعد کی سیاسی تحریکات اور عملی جہاد میں علماء اہلحدیث کا حصہ

خلافت۔ تحریک احرار مسلم لیگ نے جب اس انگریز کی مخالفت کا نعرہ بلند کیا (جمعیتہ علماء ہند، جمعیتہ علماء اسلام۔ ان تمام تحریکوں اور جمعیتوں

میں اہلحدیث شریک رہے ہیں۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبد القادر
 قصوری، مولانا محمد علی قصوری، مولانا نجی الدین قصوری، مولانا سید محمد
 داؤد غزنوی، مولانا اسماعیل غزنوی، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا عبید اللہ حارثی
 مولانا ابوالوفاء شامی، مولانا ابراہیم سیالکوٹی، مولانا محمد اسماعیل گوجرانوی،
 مولانا ابوالقاسم بنارسی، مولانا ابوالقاسم محمد علی منو، مولانا محمد نعمان منو،
 مولانا محمد احمد مدنی منو، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا عبدالعستین
 رحیم آبادی، مولانا محمد ادریس خاں بدایونی، مولانا فضل الہی وزیر آبادی،
 مولانا عبدالرحیم عرف مولانا محمد بشیر، صوفی ولی محمد قسوی، دہلی کے پنجابی
 اہلحدیث، کلکتہ میں کپڑے اور لوہے کے تاجر، مدراس میں گاکا محمد عمر بنگال
 میں مولانا عبداللہ الکافی، مولانا عبداللہ الباقی، مولانا اکرم خاں قاضی
 کیس کے طرز میں، سازش کے متعدد مقدمات کے طرز میں، بنگال کے مولانا
 احمد اللہ خاں مانی مدرسہ شمس الہدی دلال پور، علم الدین تعلقدار غازی
 شہاب الدین، دین محمد منڈل، وغیرہ وغیرہ ایک طویل فہرست ہے
 ایسے علماء اور افراد اہلحدیث کی جن کا سیاسی اور عملی جہاد میں حصہ
 لینا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اور یہ ضمنی بحث دو جویاں صاحب
 کی ذہن سے متعلق چل پڑی ہے مضمون ہو جانے کے بعد ہم انشاء اللہ ان
 تمام حضرات کی سیاسی اور جہادی خدمات کی تفصیلات آپ کے سامنے
 پیش کریں گے۔

ایک سعادت اور اس کا جواب | ہم سمجھتے ہیں کہ اس دعوے کو نباہنے کے لئے

۲۶۸

کہ بد سیاست اور عملی جہاد میں ائمہ دین و علماء و مشائخ نے کوئی حصہ نہیں لیا یہ زیادہ سے زیادہ جو معذرت پیش کر جاسکتی ہے وہ یہی کہ افراد کی خدمات کا انکار نہیں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ "جماعتی حیثیت"۔
الجمعیۃ جماعت نے سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ افراد کی خدمات جماعت کی خدمات شمار نہیں کی جاسکتیں

تو گذارش یہ ہے کہ یہ منطق صرف ائمہ دینوں ہی کے حق میں قبول اعمال کی جاتی ہے؟ اس منطق کی رو سے تو ہندوستان کی مذہبی جماعتوں اور فرقوں میں کوئی فرقہ ایسا نہیں ہے جس کی بابت یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ اس نے فرقے اور "جماعت کی حیثیت" سے سیاست میں حصہ لیا ہے؟ اس لحاظ سے تو ہر مسلمان کو جو کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو یہ طعنہ دیا جاسکتا ہے کہ "آپ کے علماء و مشائخ نے سیاست اور عملی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا لاکیا جمیعہ علماء ہند پر دیوبندی فرقے کے حضرات کا غلبہ ہے، تو اس کی بنا پر یہ کہا جائے گا کہ یہ جمیعہ دیوبندی فرقے کی فرقہ دارانہ جمیعہ ہے؟ جمیعہ علماء ہند کا دستور اساسی شائع شدہ موجود ہے۔ ملاحظہ کیجئے، کیا اسکی رکنیت کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ دیوبندی عقائد کو ماننا ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ جمیعہ کی آبرو اور اسکی ساکھ اسکی عمومی حیثیت ہی کی بنا پر قائم ہے۔ جس دن یہ پردہ ہٹ جائے گا وہ اسکی موت کا دن ہوگا۔ اگر "جماعتی حیثیت" سے کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس جماعت کے تمام افراد یا اکثر افراد اس کام میں شریک ہوں۔ تو اس حیار کے لحاظ سے

بھی سیاست میں حصہ لینے والے دیوبندی حضرات کی بابت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے جماعتی حیثیت سے حصہ لیا ہے۔ اس لئے کہ دیوبندیوں میں بھی ہمیشہ سے ایک بڑا طبقہ ایسا رہا ہے جس نے انگریزوں کے خلاف کسی سیاسی تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ یہ کہیے کہ تحریک حریت کی انھوں نے ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ یہ طبقہ بھی وہ ہے جس کا سلسلہ تلمذ انھیں شیوخ و اکابر کے ساتھ وابستہ ہے جن کے سلسلہ تلمذ میں وہ حضرات ہیں جنھوں نے سیاست پر حصہ لیا۔ مولانا یہ نحویاں تک کہ اس کا اعتراف کرتے ہیں علماء دیوبند کے بھی وہ چند افراد جو ہمیشہ سے تحریک حریت کے مخالف رہے تھے۔ اور اس وقت سرکاری ملازم کے ملازم یا پینشنر تھے۔ اور ایک وہ بزرگ جو پاکستانی تحریک اسلامی تحریک سمجھے جاتے تھے، اھ ہدستہ سے نظام حیدر آباد کے ساتھ خصوصی تعلق نے سیاسی در یوزہ گروں اور ریاست کے ذلیفہ خواروں کو ان کے معتد حواریہ میں داخل کر دیا تھا جمیعتہ علماء اسلام کلکتہ میں داخل ہو گئے۔

(علماء حق حصہ دوئم ص ۳۳۶)

اس اقتباس میں ”وہ بزرگ“ سے مراد مولانا شبیر احمد عثمانی ہیں، یہ صرف ”چند افراد“ تھے یا ایک بڑی تعداد ان کے ساتھ تھی اس کا فیصلہ شک سے پہلے کے الکشن میں ہو چکا۔

”جمیعتہ علماء اسلام“ ہجرتہ علماء ہند کے مقابلے میں قائم کی گئی تھی۔ اس کا

۲۴۰

اجلاس ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۷ء کو برسرِ مکہ اہل محمد علی پادرک کلکتہ میں منعقد ہوا تھا۔ اسی اجلاس میں عثمانی صاحب موصوف کو اس جمعیت کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ یہ کیسا عجیب انصاف ہے کہ جب مطلع کرنا

عجیب انصاف

ہوتا ہے، تب تو یہاں صاحب کے بعض واقعات اور مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کے خیالات اور رجحانات کو جماعتی فیصلے کی حیثیت دیدی جاتی ہے۔ اور اس پہلے سے ۱۹۵۵ء سے لیکر آج تک کی پوری جماعت اہلحدیث اور اس کے تمام علماء و مشائخ کو دیکھی شخصیت و استثنائے بغیر ابدنام کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف جب اہلحدیث کے ان علماء و عوام کی ایک طویل فہرست پیش کی جانی ہے جنہوں نے انگریز کی مخالفت میں اپنی جانیں قربان کیں۔ پچاسیوں پر لٹکائے گئے۔ کالا پانی بھجے گئے۔ جیل کی سزائیں کائیں۔ جن کی جائدادیں ضبط ہوئیں بارہ بارہ گھنٹے تک بھوکے پیاسے رہ کر ان کو مسلسل پیٹا گیا۔ بیٹوں سے مار مار کر ان کے کھال اوچیر دی گئی۔ ان تمام واقعات کو سن کر بڑے بے نیازی کے ساتھ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ تو افراد کے کارنامے ہیں۔ ان کو جماعت کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

ہم جانتا چاہتے ہیں کہ جماعت کی وہ کونسی ایسی جامع مانع تعریف ہو؟ اور وہ کیا معیار ہے جس کی رو سے مولانا بٹالوی وغیرہ کی باتیں تو جماعت کی طرف منسوب کی جاسکتی ہیں۔ مگر دوسرے سیکڑوں اہلحدیث جہاں شہادتوں کی سیاسی خدمات اور مجاہدانہ قربانیوں کو جماعت

۲۷۱

کی طرف مہنوب نہیں کیا جاسکتا پھر اسی معیار کی رو سے ہمیں یہ بھی بتایا جائے کہ مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کے علمائے سیاست میں جو حصہ لیا ان کی نسبت تو یہ کہنا صحیح ہے کہ "جامعی حیثیت سے حصہ لیا" اس لئے وہ قابل طعن نہیں۔ لیکن اہل عیسیت کی نسبت یہ کہنا صحیح نہیں ہے اس لئے وہ قابل طعن اور مستحق ملامت ہیں۔

دوسری بات جس کا طعنہ اہل عیسویوں کو دیا دوسرا طعنہ اور اس کا جواب | گیا ہے وہ یہ ہے کہ:-

"۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مولانا نے ایک میم کی جان بچائی تھی اور اس کے معاوضہ میں ان کو کئی کئی بار انعام ملا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ہم ناظرین کو یہ بتائیں کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ میاں صاحب نے کس جذبے کے ماتحت اس میم کی جان بچائی تھی۔ یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ خود میاں صاحب کی زبانِ الحیاۃ بعد الماۃ میں منقول ہے۔ میاں صاحب کا بیان یہ ہے کہ:-

"اس زمانے میں ایک دن نماز عصر کے بعد شہر سے باہر چلا گیا، ملا محمد صدیقی پشاور میں جو اس وقت مجھ سے اصول فقہ پڑھتا تھا ساتھ تھا۔ مجھ کو کسی آدمی کے کراپنے کی آواز معلوم ہوئی۔ میں اس آواز کی جانب بڑھا، جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک میم محمد رح رومی ہے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر کہنے لگی کہ خدا کے واسطے میری

جان مہر مارو، میں نے اس کو دلاسا دیا اور کہا کہ ہم مسلمان ہیں
 ہمارے مذہب میں لڑائی کے وقت بھی کسی عینم کی عورت اور بچوں
 کی جان مارنا یا زکات دینی حرام ہے۔ تم اپنی جان سے پورے
 طرح اطمینان رکھو۔ اودا اگر تمہاری مرضی ہو تو ہم تم کو اپنے گھر
 لے چلیں اور تمہارے زخم کا علاج اور تیسارواری کریں۔ مگر چونکہ
 وہ بہت ہی ڈھیلا ہوئی تھی۔ کہنے لگی کہ اول تو ہم اپنے پاؤں
 سے چل نہیں سکتے، اور تم لوگ اگر اٹھا کر لے بھی چلو تو باغیوں
 کی گولی سے بچ نہیں سکتے وہیں نے کہا کہ اچھا ہم لوگ تم سے
 کچھ دور پر ٹھہرتے ہیں رات کو اندھیرے میں تم کو اٹھا کر لیے چلیں
 گے۔ آخر یہی ہوا کہ اندھیرے میں ہم اور ملا صدیق اٹھا کر اس
 کو اپنے رشتہ سے لائے کہ کسی فرد بشر کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی اور
 گھر میں لے جا کر شریف حسین کی ماں سے کہا کہ یہ نہایت مظلومہ
 ہے اس کی بہت دل جوئی اور خدمت کرنی چاہیے کہ مجھ
 خوشنودی خدا اور رسول ہے اس میم کو میں لے باغیروں کے باہر
 رہنے کی خبر بھی نہ دی کیونکہ خبر ہو جانے پر اس کے رہ سارے
 تین مہینے نہایت ہی تشویش اور خوف کی حالت میں بسر ہوتے
 فرماتے کہ، موسم سخت گرمی کا تھا اور وہ دن رات ایک گٹھری
 میں بند رہتی، ہر چند میری اہلیہ اس کو کہتیں کہ رات کو انگنائی
 میں آکر بیٹھو مگر وہ ڈر سے کوٹھری کے باہر نہ آتی اور اسی گرمی

۲۷۳

اللہ مجھوں کی تکلیف میں رات بھر ہاتھ اٹھائے دعا کرتی کرے

اللہ میرا قصور معاف کرے (صفحہ ۷۸)

اس واقعہ سے بھی میاں صاحب کو بقول مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی انگریز کا وفادار ثابت کرنے کی "سچی لادھاصل" کی گئی ہے۔ واقعہ کے تفصیل خود میاں صاحب کی زبانی آپ کے سامنے موجود ہے۔ پڑھئے اور بار بار پڑھئے! اور انصاف سے بتائیے کہ اس بیان میں انسانی ہمدردی اور اسلامی شریعت کی پابندی کے جذبے کے سوا، کہیں کسی نوع سے بھی اس کی گنجائش نکلتی ہے کہ ہم اس کو میاں صاحب کی کسی اخلاقی کمزوری پر محمول کریں؟ ایک مظلوم عورت جو زخموں سے چور ہو کر کمرہ رہی ہو، درد و کرب سے بے چین ہو کر رو رہی ہو، اس قدر سہمی ہوئی ہو کہ ایک مسلمان کو اپنی طرف اتار دیکھ کر چلا اٹھے کہ "خدا کے واسطے میری جان مت مارو" ایسی حالت میں اس کے ساتھ ایک رحم دل، دیندار مسلمان کا برتاؤ اس کے سوا اور کیا ہونا چاہئے تھا جو میاں صاحب نے اس وقت کیا؟ اپنے گھر کی مستورات کی سپردگی میں دیتے ہوئے میاں صاحب نے فرمایا تو یہ فرمایا کہ یہ نہایت مظلومہ ہے اس کی بہت دل جوئی اور خدمت کرنی چاہیے کہ موجب خوشنودی خدا و رسول ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ موجب خوشنودی انگریز ہے۔ اس کے فیصلے میں ہم کو وفاداری کے تمنغے اور انعامات ملیں گے۔ الحاصل میاں صاحب نے اس وقت اس میم کے ساتھ جو کچھ ہمدردی فرمائی اس کا ٹھکر صرف یہ تھا کہ وہ مظلومہ تھی،

۲۷۴

یہ نہیں کہ وہ انگریز تھی میاں صاحب امیروں سے ملنا ناپسند کرتے تھے
دیکھو مکاتیب نذیریہ ص ۱۷۱ تو کسی رقم کی لالچ وہ کیا کرتے ۔

اس وقت انگریزوں کے خلاف جو عام

انعام کی توقع سے زیادہ

اپنی جان کا خطرہ تھا

بچوں کے ساتھ کسی ہمدردانہ سلوک کے صلے میں انعام پانے کی توقع قائم
کرنے سے کہیں زیادہ خطرہ خود اپنی جان اور مال کی ہلاکت کا تھا۔ اس قسم
کا شبہہ بھی اگر کسی شخص کے متعلق ہو جاتا تھا تو اعلیٰ اس کو قتل کر دیتے
تھے، اور اس کا گھر بار لوٹ لیتے تھے، مولانا مہر لکھتے ہیں۔

”البتہ انگریزوں سے تعلق کا الزام بہت خطرناک تھا جس پر یہ

الزام لگ جاتا اُسے پناہ نہ ملتی، حکیم احسن اللہ خاں پر شروع

ہی سے یہ الزام تھا اور اس کا گھر لوٹ گیا۔ ایک مرتبہ جان شکر

سے بچی، بعض بد معاشوں نے بے گناہوں پر یہ الزام لگا کر ان

کے گھر یا دکانیں لٹوا دیں۔ کشمیری اور موری دروانے کے

نان بائیوں کو اس الزام میں قتل کر دیا گیا کہ وہ ڈبل روٹیاں

تیار کر کے انگریزوں کو بھیجتے تھے (۱۸۵۷ء ص ۱۳۷)

مہر صاحب ہی نے نواب حامد علی خاں رحوا عماد الدولہ میر فضل علی خاں

نائب السلطنت اودھ کے بھانجے اور داماد تھے کی نسبت لکھا ہے کہ۔

۱۸۵۷ء کا روز ناچہ ملاحظہ کیجئے

۲۷۵

”انہوں نے چھاؤنی کے جرنیل کی بیٹی اور ایک صاحب کی بیوی کو
گھر میں چھپایا تھا۔ یہ راز فاش ہو گیا۔ لوگ ہجوم کر کے آئے
اور ان کا گھر لوٹ لیا۔ وہ ششہنرادہ ابو بکر کی پناہ لے کر بچے
(۱۸۵۷ء سنہ ۱۲۷۸ھ)

ان حالات کے باوجود میاں صاحب اور ان کے ساتھیوں نے اس خطرے
کو اپنے لئے مول لیا۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان حضرات کو شریعت
کی پابندی کے مقابلے میں خطرات کی پرواہ نہیں تھی۔

اس واقعہ کی تفصیلات کے بارے میں واقعہ

تھکڑوں کے بیان میں کچھ اختلاف ہے۔ مثلاً

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ مولانا غلام رسول

**واقعہ کی بابت ایک
دوسری روایت**

صاحب (قلعہ والے) اور مولانا عبداللہ صاحب غزنوی نے اس
عدوت کی جان بچائی تھی، بعض نے لکھا ہے کہ مولوی عبدالقادر صاحب
(جو حضرت میاں صاحب کے سالے اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے خسر
تھے) اس میم کو اٹھاکرا اپنے گھر لائے تھے۔ اور علاج معالجہ کیا تھا۔ بعض
نے لکھا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب اس کو اٹھا کر لائے تھے اور میاں صاحب
کے گھر پہنچا دیا تھا۔

بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں میاں صاحب اور مولوی عبدالقادر
صاحب مذکور دونوں پنجابی کثرہ میں آباد تھے۔ ان کے گھر محلہ کی مسجد
(راوندنگ آبادی) سے بالکل ملے ہوئے تھے۔ اسی مسجد میں مولانا غلام

۲۷۹

رسول صاحب اور مولانا عبداللہ صاحب غزنوی مقیم تھے اور میاں صاحب سے حدیث پڑھتے تھے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ یہ سب حضرات عصر کی نماز پڑھکر ساتھ ہی نکلے، اور راستے میں اتفاقاً وہ صورت پیش آئی۔ اس عورت کو اٹھ کر لانے میں سب شریک تھے۔ مولوی عبدالقادر صاحب میاں صاحب کے ایک خاص عزیز تھے اس لئے بہت ممکن ہے کہ دونوں صاحبان ایک ہی مکان میں رہتے بھی رہے ہوں، واقعہ ایک ہی ہے کیونکہ اس میم کا جو نام الحیاء بعد المماتہ میں مذکور ہے وہی نام مولانا راشد الخیری نے مولوی عبدالقادر صاحب کے واقعہ میں بھی لکھا ہے۔ اور وہی نام ڈپٹی صاحب کے واقعہ میں بھی بتایا گیا ہے۔

”الحیاء بعد المماتہ“ کے مطالعہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ میم جب تک میاں صاحب کے گھر میں رہی انقلابیوں کو اسکی کچھ بھی خبر نہیں ہوئی لیکن مولانا راشد الخیری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالقادر صاحب جب اس عودت کو لیکر گھر میں آئے تو چند ہی گھنٹوں کے بعد انقلابیوں نے ان کے گھر پر رصاصا بول دیا۔ چنانچہ مصور غم مولانا راشد الخیری لکھتے ہیں:-

”رات کے ابتدائی حصہ میں جب دنیائے اسلام کا سر خدائے عزوجل کے حضور میں جھکا ہوا تھا تو مولوی عبدالقادر صاحب ایک انگریز عودت کو کندھے پر لئے گھر میں داخل ہوئے۔ زخمی خاتون سسک رہی تھی، آنکھیں بند تھیں اور صہم کے کثر

حسٹوں سے خون نکل رہا تھا۔ گھر کی حورتیں اپنے بدنصیب مہمان کی تیمارداری میں مصروف ہو گئیں۔ زخموں کو دھویا، بدن منشا کیا، پانی اور شربت حلق میں ڈپکا رہے تھے۔ دو بچے دروازے پر مودین دین، مکی آوازیں بلند ہوئیں..... غریب عورتوں کی جان نکل گئی۔ بھولے سیلے بچوں کے ہوش جاتے رہے۔ لیکن مولوی صاحب مرحوم نے استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ باغیوں نے دروازے پر آفت چھا دی اور دین دین کے نعروں سے آسمان سر ہر اٹھالیا تھا۔ سوچتے سوچتے مولوی صاحب کی سمجھ میں ایک تدبیر آئی۔ اور وہ یہ کہ مہمان کو اُپلو کی کوٹھری میں لٹا کر اوپر سے اوپلے چن کر دروازہ کھول دیا۔ رات کے تین بج رہے ہیں، اور چودھویں کا چاند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے کہ پندرہ بیس آدمی مولوی صاحب کے گھر کی تلاش لے رہے ہیں، تلواریں اور بلیم حساب خانہ کے سر پر جک رہے ہیں۔ اعدا دشمن عورتوں کے سامنے ناشائستہ الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ مولانا خاموش ہیں۔ عورتیں اللہ اللہ کر رہی ہیں، بچے رو رہے ہیں اور لڑکے حسرت سے باغیوں کا منہ تک رہے ہیں۔ آخر وہ وقت بھی آگیا کہ اُپلو کی کوٹھری کھلی، اور وہ جفا کار اس میں داخل ہوئے۔ آج کے مسلمان اس کو اتفاق محض سے تعبیر کریں

۲۷۸

یاد وقت سے میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ حاکم حقیقی ہنریک
کام میں اپنے بندوں پر رحمت کے پھول برساکر دنیا کو دکھا
دیتا ہے کہ کس طرح اس کا کرم شامل حال ہوتا ہے۔ خدا کا
فضل ایک نہیں پندرہ ہیں آنکھوں پر پہرہ بن کر پڑا اور
چاروں طرف دیکھ بھال کر باغی چنچتے پیٹتے واپس ہوئے۔

روٹی کی آخری بہار ص ۱۷۷ و ۱۷۸

شمس العلماء رڈ پٹی نذیر احمد صاحب کے سوانح نگار
اس میم کا تعارف اسید افتخار علی بلگرامی لکھتے ہیں۔

میم نوجوان کڑی تھی کوئی ۲۰۔ ۲۲ برس کی عمر ہوگی مولانا
نذیر احمد صاحب رڈ پٹی صاحب (یا ان کے ہم سن لڑکوں کو
اس کے پاس جانے کی اجازت نہ تھی صرف رازداری کا حکم
تھا۔ مولوی عبدالقادر صاحب۔ جو حکیم بھی تھے چلکے چلکے اس
کے زخموں کا علاج کرتے رہے۔ بڑا سخت زخم پیٹ کا تھا
نہیں معلوم سنگین گھیڑ دی تھی یا اچھٹی ہوئی گولی لگی تھی
اوپر کی جلد بھٹ گئی تھی فون کی وجہ سے خوب تیسر نہیں ہوئی
تھی۔ یہ عورت مسٹرلی سنس کی بی بی تھی۔ اور وہ پرہیزگار
پٹرول تھے۔ یہ میم اپنے باپ سے ملنے وئی آئی تھی۔ اور
وہ مہتمم خزانہ تھے۔ مسٹرلی سن لاگرے کے قلعے میں تھے اس
کے در بچے بھی باپ کے پاس تھے۔ اگرچہ میم پوری آسائش

سے رہتی تھی بائیں ہمدہ اپنے مستقبل کی طرف سے بہت پریشان رہتی تھی۔ اس نے وہلی کا غدر دیکھا اور اس کو بالکل یقین تھا کہ اس کا شوہر بچوں سمیت آگرے میں ضرور مارا گیا ہوگا۔ اس نے اپنے باپ کو گولی سے ہلاک ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جب وہ اپنی داستان غم و الم بیان کرتی تھی خود روتی تھی اور دوسروں کو رلاتی تھی۔ اس ہنگامے میں باہر سے خبروں کا آنا جانا بالکل بند تھا بالیسی حالت میں اس کو اس کے سوا اور کیا خیال آسکتا تھا کہ مولوی لوگ مانا یا لونڈی بننا کر کہیں گے وہ نہایت مایوسی کی حالت میں تھی..... (حیاتِ نازیں)

ساتھ تین مہینے تک یہ میاں صاحب کے ہاں رہی۔ جب اس کے زخم اچھی طرح بھر گئے اور تندرست ہو گئی تو اس کو انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ مگر یہ کام بھی اپنی جگہ بڑا مشکل اور خطرناک تھا۔ کیونکہ انقلابیوں نے شہر کے دروازوں پر بڑی سختی کر رکھی تھی۔ لوگوں کو بڑی مشکل سے باہر جانے اور اندر آنے دیتے تھے۔ ایک کبھی منگوائی گئی اس میں میاں صاحب کے گھرانے کی چند عورتیں اور کچھ بچے بٹھا دیئے گئے ان سب کے سرچ میں یہ میم وہی جھکی بیٹھ گئی۔ اور دونوں طرف سے پردہ کھینچ دیا گیا۔ لاہوری دروازہ پر پہنچے تو پیرہ والوں نے پردہ اٹھا کر تلاش کی سنی چاہی ایک پشوری طالب علم رشید جو بھی گئی کے ساتھ تھا اس نے کہا میاں

۲۸۰

مولویوں کی ہجو بیٹیاں ہیں تلاشی کیا لیتے ہو۔ منت پوری کرنے جا رہی ہیں ابھی کچھ گھڑی رات کی توپ سے پہلے لوٹ جاتی ہیں۔ مولویوں کا نام سنکر سپرہ والوں نے کاوش نہیں کی اور بجھی کو گذر جانے دیا۔

(حیات النذیر ص ۴۴)

میاں صاحب اور ان کے اعزہ (مولوی عبدالقادر صاحب اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب) ان کے قرآن کی روشنی میں

کے ساتھ جو سلوک اور برتاؤ کیا وہ تو آپ نے ملاحظہ کر لیا۔ اب آئے ذرا اسکی بابت شرعی نقطہ نظر سے بھی غور کریں۔ جنگی احکام کے متعلق قرآن پاک کی سب سے جامع سورہ "سورۃ التوبہ" ہے۔ اس کے پہلے ہی رکوع میں ارشاد ہوا ہے وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَاجِرْهُ حَتَّىٰ يُسَلِّحَ لَهُمُ اللَّهُ طَائِفَةٌ مِّمَّنْهُ لِيُخَالِفَ بِأَنفُسِهِمْ فَوْقَ مَا لَمْ يَعْلَمُوا یعنی اور اگر کوئی مشرک (یا کافر) حالت جنگ میں بھی تم سے امن مانگے تو اس کو پناہ دیا کرو کہ وہ مسلمانوں کے سیل ملاپ سے قرآن سنے پھر جب وہ جانا چاہے تو امن کی جگہ اسکو پہنچا دیا کرو یہ حکم اس لئے ہے کہ وہ لوگ بے علم ہوں (ترجمہ ثنائی) میں یہ نہیں کہتا کہ یہ آیت پوری طرح واقعہ زیر بحث پر منطبق ہے۔ تاہم اتنا تو ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ جنگ کی حالت میں بھی کافر کو پناہ دی جاسکتی ہے اور پناہ دینے کے بعد پناہ یہ حق نہیں ہے کہ ہم اس کو اسلام قبول کرنے

پر مجبور کریں اور اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو ہم اس کو ستائیں۔ اس کے ساتھ سختی کریں۔ نہ مانے تو اپنی پناہ سے نکال کر بے مروتی کے ساتھ گھر سے باہر کر دیں خواہ اس پر کچھ بھی گزرے۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ حکم دیا گیا کہ کسی قسم کی تکلیف دیئے بغیر امن و امان اور حفاظت و عافیت کیساتھ اس کافر کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دو۔ چنانچہ مفسرین نے ثَمَّاءُ بِلِغْهٖ مَّامَنَهُ کے ذیل میں لکھا ہے فیہ دلیل علی انّ المستامن لا یوذی (مدارک ص ۲۸۹) یعنی اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ پناہ لینے والے کافر کو تکلیف نہ دی جائے۔ احکام القرآن للجصاص میں ہے یدل علی ان علی الامام حفظ هذا الحی بنی المستعیر و حیاطتہ و منع الناس من تناوله بشر (ص ۲۳۰) یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمانوں کے امام پر واجب ہے کہ پناہ لینے والے کافر کی حفاظت کرے۔ اور ہر طرح اسکی رکھوالی کرے اور لوگوں کو اس کے ساتھ کسی قسم کا بُرا برتاؤ کرنے سے روکے۔

الحاصل اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی دہشت زدہ کافر کسی مسلمان سے امن و پناہ کا طالب ہو تو دینی سہلح کے پیش نظر اس کو پناہ دینی چاہیے۔ اس کے بعد جب تک وہ پناہ میں رہے اس کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے۔ جب وہ واپس جانا چاہے تو اپنی ذمہ داری میں حفاظت کیساتھ اس کے ٹھکانے پر اس کو پہنچا دے۔

بتائیے میاں صاحب اور ان کے اقربا نے سنزلی سن کے ساتھ اس

کے سوا اور کیا کیا؟ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآنی تعلیم کے اس عملی نمونے کو خواہ مخواہ انگریز کی خوشامد پر محمول کرنے کی کیوں کوشش کی جا رہی ہے؟

اب واقعے کے اس رخ کو بھی ذرا سمجھو

انسانی فطرت اور شرافت کا تقاضا

کہ ایک عورت جو اپنے باپ اور اپنی قوم کے دوسرے بہت سے افراد کا خستہ

حشر دیکھ کر انتہائی خوف و ہراس میں مبتلا ہو۔ اور بالآخر یہ نوبت آگئی ہو کہ وہ خود بھی خوں آلود زخموں کے ساتھ نیم جان حالت میں پڑی ہوئی اپنی موت کا انتظار کر رہی ہو۔ نظریہ ظاہر حالات اس کو اپنی زندگی کے متعلق کوئی اس بات پر نہ رہ گئی ہو۔

”کہ یکا یک کچھ اللہ کے ایسے بندے اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں جو اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس کی جان بچانے کی فکر کرتے ہیں۔ اس کو اپنے گھر لا کر اس کی جان اور عزت ابرو کی ہر طرح حفاظت کرتے ہیں۔ ساڑھے تین مہینے تک اس کے کھانے پینے، پہننے اور ڈھنسنے، دوا و علاج کی پوری کفالت کرتے ہیں۔ اس کی دل جوئی کا اس درجہ خیال رکھتے ہیں کہ اس کو یہ بھی نہیں بتاتے کہ تم جس مکان میں ٹھہری ہو اس کی دیوار کے پیچھے ہی انقلابیوں کا پڑاؤ ہے۔ یا دوسری روایت کے مطابق اس کی آنکھوں نے یہ منظر دیکھا کہ انقلابیوں کو کسی طرح اس کی بھنک مل گئی کہ اس مکان میں انگریز عورت کو چھپایا گیا ہے تو وہ مات کو دو بجے ہلکے بول کر چڑھ آئے۔ یہ ایک ایسی آفت تھی جس سے سارا کنبہ کانپ اٹھا تھا۔ مگر اللہ کا فضل ہوا، اور وقت بہتر

ایک ایسی تدبیر سوچ گئی جس سے یہ خوفناک بلا ٹل گئی۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد آخر میں اُس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کی جان بچانے کے لئے اپنی ستورات اور بچوں تک کو خطرے میں ڈال دیا گیا۔ ان سب کے گھر میں اس کو بٹھا کر اس مقام تک پہنچا دیا گیا جو اس کے لئے امن و امان کا ٹھکانا ہو سکتا تھا۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ جوان تھی، خوبصورت تھی، اور بڑی حد تک مجبور تھی، مگر اس کی عصمت کے تحفظ کا اس حد تک اہتمام کیا گیا تھا کہ گھر کے نوجوان لڑکوں کو اس کے قریب بھی جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف ہمیں تاریخ میں بعض ایسے واقعات ملتے ہیں کہ اس ہنگامے میں بعض میموں کو پناہ تو دی گئی لیکن ساتھ ہی اسکی عصمت بھی لوٹ لی گئی۔ مہر صاحب لکھتے ہیں:

مولو اب محمد حسن خاں نے ایک میم کی جان بچائی تھی لیکن اس سے تعلق بھی پیدا کر لیا اور وہ حاملہ ہو گئی۔ فتح پور کے بعد میم نے نواب کو پھانسی دلوادی (۱۸۵۷ء ص ۱۸۷)

انصاف سے بتائیے، کیا انسانی فطرت اور شرافت کا تقاضا یہی تھا کہ سفری کن کے دل پر ان واقعات کا کوئی نقش قائم نہ ہوتا؟ اور وہ اس ساری ”آپ بیتی“ کو کیسے فراموش کر دیتی؟ اگر نہیں، اور یقیناً نہیں، تو پھر کیا تعجب ہے اگر اس کی شرافت نے یہ محسوس کیا ہو کہ اس جن سلوک کا بدلہ اس کو دینا چاہیے۔ اسی طرح کیا بعید ہے، اگر اس کی زبان سے اس کی ”آپ بیتی“، سننے کے بعد اس کے شوہر اور اسکی قوم کے دلوں

میں بھی میاں صاحب اور ان کے اہل بیت اور اقربا کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گئی ہو؟ اور انکا یہ انسانی احساس بیدار ہوا ہو کہ احسان کا بدلہ احسان ہے؟ اگر معاملے کی نوعیت یہی تھی، اور بلاشبہ یہی تھی تو اس صورت میں ”وفاداری“ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد تو انعامات اور انگریز افسروں کی ان چٹھیوں کی رجن میں میاں صاحب اور ان کے گھر والوں کے حسن سلوک کو

انعامات اور چٹھیوں کی حیثیت

”وفاداری“ سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے زیادہ کچھ حیثیت باقی نہیں رہ جاتی کہ انسانی سلوک کا جواب انسانی سلوک سے دیا گیا ہے۔ مگر بد قسمتی سے مسز لی سن انگریز تھی، اور انگریز اس وقت اپنے کو فاتح اور حاکم سمجھ رہے تھے اس لئے اپنی برتری اور شان حاکمیت کا مظاہرہ کرنے کے لئے انھوں نے اپنی چٹھیوں میں اس حسن سلوک کو ”وفاداری“ سے تعبیر کیا۔ اور جو رقم دی اس کا نام ”انعام“ رکھ دیا۔ اگر یہاں حاکمیت اور محکومیت کی نسبت نہ ہوتی تو یقیناً اس حسن سلوک کو ”احسان“ کہا جاتا۔ اور معلومضے کی رقم کو ”حقیر خدمت“ کہہ کر پیش کیا جاتا، اس کے بعد احسانمندانہ اور نیازمندانہ جذبات کے ساتھ ”شکریہ“ ادا کیا جاتا چنانچہ مسز لی سن نے اس کو ”احسانات“ ہی کہا تھا۔ وفاداری کا لفظ تو انگریز افسروں نے استعمال کیا ہے۔ مولانا راشد الحجری دہلوی کا بیان ہے کہ جدلی کے وقت میم نے اپنے میزبان سے یہ الفاظ کہے۔

..... "و میں آپ کے احسانات اور آپ کی معزز مستورتا کا شکر یہ الفاظ میں ادا نہیں کر سکتی۔ مجھ کو ہمیشہ یاد رکھئے گا۔ میں اطمینان ہوتے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گی
(دلی کی آخری بہار ص ۴۸)

بہر حال تعبیرات سے حقیقت نہیں بدلا کرتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ بالکل نفسانی معاملہ تھا، اور اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک شریف گھرانے نے ایک مظلوم کی حمایت کی اور مصیبت کے وقت اس کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کیا۔ اس کے جواب میں اس مظلوم نے بھی اپنی شرافت کا ثبوت دیا۔ اور اس کے بھائی بندوں نے بھی اس ہمدردی کی قدر کی، اور اپنی حسب حیثیت اس کا شکر یہ ادا کیا۔

الغامت کی مقدار | کہا گیا ہے کہ "میم کی جان بچانے کے سوا دوسرے میں میاں صاحب کو کئی کئی بار انعام ملا۔

دوسروں، چار سوا، اور سات سو روپے عطیات میں ملے تھے۔ حالانکہ انعامات کی ان رقموں کا ذکر صرف ایک چٹھی میں ہے جو ڈبلو جی وائٹ فیلڈ افی ٹیننگ کمشنر دہلی کی لکھی ہوئی ہے۔ الحیاۃ بعد الماتۃ کے صفحہ ۷۹ پر اصل چٹھی کی نقل (جو انگریزی میں ہے) اور اس کا ترجمہ دونوں موجود ہے۔ اور شاہانہ جلد ۲۹ صفحہ ۲۹ میں صرف ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ ہم یہ ہیں کہ اس پوری چٹھی کو اور اس کا ترجمہ جو الحیاۃ بعد الماتۃ میں ہے یہیں نقل کر دیں

Delhi Dated 27th September 1877.

From W. G. Waterfield, offg. Commissioner.

Moulvi Nazeer Husain and his son Moulvi Sharif Husain were with other members of their family instrumental in saving the life of Mrs. Leasons during the mutiny they tended her when wounded kept her in their house for 3½ months finally sent her in to the British camp at Delhi.

He says that he has lost in a fire which took place in his house in Delhi all his English certificates, I think this is extremely probable, he probably had certificates from General Noville Chamberlain and General Burnard, Colonel Sytter and others.

I remember the fact well and Mrs. Leasons, coming in to camp.

The family received a handsome reward of Rs. 400 Rs. 700 compensation for the demolition of houses bestowed upon them.

The family all deserve consideration, and kindness at our hands.

برجیدہ

دہلی مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۸۷۷ء

از ڈبلو جی واٹر فیلڈ

مولوی نذیر حسین اور ان کے بیٹے مولوی شریف حسین اور ان کے دوسرے گھروالے غدر کے زمانے میں مسز لیسن کی جان بچانے میں ذریعہ ہوئے۔ حالت بھروجی میں انھوں نے انکا علاج کیا ساڑھے تین مہینے اپنے گھر میں رکھا اور بالآخر دہلی کے برنس کیمپ میں انکو پہنچا دیا وہ کہتے ہیں کہ ان کی انگریزی سرٹیفکیٹس ایک آتش زدگی میں جو ان کے مکان واقع دہلی میں ہوئی تھی جل گئیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ ان کا کہنا بہت ہی قریب امرکان ہے غالباً ان کو جنرل نیواکس جیمز لین، جنرل برنارڈ اور کرنل سائمر وغیرہم سے سرٹیفکیٹس ملی تھیں۔ انھوں نے واقعات اور مسز لیسن کا کیمپ میں آنا اچھی طرح یاد ہے۔ ان لوگوں کو اس خدمت کے صلہ میں مبلغ دو سو اور چار سو روپیہ ملے تھے۔ مبلغ سات سو روپیہ بابت ٹاؤن سنہرم کئے جانے مکانات کے ان لوگوں کو عطا کئے گئے تھے۔ یہ لوگ ہمارے قوم سے حسن سلوک اور الطاف کے مستحق ہیں۔

غور کیجئے، اس چٹھی سے مندرجہ ذیل تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔
ایک یہ کہ اصل سٹیفٹیں جو میاں صاحب کو ملی تھیں وہ آتش زدگی
کے کسی حادثے میں جل گئیں۔ اور ڈیلو وائٹ فیلڈ کی یہ چٹھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ
کے ہیں برس کے بعد (۱۸۷۷ء) کی لکھی ہوئی ہے۔

دوسری یہ کہ اصل چٹھی جو انگریزی میں ہے اس میں صرف دو رقموں
کا ذکر ہے۔ چار سو روپے اور سات سو روپے۔ دو سو روپے بالی رقم
کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ معلوم نہیں ترجمے میں دو سو روپے کا ذکر
کیسے آگیا ہے۔ یہی غلطی اشاعت السنہ کے محولہ بالا ترجمے میں بھی ہے۔

تیسری یہ کہ مسز لی سنس کی خدمت کے معاوضہ میں براہ راست
جو رقم ملی ہے وہ بار بار نہیں، بلکہ صرف ایک مرتبہ چار سو روپے ملے
ہیں۔ سات سو روپے کی بابت تو وضاحت کر دی ہے کہ یہ مکانات
منہدم کئے جانے کا تاوان تھا، یہ الگ بات ہے کہ اس تاوان دینے
کا محرک وہی نفسیاتی تاثر اور انسانی جذبہ رہا ہو جو مسز لی سنس کے
ساتھ احسان کرنے کی وجہ سے انگریز افسروں کے دلوں میں پیدا ہو گیا
تھا۔ مگر اس کو براہ راست اس خدمت کا صلہ کہنا صحیح نہیں ہے۔
یہ مکانات انگریزوں نے منہدم کرائے تھے۔ حضرت میاں صاحب

اس وقت ”پنجابی کٹرہ“ میں آباد تھے۔ جب ہنگامہ فرو ہوا اور دہلی
پر انگریزوں کا پوری طرح قبضہ ہو گیا تو انھوں نے انتقامی جذبے سے
مشغول ہو کر دہلی والوں پر قیامت برپا کر دی تھی۔ بہت سی عمارتیں منہدم

لئے دیکھو کتابت نذیریہ ص ۱۸۱

کرا دیں۔ محلے کے محلے ویران کر دیئے۔ کئی مسجدوں کا نام و نشان مٹا دیا۔ مگر بظاہر اس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ (۱) قلعے کے سامنے میدان نکالنا ضروری تھا۔ (۲) جامع مسجد کے ارد گرد پچیس پچیس فٹ میدان نکالنا منظور تھا (۳) ریلوے اسٹیشن اور ریلوے لائن کیلئے جگہ نکالنا تھا۔ ان مقاصد کے لئے جو عمارتیں ڈھائی گئیں ان کی سرسری کیفیت تہر صاحب نے لکھی ہے اسی سلسلے میں لکھتے ہیں:-

کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک سب محلے صاف ہو گئے مثلاً پنجابی کٹر، دھوبی کٹر، رام گج سعادت خاں کا کٹر، جرنیل کی بیوی کی حویلی، راجی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ اور حویلی ۱۸۵۷ء (۱۹ ص ۱۶)۔ پنجابی کٹرہ میں ”اورنگ آبادی مسجد“ کے نام سے ایک شاندار مسجد تھی جو شاہ اورنگ زیب کی بیگم اورنگ آبادی نے بنوائی تھی، سرسید خاں مرحوم نے اس مسجد کا ذکر ایک خاص انداز میں کیا ہے لکھتے ہیں:-

”پنجابی کٹرہ ایک مکان تھا مسکن سودا گروں کا، اس میں اکثر پنجابی سودا گرا ترا کرتے تھے اس سبب سے پنجابی کٹرہ مشہور ہو گیا ہے۔ اس کٹرہ میں یہ مسجد ہے مصفا اور دل ربازی سنگ سرخ کی کہ اس کی خوبی اور خوش نمائی بیان سے باہر ہے، اور ایسی نیک نیت بیگم نے بنائی ہے کہ اب تک آباد ہے۔ مولوی

عبدالخالق صاحب اور مولوی محمد نذیر حسین صاحب اسی مسجد میں درس و تدریس فرماتے ہیں اور دن رات قال التورہ قال الرسول کا ذکر رہتا ہے۔

(آثار الصنادید)

لیکن اسٹیشن بنوانے اور ریلوے لائن نکالنے کے لئے یہ مسجد بھی ڈھا دی گئی چنانچہ مہر صاحب لکھتے ہیں۔

”یہ مسجد پنجابی کٹرے میں تھی جو اسٹیشن اور ریلوے لائن میں آگیا مسجد اس جگہ تھی جہاں آجکل بڑا اسٹیشن ہے۔ پوری عمارت سنگ مرخ کی نہایت خوش وضع اور خوبصورت تھی، اس میں مولوی عبدالخالق امام تھے جو مس العلام مولانا نذیر احمد کے خسر تھے۔ شیخ الکل میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی نے ابتدا میں یہیں درس شروع کیا تھا، پھر یہ مسجد انگریزوں نے منہدم کرادی تو وہ پچانگ حبش خاں میں چلے گئے۔“ (۱۸۵۷ء ص ۱۹۲)

مہر صاحب کی کتاب سے جو دو اقتباس ہم نے ابھی نقل کئے ہیں ان سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ پنجابی کٹرے کی تمام عمارتیں منہدم کی گئیں۔ اور اس محلے کو صاف کر کے اسٹیشن اور ریلوے لائن میں لے لیا گیا تو اب ظاہر ہے کہ جب میاں صاحب بھی اس وقت تک اسی محلے میں تھا تو جتنے تو ان کا مکان بھی اس انہدام کی زد میں آیا۔ البتہ آپ کے ساتھ

یہ رعایت کی گئی کہ آپ کو اس کا تاوان دیا گیا۔

اس تحقیق سے اُس روایت کا غلط ہونا بھی
ایک غلط روایت ثابت ہو جاتا ہے جس میں میاں صاحب

کے متعلق انگریزوں کی اس مراعات کا ذکر ہے کہ ”انگریزوں کے تسلط کے بعد جب سارا شہر غارت کیا جانے لگا تو آپ کا محلہ (یعنی میاں صاحب کا محلہ) صرف آپ کی بدولت محفوظ رہا، (الحیاء بعد المآء ص ۱۵۸ و ۱۵۹) سمجھ میں نہیں آتا کہ اس روایت کو کسی تنقید کے بغیر مصنف نے اپنی کتاب میں کس طرح نقل کر دیا جبکہ وہ خود ہی اس سے پہلے یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ ”مسجد اورنگ آبادی ریلوے اسٹیشن کے احاطہ میں آ جانے کے سبب سے مسمار کر دی گئی“، ص ۱۳۲ اگر میاں صاحب کی بدولت سارا محلہ محفوظ رہ گیا تھا تو پھر یہ مسجد کیسے مسمار کر دی گئی؟ اور جب اسٹیشن کے احاطہ میں آ جانے کے سبب سے مسجد مسمار کر دی گئی تو میاں صاحب کا مکان کیسے محفوظ رہ سکتا تھا اس لئے کہ وہ تو اسی مسجد سے ملا ہوا تھا اور کچھو الحیاء بعد المآء ص ۱۵۸

رہا یہ شبہ کہ سسرلی سگ اگر مصیبت زدہ اور مظلومہ تھی تو اس کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرنا کوئی قابلِ ترحم بات نہیں ہے۔ لیکن اس کے صلے میں
میاں صاحب نے یہ قسمیں
اور سٹیفٹیں کیوں قبول
کیں؟

جو قسمیں ملیں ان کو میاں صاحب نے کیوں قبول کیا؟ اور ایسی سٹیفٹیں اپنے حق میں کیوں منظور کیں جن میں ان کی اس خدمت کو انگریزی

حکومت کی وفاداری سے تعبیر کیا گیا تھا؟ اگر درحقیقت ان کے دل میں وفاداری کے جذبات نہ ہوتے تو وہ اس قسم کی ہر پیش کش کو واپس کر دیتے۔ اور صاف صاف فرما دیتے کہ میں نے اپنے مذہب کی تعلیم پر عمل کیا ہے، تمہاری وفاداری مقصود نہ تھی۔ اس لئے اس کے صلے میں نہ کوئی انعام قبول کرونگا اور نہ کوئی سرٹیفکیٹ لوں گا تو گزارش یہ ہے کہ۔

اولاً۔ تو معاملہ کی جو نوعیت ہم نے پچھلے صفحات میں بتائی ہے اسی کے لحاظ سے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جب یہ معاملہ محض اخلاقی نوعیت کا تھا، اور انسانی فطرت اور انسانی شرافت کے تقاضے کی رو سے ان رقموں اور چٹھیوں کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ "احسان کا بدلہ احسان ہے"، تو پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ میاں صاحب ان رقموں اور چٹھیوں کو قبول نہ کرتے۔ اور اس قسم کی ہر پیش کش کو واپس کر دیتے۔

ثانیاً۔ اس معاملہ کو آج کے حالات پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ آج سو برس کی مسلسل ذہنی تربیت کے بعد ہمارے فکر و نظر کی پرواز بہت بلند ہو گئی ہے۔ اس بلندی سے اس واقعہ پر اگر ہم نظر ڈالیں تو یہ ہماری بنیادی غلطی ہے۔ اس کے لئے تو ہمیں اسی زمانے کی تاریخ پڑھنی چاہیے اور اسی کی روشنی میں ان حالات اور واقعات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ جن سے میاں صاحب اور ان کے متعلقین و اعزہ واقربا کو نمٹنا پڑا تھا۔ اگر وہ پس منظر ہمارے سامنے نہیں ہو گا تو ہم کسی صحیح

فیصلے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔

قصہ یہ ہے کہ جب جنگ آزادی کا پانسہ پلٹا، ہندوستان کی شکست کھا گئی اور انگریزوں نے دہلی فتح کر لی تو شہر پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً قیامت گذر گئی۔ تفصیلات میں جانے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ہاں ہمارے موضوع سے جس حصے کا تعلق ہے اس کا کچھ تھوڑا سا حال سناتے ہیں۔ سید افتخار علی بنگلرمی ایک دن کا حال لکھتے ہیں:

”کوئی ڈیڑھ پہر رات گئی ہوگی کہ ایک گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سڑک پر سنائی دی۔ اور ایک سوار کو چلاتے سنا کہ ”مولویوں کا مکان کونسا ہے؟“ مولویوں میں سے کسی نے کواڑ کے پاس جا کر سوار سے پوچھا کہ ”تمہارا کیا مطلب ہے؟“ اس نے کہا کہ ”جنرل صاحب نے حکم دیا ہے کہ مولوی لوگ اپنے بال بچوں کو لیکر کچھ رات رہے گا بلی دروازے کی سڑک سے پرے نکل جائیں، صبح سے پہلے پہلے اس محلے پر دھوا ہوگا“ غرض بڑی .. بدحواسی سے مولوی مع بال بچوں اور عورتوں کے کوٹھوں کو ٹھوں دکن کی طرف بھاگے ان میں ہمارے مولانا دینی ڈپٹی نذیر احمد صاحب (بھی شریک تھے۔ اس وقت کی پریشانی بیان نہیں کی جاسکتی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ بعض

یہ ڈپٹی صاحب میاں صاحب کے سالے مولوی عبدالقادر صاحب کے داماد تھے (رہائی)

کی تو یہ رائے تھی کہ کہیں مست جاؤ یہیں گھروں میں بیٹھے رہو۔
 اور بعض کی یہ صلاح تھی کہ جزیلی حکم آیا ہے تو نکل جانا چاہیے
 غرض یہی رائے غالب رہی اور عورتوں نے اپنا زیور اپنے
 ہاتھوں سے نکال نکال کر صحن میں پھینک دیا اور ململ تن سب
 کے دوپٹوں کی جگہ فرش کی چاندنیاں پھاڑ پھاڑ کر اوڑھیں
 صبح ہوتے ہوتے مولوی لوگ باغ میں پہنچے اب انگریزی
 زد میں اور ان لوگوں میں صرف ایک سڑک حائل تھی چاہتے
 تو باغ میں ٹھہرتے مگر ڈر کے مارے سوئی والوں کے محلے
 میں پہنچے عورتیں ساتھ تھیں پردے اور
 سواری کا کچھ انتظام نہیں۔ عورتوں بیچاریوں کو پیدل چلنے
 کی عادت نہیں۔ ایک ایک پاؤں چھلنی ہو گیا
 بہر کیف یہ لوگ عرب سرائے پہنچے۔ وہاں بادشاہ بھی ٹھہرے
 ہوئے تھے۔ ایک دو دن تو اسن سے گزرے پھر سنا کہ بادشاہ
 اور ان کے ملازموں کی دارگیر شروع ہے تو یہ مولویوں کا خاندان
 سلطان نظام الدین بھاگ گیا۔
 شہر کی خلقت وہاں بھی بھری پڑی تھی۔ وہاں سے پاؤں

۱۔ عرب سرائے بیرون دہلی ہمایوں کے مقبرہ کے متصل واقع ہے ۱۲ منہ

۲۔ دہلی سے پانچ میل ہے ۱۲ منہ

۲۹۴

اکھڑے تو مولویوں نے وزیر آباد کا ارادہ کیا۔ رستے میں گروں کا ایک گارڈ آتے ہوئے ملا، اس نے مولویوں کے گروہ میں سے مردوں کو گرفتار کر لیا اور عورتوں کو چھوڑ دیا۔ اس وقت کی پریشانی اور وادیل کا کیا پوچھنا ہے۔ صرف ایک کسٹن لٹکا کر عبد الواحد جو مولوی عبدالقادر صاحب کے بڑے صاحبزادے تھے عورتوں کے ساتھ تھے۔ باقی کل مرد مونہ دیکھتے دیکھتے رہ گئے۔ اس گرفتاری میں مولوی نذیر حسین صاحب مولوی عبدالقادر صاحب اور ہمارے مولانا، اور دو ایک اور آدمی تھے، گوروں نے ان لوگوں کو شہر کی کوتوالی میں لا کر حوالات کر دیا۔ اس طرح بہت سے لوگ پکڑے ہوئے تھے اور سب قطار در قطار بٹھائے گئے تھے۔ اور سب کو سلسلہ وار پھانسی دی جاتی تھی۔ وہاں ایک بخشی صاحب ساتھ تھے وہ نشان دہی کرتے جاتے تھے کہ یہ فلاں ہیں یہ فلاں ہیں۔ جب ان مولویوں کی باری آئی، انہیں معلوم اس کے دل میں کیا رحم آیا اس نے کہا کہ یہ بے چارے بساطی لوگ ہیں اگر کہیں اس کے مونہ سے نکل جاتا کہ مولوی ہیں تو پھر یہ سب پھانسی پاتے۔ لیکن زندگی باقی تھی پنج گئے یو۔۔۔۔۔

(حیات النذیر ص ۷۵)

۱۷ وزیر آباد دہلی سے چھ سات میل پر واقع ہے ۱۷ منہ

مولانا راشد الخیری لکھتے ہیں۔

”باغیوں کا قلع قمع ہو چکا تو درمحلے پر انگریزی جھنڈا لہا رہا ہے۔ روزانہ آٹھ بجے کے قریب کنارِ حن پر کوٹوالی اور دہلی دروازے کے باہر پھانسیاں ہوتی ہیں۔ اور ٹکاف صاحب کے ایک اشارے پر بیسیوں بندگانِ خدا دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ خجروں کا راج اور پھانسیوں کا بازار گرم تھا۔ ہر وقت سدا ہی ست پر جان تھی کہ نہ معلوم کب گرفتار ہوں اور پھانسی لگ جائے۔ پھانسی کے پھندے ٹکاف صاحب کی جیب میں رہتے تھے اور وہ اپنے سامنے درخت میں بندھوا دیتے تھے۔ دو دو مجرم ایک ایک درخت کے نیچے پشت کی طرف مشکیں باندھ کر بٹھا دیئے جاتے تھے اور صاحب کے حکم سے پھانسی ہو جاتی تھی“

(رہائی کی آخری بہار ۱۹۴۷ء)

میاں صاحب کے خاص عزیز مولوی عبدالقادر صاحب دہلوی کے خلاف بھی جھوٹی تجزی کی گئی۔ اور یہ تجزی کرنے والے ان کے ہم زلف ہی تھے مولانا راشد الخیری لکھتے ہیں:

”مولانا عبدالقادر صاحب کے حقیقی ہم زلف سٹکان صاحب کی ناک کے بال، اور مخبروں کے سرداریں۔ ان کی اطلاع پر مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم گرفتار کئے گئے، اور چار آدمیوں کی زبانی شہادت پر پچھانسی کا حکم ہو گیا۔۔۔۔۔ (آخری بہاوش) مصنف ”حیات النذیر“ اس واقعہ کی نسبت لکھتے ہیں:

مخبر نے جھٹ جڑ دیا کہ مولوی عبدالقادر نے فلاں انگریز کو مار ڈالا ہے، مولوی صاحب فوراً گرفتار ہو گئے۔ حوالات میں بند ہے۔ سنتے ہیں کہ چونسٹھ گواہ چشم دید واقعہ قتل کے پیش ہوئے حتیٰ کہ دو میمیں آئیں ان سے بھی کہلوادیا کہ ہمارے خاوند کا قاتل یہی مولوی ہے۔ اب کیا باقی تھا۔ مولوی صاحب کی طرف سے یاس ہو گئی۔ اس کی خبر لیسن کی میم نے اپنے شوہر کو دی وہ بے چارہ کہیں باہر تھا دوڑا ہوا آیا۔ اور اس نے کہا یہ کیا غضب ہے۔ ان ہی مولوی نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری میم کی جان بچائی یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ انگریز کے قاتل ہوں۔۔۔۔۔ (سٹکان نوٹ میں)

مولوی عبدالقادر صاحب موصوف کے پوتے راشد الخیری صاحب کا بیان

یہ ہے کہ :-

”آج مولوی عبدالقادر کی پھانسی کا دن ہے۔ صبح کے آٹھ بج چکے ہیں۔ گوارہ فوج کا معمولی دستہ مسلح کھڑا ہے۔ مدرسہ اور مسجد کے متعلقین خاموش بیٹھے ہیں کہ وہ آدمی گھوڑوں پر سوار دلتے دروازے کی طرف سے نکلے، اب یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تقدیر تھی یا اتفاق کہ دونوں جمع دیکھ کر ادھر چلے آئے۔ ان میں ایک میم تھی اور ایک انگریز یعنی مسٹر لیسن اور مسٹر لیسن پھر مسٹر لیسن گھوڑا بڑھا کر قریب آئی تو مولوی عبدالقادر کو مشکیں بندھے ہوئے دیکھا، جیب سے پنسل نکال کر اپنی ٹوپی پر لکھا ”انتظار کرو“، ٹوپی درخت پر لٹکادی پہرہ دار کو حکم دیا صاحب کو دیکھا دینا اور گھوڑے پر روانہ ہو گئی....

..... مشکاف صاحب آگئے کئی آدمیوں کی پھانسی ہوئی مولوی صاحب کے درخت پر ٹوپی دیکھ کر مشکاف صاحب ادھر ادھر ٹھہرنے لگے۔ ایک رتھ اور اس کے ساتھ گھوڑے پر میم صاحب آتی ہوئی دیکھائی دیں رتھ میں میری دادی جنتا یعنی مولوی صاحب کی بیوی تشریف رکھتی تھیں، ان کیساتھ ان کی لڑکیاں اور بچے بھی تھے جنہوں نے صبح سے رو رو کر خون کر رکھا تھا۔ مشکاف صاحب نے میم صاحب کی ہوتیا دیکھ کر ٹوپی اتار دی ہاتھ ملایا۔ اور پوری داستان سننے کے

۲۹۸

بعد اپنے ہاتھ سے مولوی صاحب کی مشکیں کھول کر حکم دیا
 قاری! مخبر کو حاضر کرو۔ تعمیل میں
 کیا دیر تھی، قاری صاحب حاضر ہوئے صاحب نے اپنے
 ہاتھ سے مشکیں باندھ کر حکم دیا اس کو فوراً لٹکا دو، جب قاری
 صاحب پچھانی پر چڑھنے لگے تو مولوی صاحب کی خواہش
 پر سیم صاحب نے سفارش کی اور قاری صاحب اس شرط
 پر چھوڑے گئے کہ دو سال کے واسطے شہر سے باہر چلے جائیں
 (آخری بہار ۱۳۴۵ء)

ان اقتباسات کو سامنے رکھ کر ذرا سوچئے کہ جس زمانے کا یہ حال ہو کہ
 لوگ بیسوں کی لالچ میں یا کسی عداوت کی وجہ سے انگریز افسروں کے
 پاس جھوٹی جھوٹی خبریں پہنچا کر پچھانیاں دلو رہے ہوں۔ حد یہ ہے کہ
 اپنے ہم زلف اور قرابت دار تک اس گندگی میں ملوث ہوں۔ خود
 میاں صاحب کو بھی لا کر اس قطار میں بٹھا دیا گیا ہو جس میں سے پکڑ
 پکڑ کر سلسلہ وار لوگوں کو پچھانیاں دی جا رہی تھیں۔ میاں صاحب
 کے ایک خاص اور بہت ہی قریبی عزیز بزرگی مشکیں کس دی گئی ہوں۔ اور
 حکم ہو چکا ہو کہ ان کو پچھانی دیدی جائے۔ مخبری ایسی پُر فریب اور
 سازش اتنی گہری ہوتی ہو کہ قتل کا الزام ثابت کرنے کے لئے بھی بہت
 سے جھوٹے ”چشم دید گواہ“ آسانی سے مہیا ہو جاتے ہوں۔ انتہا یہ
 کہ میوں تک کو دھوکا دیکر یہ کہلا دیا جاتا ہو کہ ہمارے شہنشاہ کے

قاتل یہی ہیں۔ الغرض بقول مولانا راشد الخیری جب مخبروں کا راج ہو، اور پچاسیوں کا بازار گرم ہو۔ ہر وقت سست ہی سست پر جان ہو کہ نہ معلوم کب گرفتاری ہو اور پچاسی لگ جائے۔ ایسے حالات میں اگر میاں صاحب ان رقموں اور سٹیفکٹوں کو رجسٹر محض اخلاقاً اور انسانی شرافت کے تقاضے کی بنا پر سہمہ ردانہ طور پر دی گئی تھیں، منظور نہ کرتے اور لینے سے انکار کر دیتے تو یقیناً جھوٹے مخبر اس بات کو بتنگڑا، اور اس رانی کو پرست بنا کر پیش کرتے۔ اور ایسی رنگ آمیزی کرتے کہ انگریز افسران کی باتوں سے متاثر ہو کر میاں صاحب سے بدگمان ہو جاتے اور خیال کرتے کہ واقعی یہ مولوی در پردہ ہمارے مخالف ہیں۔ بغاوت میں انھوں نے بھی ضرور حصہ لیا ہے۔ اس کے بعد میاں صاحب، ان کے برادر عزیز مولوی عبدالقادر صاحب، اور ان کے گھرانے کے دوسرے افراد ایک ایک کر کے پچاسیوں پر لٹکا دیئے جاتے۔ یعنی وہی پچاسیاں جن کے قریب تک یہ حضرات پہنچ کر واپس آئے تھے پھر ان کے گلوں کی زینت بن جاتیں۔ اور عرب و عجم کی سرزمین اس ذات اقدس کے فیوض و برکات سے محروم ہو جاتی جو کم و بیش ساٹھ برس تک کتاب و سنت کے انوار سے دنیا کو جگمگاتی رہی۔

یہ محض ظن و تخمین کی بات نہیں ہے۔ بعد کے واقعات اسکی تصدیق کرتے ہیں۔ چنانچہ کتنے ہی اہل حدیث ہیں جو صرف کسی کے وہابی کہہ دینے پر مواخذہ میں آئے۔ اور طرح طرح سے انگریزی مظالم کا نشانہ بنے

۳۰۰

نواب صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں :-

”جو لوگ فساد می تھے انھوں نے حکام کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ جو لوگ وہابی کہلاتے ہیں وہ سرکار انگریزی کے دشمن ہیں۔ سرکار نے انھیں غریب و بے روزگار قرار دیا کہ مطلق وہابی کے کہنے سے کوئی روادار سن نہیں سمجھا جاتا جب تک کوئی جرم بغاوت اس سے صادر نہ ہو۔ مگر یہ بات مدت دراز کے سرکار نے سمجھی۔ ورنہ ایک زمانے میں صرف کسی کے وہابی کہہ دینے پر مواخذہ ہو جاتا تھا۔“

(ترجمان وہابیہ ص ۶۵)

اور یہ مواخذہ اتنا شدید ہوتا تھا کہ عدالت میں بھی کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ اور نہ کسی حاکم سے وہابی کے حق میں انصاف کی توقع تھی۔ نواب صاحب ہی دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

”کسی وہابی کے لئے عدالتہائے قانونی میں انصاف پانا ناممکن ہے کیونکہ اس ملت وہابی کے معاملہ ہوتے ہی حاکم عدالت اس کے خلاف پر آمادہ ہو جاتا ہے۔“ (ترجمان وہابیہ ص ۶۶)

خلاصہ یہ ہے کہ اُس زمانے کے حالات کا صحیح جائزہ لینے کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ اس وقت کے مصالح کا تقاضا یہی تھا کہ میاں صاحب انگریزوں کی کسی ہمدردانہ اخلاقی پیش کش کو قبول کرنے سے انکار نہ فرماتے۔ اگر انکار کر دیتے تو فائدہ سے کہیں زیادہ نقصان

پہنچنے کا اسکان تھا۔

اگر کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی ہو تو دور
خود اپنے کردار و عمل کو بھی
دیکھئے

لے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمان جن حالات سے گزر رہے
ہیں ان حالات میں اس کے اپنے کردار و عمل کا کیا حال ہے؟ کہاں
تک وہ مسلمانوں کے حقوق شہریت اور ان کی عزت و ناموس ہی نہیں
بلکہ ان کے دین و ایمان کے حفظ و بقا کے لئے اپنی جرات کا ثبوت
دے رہا ہے؟ اور جو لوگ ان حالات کے ذمہ دار ہیں ان سے کہاں
تک اپنی بیزاری اور نفرت کا اظہار کر رہا ہے؟ ہم تو یہ دیکھ رہے
ہیں کہ دو چار مخصوص شخصیتوں کے علاوہ، آج بڑے بڑے کانگریسی
مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ انگریز کے مقابلے میں تو اپنی حریت پسندی
کا خوب راگ الاپتے ہیں۔ لیکن موجودہ مظالم کے خلاف ایک حرف
نشکایت بھی زبان پر لانے کی ان میں ہمت نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں
بلکہ ستم تو یہ ہے کہ اٹنے خوشامد اور مملکت کی باتیں کرتے ہیں۔ حیرت
ہوتی ہے اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ان معزز ممبروں پر جن کی پانچ
سالہ گزاریوں کے خانے میں صفر کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

بتائیے! آج جبکہ مسلسل ذہنی تربیت کے بغیر فکر و نظر کی پرواز بہت بلند ہو چکی
ہے اور آزادی کی بابت تخیلات کی دنیا بہت آگے جا چکی ہے حکومت

۳۰۲

بھی اجنبی نہیں بلکہ اپنی ہے اور جنتا کی نمائندہ ہے، آزادی رکے کا حق تسلیم کرتی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود حالات کے دباؤ کا جب ہم پر اتنا شدید اثر پڑا ہے کہ زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی ہیں۔ تو پھر سو۔ سو سو سال پہلے کے حالات کے ماتحت، اور غیر ملکی پنجہ استبداد کے زیر اثر چند معمولی واقعات پر ہم کو تعجب کیوں ہے؟ اور کیا حق ہے کہ اس بہانے سے ہم ہزرگوں کو مطعون کریں۔ اور ان پر آوازے کیس؟

ایک معزز غیر مسلم کی شہادت اور ہماری لئے تازیانہ غیرت

ہم اپنی تائید اور تصدیق کے لئے ملک کے نامور قانون دان اور مشہور سیاسی مبصر شیو پرشاد سنہاسنی ریڈ و کیٹ سپریم کورٹ کے ایک مضمون کا (جو سیاست کانپور میں شائع ہوا ہے) تھوڑا سا حصہ یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ حصہ ہم نے "صدق جدید"، لکھنؤ بابتہ، جون ۱۹۷۲ء سے لیا ہے۔ سنہا صاحب لکھتے ہیں:-

اس ملک کے مسلمان لیڈروں میں نہ احساس ہے نہ جذبہ نہ ہمت، انہوں نے اپنی گرد ایک حصار کھینچ لیا ہے۔۔۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اس حصار کے خط کو کانگریس نے نہیں کھینچا ہے بلکہ خود ان کی احساس کمتری و خوشامسرد، کانگریس کی خوشنودی کے جذبے نے کھینچا ہے۔ یہ بات خلہ کر

۳۰۳

بھوپال، جبل پور، ساگر وغیرہ کے واقعات کے بعد ظاہر ہوئی۔ ہندوستانی سفارت خانے کے سامنے پاکستان کے طلبہ نے احتجاج کیا۔ مظاہرہ کے وقت جادہ اعتدال سے قدم آگے بڑھا دیا۔ غلط کیا۔ بہت برا کیا۔ ان بزرگان دین و قوم نے اس مظاہرہ کے خلاف تو نعرہ احتجاج ضرور بلند کیا، لیکن پارلیمنٹ میں کسی نے بھی جبل پور وغیرہ کے واقعات کی مذمت نہیں کی جس کی وجہ سے مظاہرہ ہوا۔ یہ شرف صرف جواہر لال نہرو اور کیونسٹ لیڈروں کو حاصل رہا کہ انھوں نے ان جگہوں کے لرزہ خیز اور محشر انگیز واقعات کی پوری پوری مذمت کی، ان لیڈروں سے کیا امید ہے۔ اگر کچھ امید ہے تو جنوبی ہند کے مسلم لیڈروں سے ہے۔

اس عبارت کے قابل توجہ فقرہوں پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے۔

حالات کے دباؤ سے تاثر کی مثال میں وہ
ایک تازہ انکشاف | تازہ انکشاف بھی اس موقع پر قابل ذکر

ہے جس کا چرچا مئی اور جون کے اخبارات میں رہا ہے۔ رسالہ برہان دہلی یا بت اپریل ۱۹۴۷ء میں جناب وحید احمد مسعود صاحب بدایونی سابق پارلیمنٹری سکریٹری یوپی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ آزادی کے بعد یاران وطن کی بے مہری سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید سلیمان ندوی جیسے حضرات بھی

۳۰۴

دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ مولانا مدنی کے متعلق لکھا ہے کہ :-
 مولانا نے ٹرکی یا شام کو ہجرت کرنے کا ارادہ کر لیا تھا تو ایک
 منسٹر صاحب نے انھیں اُن کی، مسلمانوں کی اور ملک کی
 بہتری کی خاطر اس سے باز رکھا۔ پھر اس کے بعد بجائے
 سیاسی تقریروں کے وہ وعظ و مولود خوانی پر اتر آئے
 تھے ۛ

دیوبند کے ماہنامہ ”تذکرہ“ نے اپنی سٹی کی اشاعت میں وحید احمد
 صاحب کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ یہ ماہنامہ مولانا مدنی کے
 صاحب زادے مولوی اسعد صاحب کی ملکیت اور نگرانی میں شائع
 ہوتا ہے۔ ”تذکرہ“ کے مرتب نے لکھا ہے کہ نہ معلوم وحید صاحب
 نے یہ بات کہاں سے اڑائی ہے کہ ٹرکی یا شام کو ہجرت کا ارادہ کر چکے
 تھے اور وہ بھی حالات سے گھبرا کر..... یہ کہنا (بھی) سراسر غلط
 ہے کہ مولانا مدنی وعظ و مولود خوانی پر اتر آئے تھے.....“

اس کے جواب میں وحید احمد صاحب نے اپنی غلطی کا صریح اس
 حد تک اعتراف کیا ہے کہ میں نے شنیدہ کو دیدہ کی صورت میں پیش کیا
 ہے اس کی معافی چاہتا ہوں۔ بہر حال ہمیں فی الحال اس سے بحث
 نہیں ہے کہ وحید احمد صاحب کا بیان صحیح ہے یا نہیں۔ ہم نے اس
 وقت اس معاملہ کو یہاں جس مقصد سے چھیڑا ہے وہ یہ ہے کہ اس
 بحث کے سلسلے میں ”تذکرہ“ نے ایک دوسری بڑی اہم بات کا

۳۰۵

انکشاف کیلئے جو ہم پر تنقید کرنے والے رشتوں کے لئے قابل غور ہے۔
 مولانا مدنی کی حق گوئی کا ثبوت دیتے ہوئے "تذکرہ" میں لکھا ہے:-
 "حکومت ہند نے جس سال آپ کو "پدم بھوشن" کا خطاب دے
 دینا چاہا تھا آپ نے اس کی واپسی کے جواب میں حکومت کو جو
 خط لکھا تھا اس کا اصرار اس کا اصلی متن کہیں مل جاتا تو آپ اندازہ
 لگاتے کہ حضرت مدنی جی کی حق گوئی آزاد بھارت میں بھی برقرار
 تھی۔ جمعیت کے خدام نے اس خط کو روک لیا اور اس کی جگہ
 دوسری تحریر حضرت مولانا کی طرف سے اشاعت کے لئے
 اخبارات کو دے دی"۔

رندائے ملت لکھنؤ (۱۹۶۲ء)

خطاب کی واپسی کا حال تو ہمیں معلوم ہے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جس
 سال مولانا مدنی نے اپنا خطاب واپس کیا تھا اسی سال بعض دوسرے
 خطاب یافتگان نے بھی اپنے خطابات واپس کئے تھے۔ لیکن یہ راز
 بالکل پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔ اور ماہنامہ "تذکرہ" جیسے معتبر
 ذریعے سے فاش ہوا ہے کہ خطاب کی واپسی کے ساتھ مولانا نے کوئی خط
 بھی حکومت کو لکھا تھا، اس کو جمعیت علماء ہند کے خدام نے روک لیا۔
 اور اس کی جگہ دوسری تحریر مولانا کی طرف سے اخبارات کو اشاعت کے
 لئے دے دی۔ ماہنامہ "تذکرہ" کو اس خبر کی بابت معتبر ذریعہ ہم نے
 اس لئے قرار دیا ہے کہ مولوی اسعد صاحب اس وقت یوپی کی جمعیت

۳۰۶

کے صدر ہیں۔ ان کی ملکیت اور نگرانی میں شائع ہونے والا پرچہ کم از کم جمیعت کے متعلق کوئی غیر تحقیقی بات اور طرح علی الاعلان لکھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مرکزی جمیعت اس معاملہ میں اب تک بالکل خاموش ہے۔

اب ہم اپنے نکتہ چیں دوستوں سے عرض کرتے ہیں کہ وہ اس معاملہ کے ان دو پہلوؤں پر غور کریں۔ ایک یہ کہ مولانا مدنی نے اپنی جرأت حق گوئی کے باوصف جمیعت کے ان خدام کے خلاف عدائے احتجاج کیوں نہیں بلند فرمائی جنہوں نے ان کی تحریر کو روک لیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مزید گستاخی یہ کر ڈالی کہ اس کی جگہ دوسری تحریر کو مولانا کی تحریر قرار دیکر اخبارات میں شائع کرا دیا؟

دوسرا یہ کہ جمیعت کے وہ خدام جو انگریزی حکومت کے مقابلے میں اپنی بے باک حریت پسندی کا بار بار مظاہرہ کر چکے ہیں، انہوں نے موجودہ حکومت کے سامنے کلمہ حق کے اظہار میں ایسی کمزوری کیوں دکھائی؟

جواب میں اس کے سوا اور کیا کہیے گا کہ حالات اور مصالح کا تقاضا یہی تھا۔ تو پھر یہی توجیہ میاں صاحب کے حق میں قابل پذیرائی کیوں نہیں؟ جبکہ حالات کی ناسازگاری میاں صاحب کے زمانے میں آج کے لحاظ سے کہیں زیادہ شدید تھی۔



میاں صاحب کا سفر حج

جب شوال ۱۲۵۸ھ ہجری میں حضرت مولانا
شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی قاری سرہ
نے ہندوستان سے مکہ معظمہ کی طرف
ہجرت فرمائی تو درس حدیث کی بابت حضرت شاہ صاحب کی ہاشمی
کا شرف اللہ تعالیٰ نے ان کے شاگرد رشید جناب میاں صاحب
سید نذیر حسین دہلوی علیہ الرحمۃ کو عطا فرمایا۔ محرم ۱۲۵۹ھ ہجری
(مطابق فروری ۱۸۴۳ء) سے حضرت میاں صاحب نے درس حدیث
کا سلسلہ مستقل طور سے شروع فرمایا اور تقریباً چالیس برس تک
سلسلہ یہ خدمت انجام دینے کے بعد ۱۲۸۳ھ ہجری (مطابق ۱۸۸۳ء)
میں آپ کو زیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل کرنے کا شوق
دامن گیر ہوا۔ اس چالیس سال کی مدت میں آپ کے مسلک کا ملک
میں کافی چرچا ہو چکا تھا۔ کتاب و سنت کے ساتھ براہ راست
تمسک کی دعوت رفتہ رفتہ پھیل رہی تھی۔ تقلیدی جمود کے باندھن
ٹوٹ رہے تھے۔ توحید کی حقیقت نکھر رہی تھی۔ بہت سی مرنہ نشیں

زندہ ہو رہی تھیں۔ بدعات کے چراغ بجھ رہے تھے۔ ان حالات میں جب میاں صاحب کے سفر حج کے عزم و ارادہ کی خبر مشہور ہوئی تو بدعات کی خانقاہوں اور تقلید کے ایوانوں میں ہلچل مچ گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کا بیان ہے۔

”ہندوستان میں چونکہ اُس وقت تقلید و عدم تقلید کا فتنہ زور پر تھا۔ اور مولانا نذیر حسین، غیر مقلدین کے سب سے بڑے شیخ سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے فوراً مکے میں اطلاع دے دی گئی کہ وہاں یہ کاسب سے بڑا سرغنہ آ رہا ہے۔ اگر یہاں کوئی کاروائی نہ کی گئی تو اس بات کو وہابی حجاز میں اپنی فتح سے تعبیر کریں گے اور عوام کو اس سے بہت فتنہ ہو گا.....“ (آزاد کی کہانی ص ۳۱)

اللہ اللہ! تعصب اور تنگ نظری کی حد ہو گئی۔ حجاز پر ضعیف حکومت کے دور اقتدار کا یہ نشہ؟ کہ ایک متبع سنت شیخ کا امن و امان کے ساتھ فریضہ حج ادا کرنا بھی گوارہ نہ ہوا۔ اس کو ”وہابیت کی فتح“ سمجھا گیا۔ اور عوام کے لئے ”فتنہ“ قرار دیا گیا۔ چنانچہ اس اطلاع کے بعد ہندوستان میں بھی اور مکہ معظمہ میں بھی میاں صاحب کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے سازشیں شروع ہو گئیں۔ اور اس سازش میں بریلوی اور دیوبندی دونوں مکتب خیال کے علمائے احناف نے خوب خوب حصہ لیا۔ یہ داستان عبرت خیز بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ اس کی تفصیلات

ہم پیش کریں گے لیکن اس سے پہلے ایک دوسرے واقعے کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جس کی طرف مولانا آزاد مرحوم نے اپنے مندرجہ ذیل بیان میں اشارہ کیا ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں:-

مولانا سید نذیر حسین مرحوم، ہندوستان میں درس حدیث کے آخری مرکز تھے۔ انھوں نے جب سفر حج کا ارادہ کیا تو ان کو خیال پیدا ہوا کہ مخالفین، مکہ میں ایذا رسانی کی کوشش کریں گے۔ اس لئے کہ علمائے دہلیہ کے ساتھ وہاں پہلے جو سلوک ہو چکا تھا اس سے باخبر تھے.....

(آزاد کی کہانی ص ۱۲)

وہ کون سلوک ہے؟ جو کہ معظمہ میں ”علمائے دہلیہ“ کے ساتھ میاں صاحب کے سفر حج سے پہلے ہو چکا تھا اور میاں صاحب اس سے باخبر تھے۔ اسی لئے ان کو اپنے متعلق کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی فکر ہوئی تھی۔ اس کا بھی مفصل تذکرہ مولانا آزاد ہی کی زبانی اس کتاب ”آزاد کی کہانی“ میں موجود ہے۔ یہ پوری تفصیل تو یہاں نقل کرنے کا موقع نہیں ہے۔ ہاں کچھ ضروری حصہ پیش کیا جاتا ہے: ”آزاد کی کہانی“ میں اس واقعے کے بیان کے لئے جو عنوان مقرر کیا گیا ہے وہی ہم بھی اختیار کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے

”مکہ میں علمائے اہل بیت پر قیامت“ | مولانا آزاد کے والد اپنے نانا کیساتھ دہلی سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے

تھے۔ قیام حجاز کے تقریباً دس برس بعد مکہ ہی میں انھوں نے شادی کی اس دوران میں ان کو ممالک اسلامیہ کی سیاحت کا شوق ہوا۔ پہلے قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ اس سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں:-

» سفر قسطنطنیہ سے پہلے مکہ معظمہ میں ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا جسے افسوس ہے، کسی نے قلم بند نہیں کیا ہے۔ حالانکہ وہ نہایت عبرت انگیز اور تاسف نگیں ہے۔۔۔ تفصیل یہ ہے کہ اس زمانے میں وہابیوں کی جانب سے گورنمنٹ ہند نہایت برا فروختہ تھی اور ان کی جماعت کو سخت خطرناک پولیٹیکل جماعت سمجھتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ جماعت مولانا اسماعیل کی جماعت سمجھی جاتی تھی، جنھوں نے اپنی تحریک کی بنیاد مسئلہ جہاد پر رکھی تھی اور سکھوں سے عملاً جہاد کیا تھا۔ مولانا اسماعیل کے بعد سید صاحب کی جو جماعت سرحد پر رہ گئی تھی وہ مولانا صادق پوری کی امارت میں از سر نو قائم ہوئی۔ اور اُس سے اور انگریزوں سے دو تین مرتبہ ٹڈ بھیسڑ ہوئی تھی۔ اور گورنمنٹ کو خیال ہو گیا تھا کہ اب یہ جماعت، انگریزوں سے جنگ کرنا چاہتی ہے اس کے بعد انگریزوں کی طرف سے اس جماعت پر طرح طرح کی جو مہمیتیں اور پریشانیاں نازل

کی گئیں اجمالی طور پر مولانا آزاد نے ان کی نشان دہی کی ہے۔
 اس سے آگے فرمایا ہے م ان اسباب کی وجہ سے اس جماعت
 کے علماء نے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ دیکھا کہ ہجرت کر جائیں
 بہت سے لوگ تو غدر کے موقع ہی پر چلے گئے تھے اور جو
 اس دار و گیر سے کسی طرح بچے انھوں نے بھی حجاز کو دارالامن
 سمجھ کر ہجرت کی۔ چنانچہ غدر کے بعد علماء و ہابیہ کی ایک بڑی
 جماعت مکہ معظمہ میں فراہم ہو گئی تھی۔ لیکن یہاں بھی اُس کے
 برخلاف متعدد اسباب موجود تھے۔ سب سے پہلے یہ کہ محمد
 بن عبدالوہاب نجدی اور ان کی جماعت سے علمائے حجاز و
 عوام کو سخت تعصب و عناد تھا۔ پھر سلطنت عثمانیہ نے پولیٹیکل
 اغراض و مصالح سے وہابیوں کو بہت بار نام کیا تھا اور وہابی
 ہونے کو عملاً ایک بڑا جرم قرار دے رکھا تھا۔ ان اسباب سے
 اَلْبَلَدُ الْاَمِينِ (مکہ) میں بھی وہابیوں کی جماعت کے لئے
 امن نہ تھا۔ اور وہ ایک باغیانہ جماعت سمجھی جاتی تھی۔
 ابتداء میں علمائے حجاز اور گورنمنٹ کو اس تحریک کی خبر نہ تھی
 جو ہندوستان میں شروع ہوئی تھی۔ بلکہ جب مولانا محمد اسماعیل
 نے مولانا سید احمد صاحب کے ساتھ حج کا سفر کیا تو یہ وہاں
 بہت اچھا اثر چھوڑ آئے تھے۔ اس لئے وہابیہ ہند کی جماعت
 سے کسی کو کوئی سو رظن نہ تھا۔ لیکن ہندوستانی علمائے مقیمین

۳۱۲

مکہ نے فتنہ اٹھایا اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں سب سے بڑا حصہ والد مرحوم کا تھا ان کے تعلقات شریف اور قسطنطنیہ دونوں سے گہرے تھے۔ انہی نے علمائے حجاز اور شریف کو مطلع کیا کہ یہ جماعت باعتبار عقائد محمد بن عبد الوہاب کی جماعت ہے اور ہندوستان سے خاص اس لئے آئی ہے کہ یہاں اپنی تحریک پھیلانے۔ ثبوت میں تقویۃ الایمان اور بعض دوسری کتابوں کے حسب حال مطالب، عربی میں ترجمہ کر کے شائع کر دیئے۔۔۔۔۔ والد مرحوم نے شریف کو ان لوگوں کے برخلاف سخت برا نگیختہ کر دیا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ قاضی محمد مراد بنگالی طائف گئے جب واپس آئے تو شیخ عبداللہ مراد، امام حنفی ان سے ملنے گئے اور دستور کے مطابق سلام کے بعد ”زیارت مقبول“ کہا جس سے مراد حضرت ابن عباسؓ کی قبر کی زیارت تھی۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ میں کسی قبر کی زیارت کے لئے نہیں گیا تھا بلکہ محض تفریح کے لئے گیا تھا۔ اس بات کا بہت چرچا ہوا۔ اور شریف تک پہنچائی گئی، اور اس کے معنی یہ بٹھرائے گئے کہ یہ لوگ بھی محمد بن عبد الوہاب کی طرح قبور صالحین کی زیارت کے مخالف ہیں۔

لے یعنی زیارت قبور مبارک ہو ۱۲ منہ

نتیجہ یہ نکلا کہ چند دنوں کے بعد اچانک اس جماعت کے اکتیس آدمی گرفتار کر لئے گئے۔ جن میں مولانا رحمت اللہ صاحب ”اظہار الحق“ بھی تھے، لیکن یہ بعد کو رہا کر دیئے گئے، کیونکہ انہوں نے اپنی حقیقت کے بہت واضح دلائل پیش کر دیئے تھے۔ شریف نے ایک مجلس مقرر کی اور والد مرحوم سے کہا کہ ان لوگوں کے عقائد کی تحقیقات کریں۔

ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ بھی محمد بن عبد الوہاب کے جماعت سے ہیں۔ انہوں نے اس سے انکار کیا اس پر والد مرحوم نے سترہ سوال مرتب کر کے پیش کئے، جن میں وجوب تقلید شخصی، استحباب قیام، زیارت قبور کے لئے سفر، اور استمداد و توسل بالصالحین وغیرہ سوالات تھے۔ انہوں نے اس موقع پر بجز تین شخصوں کے اور سب نے تفتیہ کیا اور کسی نے بھی استقامت نہ دکھائی۔

مولوی محمد انصاری مولوی محمد لطیف اور قاضی محمد مراد نے بڑی ہمت و دلیری کے ساتھ اپنے صحیح عقائد پیش کر دیئے اور کہا، اگر قرآن و سنت پر عمل کرنا اور بدعت سے اجتناب کرنا جرم ہے تو ہم مجرم ہیں اور ہر طرح کی سزا برداشت کرنے کو تیار ہیں۔

پھر ان سے کہا گیا کہ اپنے عقائد سے کٹوڑوں کی سزا کا حکم

توبہ کریں ورنہ سخت تعزیر کی جائے گی۔

۳۱۴

گی، لیکن یہ اس پر رضا مند نہ ہوئے۔ اس پر شریف نے ان تینوں میں سے ہر ایک کو انتالیس انتالیس کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ انتالیس اس لئے کہ خفیہ کے نزدیک حد کی تعداد چالیس کوڑے ہیں، اور تعزیر کو اس تعداد سے کم ہونا چاہیے۔ سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا ہے:۔

”اس موقع پر نہایت عبرت انگیز بات برٹش قونسل کے بیانہ“ یہ ہے کہ جب اسلامی حکومت اور

جواز بیت اللہ میں ایک مسلمان جماعت علماء پر ظلم و ستم ہو رہا تھا، تو اس وقت اگر ان کو کوئی پناہ مل سکی، تو انہی کفار کے دامن میں جن سے بھاگ کر یہ یہاں آئے تھے۔ ان میں سے بعض کے اجاب ان کی گرفتاری کے بعد ہی جدہ آگئے تھے اور برٹش قونسل کو خبر دی تھی کہ برٹش رعایا پر یہ عذاب نازل ہو رہا ہے برٹش قونسل نے اس معاملے کو قابل مداخلت خیال کیا اور گورنر مکہ کو مراسلت بھیجی کہ برٹش رعایا کی گرفتاری بحجز فوجداری جرائم کے اور کسی وجہ سے نہیں ہو سکتی اور اگر انہیں چوبیس گھنٹے کے اندر نہ چھوڑ دیا گیا تو برٹش گورنمنٹ اس معاملے کو باب عالی کے روبرو پیش کرے گی۔“

”تب گورنر نے شریف پر زور ڈالا اور تعزیر کی کاروائی وقوع میں آنے سے پہلے ہی یہ لوگ مجبوراً چھوڑ دیئے گئے، لیکن انہیں یہ سزا دی گئی کہ سب کے سب اکتیس آدمی، خارج البلد کر دیئے۔“

۳۱۵

گئے۔ اور حجاز کی پولیس نے انہیں جدے میں لا کر برٹش قونصل

کے حوالے کر دیا.....“

ان اقتباسات پر غور کرنے سے مندرجہ ذیل چند باتیں واضح طور پر مستنبط ہوتی ہیں۔

(الف) اَلْبَلَدُ اَلدِّمِیُّن (مکہ معظمہ) میں یہ افسوسناک سلوک جن علماء کے ساتھ کیا گیا ان کا اس کے سوا اور کوئی قصور نہ تھا کہ وہ عقیدہ اور مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث تھے یعنی مقلد اور بدعتی نہ تھے۔

(ب) مولوی رحمت اللہ صاحب کیرانوی بھی گرفتار ہو گئے تھے، مگر انہوں نے اپنے حنفی ہونے کا ثبوت دے کر رہائی حاصل کر لی تھی۔

(ج) یہ فتنہ ان ہندوستانی علماء نے اٹھایا تھا جو اس زمانے میں مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ اور اس میں بڑا حصہ مولانا آزاد مرحوم کے والد (مولوی خیر الدین) کا تھا۔

(د) ان علماء اہل حدیث کو کوڑوں کی سزا دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا، لیکن اس کا نفاذ برٹش گورنمنٹ کے قونصل مقیم جدہ کی مداخلت کی وجہ سے نہ ہو سکا۔

(ه) تمسک بالکتاب والسنۃ کی پاداش میں اللہ کے ان نیک بندوں کو جوار بیت اللہ سے نکال کر برٹش قونصل کے حوالے کر دیا گیا۔ یعنی بقول مولانا آزاد مرحوم ”اُس وقت اگر ان کو کوئی پناہ مل سکی تو انہی کفار کے دامن میں جن سے بھاگ کر یہ یہاں آئے تھے“

۳۱۶

یہ ہے وہ واقعہ جو میاں صاحب کے سفر حج سے پہلے مکہ معظمہ میں پیش
 آیا تھا اور جس کی طرف مولانا آزاد نے اپنے بیان میں اشارہ کیا ہے۔ میاں
 صاحب نے السعید من وعظ بغیرہ رواہ مسلم ص ۳۲۲ خوش نصیب
 ہے وہ شخص جو دوسروں کے حالات سے نصیحت حاصل کرے، کے
 مطابق اس واقعہ کو اپنے لئے سبق آموز قرار دیا۔ اور احتیاطی تدابیر کے طور
 پر دلی کے بعض انگریز افسروں کو اپنے اس ارادہ کی اطلاع دیکر برطانوی
 وکیل کی مدد سے نام چھپایا حاصل کیں۔ تاکہ انگریزوں کے ان معاندین
 کی فتنہ انگیزیوں سے محفوظ رہ سکیں جو اس وقت بھی مکہ معظمہ میں موجود تھے
 حالات کی روشنی میں میاں صاحب کا یہ فعل نہ شرعاً قابل اعتراض ہو سکتا ہو
 اور نہ اخلاقاً بلکہ اگر کوئی شخص نکتہ چینی ہی کے لئے بیٹھا ہو تو پھر اس کی نگاہ
 تنقید سے کون بچ سکتا ہے؟ چنانچہ تیسرا طعنہ جو اہل حدیثوں کو دیا گیا ہے
 اس کا تعلق انہی چٹھیوں سے ہے۔

تیسرا طعنہ اور اس کا جواب | ”اور اس صلہ میں یعنی مسزلیسن

کی جان بچانے کے صلے میں) سفر حج کے موقع پر بھی انگریز افسروں
 کی چٹھیاں مولانا کو ملی تھیں کہ اپنے حدود میں سرکاری عملہ ہر جگہ
 مولانا کے ساتھ تعاون کرے۔“

سفر حج کے موقع کی ان چٹھیوں کی نسبت یہ کہنا کہ ”مسزلیسن کی جان بچانے
 کے“ ”صلہ“ میں ملی تھیں؛ یقیناً ایک غلط اور معاندانہ تعبیر ہے۔

اروز زبان کی کسی لغت میں اٹھا کر دیکھئے کہ ”صلہ“ کے کیا معنی ہیں۔ جامع اللغات اردو کی ایک مشہور اور متداول لغت کی کتاب ہے اس میں ”صلہ“ کے معنی لکھے ہیں ”العام بخشش، بدلہ، اجر“

مسز لین کی جان بچانے کا واقعہ ۱۸۵۷ء کا ہے اور حج کے موقع کی چٹھیاں ۱۸۸۳ء کی ہیں۔ یعنی دونوں میں تقریباً چھبیس سال کا فاصلہ ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وفادارانہ کارناموں کے انعامات ربع صدی گزر جانے کے بعد ملتا کرتے ہیں؟ پھر یہ بات بھی نہیں ہے کہ یہ چٹھیاں انگلو براہمنوں کی طرف سے از خود ”ملی تھیں“ جیسا کہ معترض کے بیان سے مترشح ہوتا ہے۔ اور شاید اسی لئے انھوں نے ان چٹھیوں کو ”صلہ“ قرار دیا ہے۔ بلکہ میاں صاحب نے ان چٹھیوں کے حاصل کرنے کے کوشش کی تھی اور یہ کوشش انھوں نے کیوں کی تھی؟ اور اس کوشش میں ان کو آسانی کے ساتھ کامیابی کیوں ہو گئی؟ ان باتوں پر مولانا آزاد کے بیان سے روشنی پڑتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

”مولانا سید نذیر حسین مرحوم ہندوستان میں درس حدیث کے آخری مرکز تھے انھوں نے جب سفر حج کا ارادہ کیا تو ان کو خیال پیدا ہوا کہ مخالفین، مکہ میں ایذا رسانی کی کوشش کریں گے اس لئے کہ علماء وہابیہ کے ساتھ وہاں پہلے جو سلوک ہو چکا تھا اس سے باخبر تھے۔ اور اب حجاز کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ بلا تقیہ کوئی وہابی محفوظ طور پر نہ رہ سکتا تھا۔ شیعہ و خوارج

تو علانیہ جاتے اور حج کرتے کوئی روک نہ پیش آتی، مگر وہابیہ کے لئے یہ موقع نہ تھا۔

مولانا نذیر حسین نے چونکہ غدر میں مسز لیسن کی جان بچائی تھی اس لئے حکام سے ان کے تعلقات اچھے تھے۔ انہوں نے ڈپٹی کمشنر دہلی کے ذریعہ سے فارن آفس میں سلسلہ جنبانی کی اور جتہ میں برٹش قونصل کے نام ایک سفارشی چٹھی بھجوائی، جس میں لکھا تھا کہ ان کی حفاظت کی جائے۔ اور جو ضرورت انہیں پیش آئے حتی الامکان اس میں پوری طرح مدد دی جائے۔ اس طرح یہ حجاز روانہ ہو گئے۔ (آزاد کی کہانی ص ۱۳۱ و ص ۱۳۲)

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں علمائے اہلحدیث کے ساتھ جو ناروا اور ظالمانہ سلوک ہو چکا تھا، میاں صاحب اس سے باخبر تھے اس لئے ان کو اپنے متعلق بھی ایذا رسانی کا خطرہ محسوس ہوا۔ کیونکہ وہ اس وقت ہندوستان میں درس حدیث کا آخری مرکز تھے۔ وہی اہلحدیث کے پیشوا اور سرخیل تھے۔ میاں صاحب کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان علمائے مظلومین کو کوڑوں کی سزا سے برٹش قونصل سقیم جتہ کی مداخلت نے بچایا تھا، اور قونصل ہی نے ان کو پناہ دی تھی۔ اس لئے اسی قونصل کے نام انہوں نے چٹھی لکھوائی۔ اور اس چٹھی کے ملنے میں آسانی اس لئے ہوئی کہ مسز لیسن کے ساتھ میاں صاحب نے جو احسان کیا تھا۔ انگریز افسر اس کو بھول نہیں تھا، جیسا کہ انسانیت اور شرافت کا تقاضا ہے۔

بتائیے! اس میں طعن کی کیادات ہے؟ کیا دشمن کی مضرتوں اور ایذا رسانیوں سے اپنے کو بچانے کی فکر کرنا، اور اس کے لئے مناسب اور مفید تدبیر اختیار کرنا کوئی عیب اور ملامت کی چیز ہے؟

میاں صاحبؒ کو اپنے سفر حج کے موقع پر مغربیہ
میاں ضلکے خلا | کی طرف سے ایذا رسانی کا جو خطرہ محسوس ہوا تھا
بیجان انگیز فضا | یہ کوئی خیالی خطرہ نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد
حقائق پر تھی۔ جھوٹے عقائد اور غلط مسائل اہلحدیث، بالخصوص میاں صاحب
کی طرف منسوب کر کے علمائے احناف کے فتوؤں نے بیجان انگیز فضا پیدا
کر دی تھی۔ جامع الشواہد فی اخراج الوہابین عن المساجد،

اور ”انتظام المساجد باخراج اہل لغت و مفسد“ کے نام سے رسالے
مرتب ہو چکے تھے جن کی خوب اشاعت کی جا رہی تھی۔ اور ان کی بنا پر
اہلحدیثوں کو احناف کی مجددوں میں نماز پڑھنے سے روکا جا رہا تھا طر حرج
سے مطعون اور بدنام کر کے ان کو پریشان کیا جا رہا تھا مان رسالوں کی
فیتہ انگیز یوں کا اندازہ کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ ان کے مندرجات
کے کچھ نمونے ہم آپ کے سامنے پیش کریں۔ پہلے ”جامع الشواہد“ کو لیجئے
اس میں جن عقائد اور مسائل کی جھوٹی نسبت اہلحدیث کی طرف کی گئی
ہے، ان میں سے آخری مسئلے کو یہاں ذکر کرتا ہوں۔ کیونکہ اس کے متعلق
میاں صاحب کو خاص طور سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ مستفتی صاحب لکھتے

ہیں: ”اس
لے رسالہ میں کسی مستفتی کا نام نہیں ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ خود مفتی ہی مستفتی بھی ہیں ۱۶

۲۲۰

ایک مسئلہ ان کا یہ ہے کہ پنیر جو شام میں سُور کے پنیر یا یہ سے بنایا جانا اُس کا مشہور تھا یا اور چیزیں کہ جن میں سور کی چربی پڑنی مشہور تھی جب وہ آنحضرت علیہ السلام کے پاس آئی تھیں آپ بلا دریافت کھاتے تھے؟ (جامع الشواہد ص ۷۷)

اس روایت کو الحمد للہ کا عقیدہ اور مسئلہ بنا کر پیش کیا گیا ہے اور ثبوت یہ دیا ہے کہ:-

”چنانچہ فتویٰ مہری مولوی عطا محمد میں ہے جو رسالہ اظہار الحق مطبوعہ مطبع اہل حق ہند لاہور میں مندرج ہے۔ اور اس رسالہ میں مولوی نذیر حسین صاحب وغیرہ کی بھی مہریں موجود ہیں۔ اور اس رسالہ کے چھپوانے میں مولوی نذیر حسین صاحب نے کوشش تمام فرمائی، چنانچہ مصنف رسالہ مذکور شروع میں اس امر پر تصریح کرتا ہے“ (حوالہ مذکور)

مجھے آپ اس کا مطلب؟ کیا دلیل دی گئی ہے اس غلیظ اور ناپاک الزام کے ثبوت میں کہ میاں صاحب سید نذیر حسین اس بات کے قائل تھے کہ حیاذاً باللہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مذکورہ بالا پنیر استعمال فرمایا کرتے تھے؟ دلیل یہ دی گئی ہے کہ یہ بات اگرچہ مولوی عطا محمد کے فتوے میں ہے رسید مولانا نذیر حسین کے فتوے میں نہیں ہے) مگر مولوی عطا محمد کا یہ فتویٰ جس رسالے میں شائع کیا گیا ہے اس رسالے میں مولوی نذیر حسین صاحب کا بھی دستخط اور مہر ہے۔ بلکہ اس رسالے

کے چھپوانے میں مولوی نذیر حسین صاحب نے بڑی کوشش کی تھی جیسا کہ رسالے کے مصنف نے شروع میں اسکی تصریح کی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ مولوی نذیر حسین صاحب بھی مولوی عطا محمد کے فتوے کے مؤید ہیں یہ ہے اس دلیل کا خلاصہ۔

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس دلیل کے بیان کرنے میں ”جامع الشواہد“ کے مصنف نے ایمان و دیانت کا خون کیا ہے۔ کی طرح کافر یب دیا ہے، اور صریح کذب بیانی اور افترا پر رازی سے بھی کام لیا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔

اولاً — تو مولوی عطا محمد کے متعلق معلوم نہیں کہ یہ کون ہیں، کس عقیدہ اور مسلک کے تھے؟ پھر ان کی بات سے الٰہی حدیث پر کیا الزام؟ ثانیاً — انھوں نے یہ بات کسی الٰہی حدیث کی کتاب سے نہیں لی ہے بلکہ ایک شافعی المذہب عالم کی کتاب سے لی ہے اس کتاب کا نام بھی انھوں نے بتا دیا ہے یعنی فتح المعین شرح قرۃ العین۔ یہ ”جامع الشواہد“ کے مصنف کی بددیانتی ہے کہ اس نے اس کتاب کا نام ظاہر نہیں کیا ہے۔

ثالثاً — رسالہ ”اظہار الحق“ کے مصنف نے نہ اس رسالے کے شروع میں اور نہ اس کے آخر میں کہیں بھی اسکی تصریح نہیں کی ہے کہ اس رسالے کے چھپوانے میں مولوی نذیر حسین صاحب نے بھی کوشش کی ہے۔ جامع الشواہد“ کے مصنف نے یہ بالکل جھوٹ لکھا ہے۔ اور یہ جھوٹ

۳۲۲

اس نے صرف اس مقصد سے لکھا ہے کہ کسی طرح مولوی عطا محمد والی بات مولانا سید نذیر حسین صاحب کے ذمے بھی لگانے کی گنجائش نکل آئے۔

والجاء "جامع الشواہد" کے مصنف کی یہ عبارت بڑی پر فریب اور مغالطہ آمیز ہے کہ "رسالہ اظہار الحق" میں مولوی نذیر حسین صاحب وغیرہ کی بھی مہریں موجود ہیں۔ اس سے دھوکا یہ ہوتا ہے کہ یہ مہریں مولوی عطا محمد کے فتوے کی تائید میں ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس رسالے میں صرف مولوی عطا محمد ہی کا فتویٰ شائع نہیں ہوا ہے، بلکہ یہ رسالہ دہلی لاہور، امرتسر، کپورتھلہ، ہوشیار پور وغیرہ کے بہت سے علماء کے مختلف فتوؤں کا مجموعہ ہے۔ اسی میں ایک فتویٰ مولانا سید نذیر حسین صاحب کا بھی ہے۔ اسی فتوے پر مولانا نذیر حسین صاحب اور مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی وغیرہ علمائے اہلحدیث کی مہریں ہیں۔ اس فتوے کا مولوی عطا محمد کے فتوے سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ مولانا سید نذیر حسین صاحب کی مہر اور دستخط ثبت کرنے کی یہ صورت نہیں ہوئی تھی کہ ان کے سامنے رسالہ اظہار الحق مرتب کر کے پیش کیا گیا ہو۔ بلکہ ان کی خدمت میں الگ ایک استفتاء بھیجا گیا تھا۔ اس کا جواب انھوں نے تحریر فرمایا تھا اور اسی پر اپنا دستخط اور مہر کر دیا تھا۔ وہی دستخط شدہ اور مہر شدہ فتویٰ دوسرے فتوؤں کے ساتھ شامل کر کے "اظہار الحق"، رسالے میں شائع کر دیا گیا ہے۔ رسالہ مذکور کے مرتب خلیفہ احمد شاہ قائم مقام اکسٹرا سسٹنٹ کمشنر ہوشیار پور نے شروع رسالہ میں اسکی تصریح کر دی ہے۔

۳۲۳

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ہم مولانا سید نذیر حسین صاحب
کا وہ فتویٰ نقل کر دیں جس پر انکی مہر ہے۔ ان کی خدمت میں استفتاء
یہ پیش کیا گیا تھا کہ:-

”نصاری کے کنوؤں اور ظروف کا پانی جو جملہ نجاسات اور نجاست
علی اختلاف المذہب سے یقیناً مبرا ہو، ان لوگوں کے لئے استعمال
میں لانا جائز ہے یا نہیں جو اپنے دین سے واقف ہیں اور خوف
ضرر احتلاط و مہانت سے مامون ہیں؟“

”نیز طعام نصاریٰ جو جملہ محرمات و نجاسات مقررہ کل مذہب
اسلام سے محفوظ و خالی ہو مذکورہ بالا اشخاص کے لئے کھالینا
جائز ہے یا نہیں؟“

ان دونوں سوالوں کے جواب میں حضرت میاں صاحب نے تحریر فرمایا

ہے:-

”جائز ہے بدلیل حدیث صحیح بخاری کے کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے ایک عورت مشرکہ کے لکھاں سے لوگوں کو پانی
پلایا۔ اور وضو اور غسل کرایا۔ اور حدیث بخاری اور حدیث
رزین کے کہ حضرت عمرؓ نے عورت نصرانیہ کی ٹھلی سے وضو
کیا۔ اور حدیث ترمذی کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے قبضہ نے سوال کیا طعام نصاریٰ سے تو آپ نے اجازت
دی اور فرمایا لا یتخلجن فی صدرک طعام صارت فیہ

۳۲۴

النصانية اور اغاثۃ اللعفات میں بھی آثار منقول ہیں کہ علی وغیرہ صحابہ نے اہل کتاب کا کھانا کھایا۔ اور جو احادیث و آثار اس کے معارض منقول ہیں وہ محمول ہیں مظنہ نجات پر، یا جہل را شناس پر جن سے خوف سستی دین و تجاوز حدو ہے، نہ اون سے سوال ہے اور نہ اون کے حق میں جواب ہے۔
واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم فقط۔

(دیکھو ابرار اہل الحدیث از ص ۵۲ تا ص ۵۷)

یہ ہے وہ فتویٰ جس پر مولانا سید نذیر حسین صاحب اور مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی وغیرہ چند علمائے اہلحدیث کی مہریں ہیں۔ اور جس کو رسالہ ”اظہار الحق“ کے مجموعہ میں شامل کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے اُس خبیث پنیر کا جس کا ذکر مولوی عطاء محمد کے فتویٰ میں ہے۔ اور جس کے استعمال کرنے کی نسبت بخاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔

لیکن دھاندلی دیکھئے کہ ”جامع التواہد“ کے مصنف نے ایک پر فریب عبارت کے ذریعہ اس مکروہ بات کو حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب وغیرہ کے ذمے لگایا۔ اس کے بعد حنفی مفتی صاحبان نے قطعاً اسکی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وقت کے ایک بالکمال محدث کی طرف ایسی مکروہ بات منسوب کرتے ہوئے تحقیق تو کر لیں کہ حقیقت کیا ہے؟ اسی قسم کے جھوٹے الزامات کی بنیاد پر فتویٰ دیدیا گیا کہ وہابیوں (اہلحدیثوں) کو اخاف

کی مسجدوں سے نکال دیا جائے۔ اس رسالہ میں بہت سے علمائے اہل حق کے فتوے ان کی مہر اور دستخط کے ساتھ موجود ہیں۔ صفحہ ۹ پر جلی سرخی قائم کی گئی ہے ”سواہیر و دستخط علمائے لودھیانہ و دیوبند“ اس کے ذیل میں دیوبند اور لودھیانہ کے علماء کے فتوے درج ہیں۔ علمائے دیوبند نے جس عبارت پر دستخط کئے ہیں وہ یہ ہے

”عقائد اس جماعت کے جب خلاف جمہور ہیں بدعتی ہونا ظاہر اور مثل تجسیم، اور تحلیل چار سے زیادہ ازواج کے، اور تجویز تقیہ اور برا کہنا سلف صالحین کا فسق یا کفر، تو اب نماز اور نکاح اور ذبیحہ میں ان کی احتیاط لازم ہے۔ جیسے روافض کے ساتھ احتیاط چاہیے۔ حررہ محمد یعقوب النالوتوی عفی عنہ۔ رشید احمد گنگوئی عفی عنہ محمد محمود دیوبندی عفی عنہ، محمود حسن عفا عنہ۔

الوالخیرات سید احمد عفی عنہ“ (ص ۱)

یہ اکابر دیوبند کا فتویٰ ہے۔ کسی حوالے اور ثبوت کے بغیر چند عقائد اور مسائل کو پوری جماعت اہلحدیث کی طرف منسوب کر کے کہہ دیا گیا ہے کہ یہ بدعتی ہیں۔ فسق یا کافر ہیں۔ مثل روافض کے ہیں۔ ان کے ساتھ نماز پڑھنا نکاح کرنا۔ ان کا ذبیحہ کھانا، ان سب باتوں میں احتیاط کرنا چاہیے۔ سوچئے! کیا یہ فتوے پتہ رنگ دکھائے بغیر رہتے؟

مشہور احقراری لیڈر مولانا حبیب الرحمن لودی کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ ان کے دادا مولانا محمد لودی لودی کا فتویٰ بھی اسی صفحہ پر درج ہے

انہوں نے پہلے تو تمہید یہ قائم کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص
 پس من کھائے پس نزدیک نہ پھٹکے مسجد ہماری کے۔ اور عمر بن الخطاب سے مروی ہے کہ ایک عورت
 محمد ص کو طواف مکہ سے مانع آئے اور فرمایا کہ تو اپنے گھر میں بیٹھا اور لوگوں کو ایذا نہ دے
 ایک شخص کو ذی مسجد میں وعظ کتبہ رہا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کو چھو کہ ناسخ نسخ
 کہ بتاؤ اس نے کہا مجھ کو ناسخ نسخ کا علم نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا
 اس کو مسجد سے نکال دو۔ نیز شاہ عبدالعزیز صاحب نے نیچے آیت -
 واصبر علی ما یقولون کے لکھا ہے کہ طعن کرنا سلف پر سخت ترین ایذا
 لسانی ہے۔ اور انتباہ میں لکھا ہے کہ موزی کو مسجد میں آنے سے منع کرنا
 چاہئے اگرچہ ایذا اور سببی لسانی ہو اس تمہید کے بعد لکھتے ہیں :-
 ”پس جبکہ روکنا مسجد سے بسبب موجود ہونے ایک امر کے
 امور مذکورہ سے درست ہوا تو غیر مقلدوں کو جو جامع امور
 مذکورہ ہیں نکالنا بطریق اولیٰ درست ہوا۔ اور بسبب حقوق
 مرض باطنی کے جو جذام سے بڑھ کر ہے اور مساجد میں ان کے
 آنے سے فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے۔ اور خدائے تعالیٰ مفسدین
 کو درست نہیں رکھتا۔ قال اللہ تعالیٰ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْمُنٰفِقِیْنَ
 باقی تحقیق اس مسئلہ کی رسالہ انتظام المساجد باخراج اہل الفتن
 و المفساسد میں جو اس عاجز کی تالیفات سے ہے موجود ہے۔
 واللہ اعلم و علمہ اتم الرّاقم محمد لودی انوی خادم العلماء المتوفی فی ستہ ۱۳۷۰ھ
 مولانا محمد لودی انوی نے اس فتوے میں اپنی جس تالیف (انتظام المساجد) کا

والہ دیا ہے اس میں کیا لکھا ہے؟ اس کو ہم آگے بتائیں گے، پہلے
جامع الشواہد کے انادات سے فارغ ہو لیجئے۔ کچھ پڑھ چکے ہیں کچھ اور پڑھیں
جامع الشواہد کے صفحہ ۱ پر موٹے قلم سے سرخی لکھی ہوئی ہے ”مواہرۃ علماء
مشاہیر دارالاسلام مصطفیٰ آباد عرف رام پور“ اس کے نیچے صفحہ ۲ تک
علمائے رام پور کے فتاویٰ اور دستخط ہیں۔ ان میں سے ایک فتویٰ پڑھئے
کتنا زوردار اور ”پُر وقار“ ہے۔ میاں صاحب کی شان میں فرماتے ہیں کہ
”یہ شخص امام اس گروہ غیر مقلدین کا سنی نہیں ہے رافضی ہو تو

عجب نہیں۔ یہ بیچارہ عامیوں کو اپنے ساتھ جہنم میں لے جانا
چاہتا ہے واللہ اعلم“ کتبہ سید عبدالحق (ص ۱)

مولوی ارشاد حسین صاحب رام پوری (متوفی ۱۳۵۸ھ) جنھوں نے حضرت میاں
صاحب کی کتاب ”معیار الحق“ کی تردید میں ”انتصار الحق“ لکھی تھی۔ انھوں
کا فتویٰ بھی اس کتاب میں ہے۔ اور انھوں نے بھی اہلحدیث کو ”فرقہ خالہ
مخالفہ فرقہ ناجیہ اہل سنت والجماعت“ وغیرہ کہا ہے۔ مگر ان کے ایک
شاگرد نے ان سے بھی نمبر ٹپا دیا ہے۔ یہ یالوں کھیسے کہ بزرگوں کے ان
فتوؤں کا جو مقصد تھا اس کو یہ سعادتمند شاگرد سمجھ گیا۔ اور صاف صاف
لفظوں میں ادا کر دیا چنانچہ اس نے لکھ دیا کہ ”ہندوستان کے اس شیخ نجد
کا مقابلہ شمشیر دست و زبان کے ذریعہ کیا جائے“ لکھتے ہیں کہ
”ان حضرات مشیخت مآب حاسدین مفسدین دین و مومنان
مجتہدین و مقلدین اور ان کے مریدین و معتقدین کے حق میں

جن کو حضرت حق جل جلالہ عم نوالہ نے آزادی کا طوق گلے میں ڈال کر ہندوستان کا شیخ بن کر چھوڑا ہے۔ جس قدر شمشیر درست و زبان کے ذریعہ سے مقابلہ بر محل کیا جائے تھوڑا ہے۔ فی الحقیقت یہ سب کے سب ضال اور مضل ہیں۔ اور سلسلہ مذاہب اربعہ فقہ سے خارج ہو محمدی بنکر دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں رخنہ انداز و مخل اور ان کے عقائد پر مسکاید منجر بکفر و شرک و الحاد..... کتبر العبد الاثم ابو الجلیل معین الدین محمد عبد الجلیلؒ یہاں موصوف کی مہر ہے جس کے ساتھ یہ عبارت لکھی ہوئی ہے ”مہر تلمیذ مسرت مولانا محمد ارشار حسین صاحب“ (راجع الشواہد ص ۲)

بتائیے! ”زبان کی تلوار“ کا کام تو یہ فتوے کر رہی ہے تھے۔ اس کے بعد ”شمشیر درست“ رہا تھ کی تلوار کے ذریعہ مقابلہ کر کے پربرائی گنتہ کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا؟ کہ ان غیر مقلدوں کو اور ان کے ”شیخ“ کو ڈنڈوں سے مارا جائے، بلکہ ان کو قتل بھی کر دیا جائے تو تھوڑا ہے۔

○ اب مولانا محمد صاحب لودھیانوی کی تالیف ”انتظام السنۃ باخراج اہل الفتن والمفسد“ جس کا ذکر پہلے آیا ہے (کا حال سنئے

۱۔ ہم مولانا ابو علی الاثری کے ممنون اور شکر گزار ہیں ان کی کرم فرمائی ہے ہم کو جامع الشواہد ۲۔ انتظام المساجد، دونوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ یہ دونوں رسالے مکتبہ دار المصنفین عظیم گڑھی میں موجود ہیں ۱۲۸ھ

اس میں بھی چند سوالات استفتا کی شکل میں پیش کر کے ان کے جوابات دیئے گئے ہیں لیکن کمی مستغنی کا نام و پتہ درج نہیں ہے اس لئے کچھ عجب نہیں کہ مفتی صاحب نے اپنے جوابات ذہن میں رکھ کر انہیں کے مناسب سوالات بھی خود ہی مرتب کئے ہوں۔ بہر حال پہلے سوال میں جو چند عقائد اور مسائل اہل حدیث علماء کی طرف منسوب کر کے ذکر کئے ہیں انہیں میں یہ مسئلہ بھی بیان کیا ہے کہ:

”..... (جو شخص) واسطے جواز سواکلت و مشاربت اہل کتاب کے یہ سند اقرائی گزارے کہ جو قروط بآمینرش چربی خنزیر طیار کئے ہوئے اہل کتاب کے یمن سے آیا کرتے تھے معاذا اللہ آنحضرت اون کو کھایا کرتے تھے جیسا کہ مولوی عطا محمد ہوشیار پوری نے رسالہ اظہار الحق میں لکھا ہے اور اس رسالہ پر مولانا مولوی نذیر حسین اور مولوی محمد حسین لاہوری وغیرہ کی ثبت ہو کر لاہور میں چھپ کر پادریان لودیانہ کے پاس آیا اور اخبار نور افشاں میں دیر تک چھپتا رہا ص ۱۲۳“

یہی الزام ”جامع الشواہد“ کے مندرجات کے ذکر کے سلسلہ میں ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ دونوں کی عبارتوں پر غور کیجئے تو بالکل نمایاں اختلاف بیان نظر آئے گا۔ دونوں کے بیان کا یہ فرق تو خیر معمولی ہے کہ خنزیر کی چربی کی آمینرش والی یہ چیزیں ملک شام سے آتی تھیں جیسا کہ جامع الشواہد میں ہے، یا ملک یمن سے (جیسا کہ انتظام المساجد میں ہے) بڑا فرق جو ہے

۲۳۰

وہ یہ کہ ”جامع الشواہد“ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ ”اظہار الحق“ مولوی عطا محمد کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ یہ رسالہ لکھا ہوا تو کسی دوسرے کے ہے، البتہ اس میں مولوی عطا محمد کا فتویٰ مندرج ہے۔ اور اسی فتوے میں چربے والی چیزوں کی یہ روایت بھی ہے۔ اس کے برخلاف ”انتظام المساجد“ کی یہ عبارت۔ ”جیسا کہ مولانا عطا محمد ہوشیار پوری نے رسالہ ”اظہار الحق“ میں لکھا ہے“ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسالہ ”اظہار الحق“ مولوی عطا محمد کا لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ اس بارے میں جامع الشواہد ہی کا بیان صحیح ہے۔ رسالہ ”اظہار الحق“ خان احمد شاہ قائم مقام اسٹریٹسٹنٹ کمشنر ہوشیار پور کا مرتب کیا ہوا اور شائع کیا ہوا ہے۔ انھوں نے چند فتوے علمائے دہلی و لاہور و امرتسر و کپورتھلہ و ہوشیار پور وغیرہ سے حاصل کر کے اس میں شامل کئے ہیں۔

دیکھو ابراہیل حدیث والقرآن مافی جامع الشواہد من التہمت والہتیان (ص ۵۵)
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ”انتظام المساجد“ کے مؤلف نے خود رسالہ ...
اظہار الحق دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ سنی سنائی باتوں پر اعتماد کر لیا ہے۔ یا ہو سکتا ہے کہ ”نور افشاں“ میں عیسائیوں نے اس کے نقل کرنے میں کچھ گڑبڑ کی ہو اور موصوف نے اسی کو اپنا ماخذ بنایا ہو لیکن یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسے شدید اور سنگین الزام کے لئے جسکی بنا پر کفر و ارتداد کا فتویٰ دیا گیا ہو۔ اتنے تساہل اور غفلت سے کام لیا جائے اس کے بعد ”انتظام المساجد“ کی اس عبارت میں کہ ”اس رسالہ

پرمواہیر مولوی نذیر حسین اور مولوی محمد حسین لاہوری وغیرہ کی ثبت ہیں۔
 وہی تبلیغ اور فریب کاری پوشیدہ ہے جسکی تفصیل رسالہ جامع الشواہد
 کے بیان کے سلسلہ میں گذر چکی۔ یعنی مولانا سید نذیر حسین صاحب
 وغیرہ اور علمائے اہلحدیث کا دستخط اور مہر ہرگز اس فتویٰ پر نہیں ہے
 جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مذکورہ بالا روایت کا ذکر
 ہے۔ ان حضرات کی مواہیر اس سے باہل الگ ایک دوسرے فتوے
 پر ہیں جسکو ہم نے پچھلے صفحات پر ذکر کیا ہے۔ لیکن لودی یا لودی صاحب
 نے کسی تحقیق و تفتیش کے بغیر کفر و ارتداد کا فتویٰ داغ دیا ہے۔ لکھتے ہیں:-
 ”اور افتراء مندرجہ استفتاء در باب اکل قمر و طند کورہ
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کفر صریح اور ارتداد قبیح ہے۔“

(ص ۵)

اس کے بعد ”تحفۃ الاخلاء فی عصمت الانبیاء“ سے ایک طویل عربی
 عبارت نقل کی ہے جس میں کسی نبی کی توہین کرنے والے کے متعلق
 احکام بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا خلاصہ لودی یا لودی صاحب ہی کے الفاظ
 میں یہ ہے لکھتے ہیں:-

”خلاصہ مطلب اس کلام کا یہ ہے کہ آنحضرت پر افتراء کرنے
 والا مرتد ہے اور حکام اہل اسلام پر لازم ہے کہ اس کو قتل
 کریں۔ اور عذر داری اُس کی بایں وجہ کہ مجھکو اس کا علم
 نہیں تھا شرعاً قابل پذیرائی نہیں بلکہ بعد توبہ کے بھی اُسکو۔“

۳۳۲

مارنا لازم ہے اور علماء اور مفتیان وقت پر لازم ہے کہ بجز دسموع ہونے لیے امر کے اُس کے کفر اور ارتداد کا فتویٰ دینے میں تردد نہ کریں۔ ورنہ زمرہ مرتدین میں یہ بھی داخل ہوں گے اور عوام اہل اسلام پر لازم ہے کہ بجز وقوع ایسے مفردہ کے مدعی اور گواہ ہو کر حکام سے سزایابی اُسکے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کریں۔

اللہ اکبر! کیا ٹھکانہ ہے ان اشتعال انگیز لیوں اور فتنہ سامانیوں کا؟ علماء اور مفتیوں سے کہا۔ ان (غیر مقلدوں) کو بلا تردد کافر اور مرتد ہونے کا فتویٰ دو۔ جو ان کے کفر میں شک کرے اس کو بھی کافر کہو۔ ان کو مسجدوں سے نکلواؤ۔ عوام سے کہو ان پر مقدمے دائر کرو۔ ان کے خلاف عدالتوں میں جا کر شہادتیں دو۔ ان کو سزائیں دلاؤ۔ جیل بھجواؤ۔ الغرض ان کو پریشان کرنے کے لئے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرو۔ ان کے خلاف جو کچھ کر سکتے ہو کر گزرو۔ ان سب باتوں کے باوجود کیجئے ٹھنڈا نہیں ہوا تو صاف صاف کہہ دیا کہ حکام اہل اسلام پر لازم ہے کہ ان کو قتل کریں۔ توبہ کے بعد بھی ان کو مارنا لازم ہے۔ مانا کہ یہ کسی عربی عبارت کا ترجمہ اور خلاصہ ہے۔ لیکن لودھیانوی صاحب نے تو اس کو چسپاں اہل دینوں ہی پر کیا ہے؟ اور انھیں کو اس کا مصداق ٹھہرا کر اس موقع پر اسکو پیش کیا ہے۔ چنانچہ آگے کے صفحات پر انھوں نے خود ہی اسکو ظاہر کر دیا ہے۔ صفحہ دس کے اس سوال کو اور اسکے جواب کو

سوال :- بعض غیر مقلد امور مذکورہ استفتاء سے اپنی بریت
ظاہر کرتے ہیں۔

جواب :- اگرچہ بعض غیر مقلد بظاہر کلمات مذکورہ سے بریت
اپنی بیان کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ موالات اور معاونت انہی
مذہب نظر رکھتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی مقدمہ غیر مقلدین کا ساتھ اہل
سنت کے ہندوستان یا بنگالہ یا پنجاب وغیرہ میں واقع ہو۔
چندہ جمع ہو کر روانہ ہوتا ہے اور بذریعہ خط و تحریر بری مدد
پہنچتی ہے۔ پس یہ لوگ بھی بموجب آیت وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ
مَتَكْفُرًا منہم اسی فریق میں داخل ہوئے اگرچہ ایسے
اشخاص کی نسبت ہم فتویٰ صراحۃً کفر اور ارتداد کا نہیں دے
سکتے لیکن اخراج ان کا بھی مساجد سے ضرور ہے کیونکہ خلط
ملط ہونے ان کے سے عقائد عوام کے بگڑ کر اہل سنت کو
سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ اور اخراج ان کا داخل ظلم نہیں بلکہ
عین عدل ہے۔ المراقم محمد ولد مولوی عبدالقادر صاحب
مرحوم لودھیانوی حال دار عظیم آباد۔

اس سوال و جواب کے بعد تو کوئی شبہہ نہیں رہ جاتا کہ لودھیانوی صاحب نے یہ ساری اشتعال انگیزیاں اہلحدیثوں ہی کے خلاف کی ہیں۔ اور انہیں کئی ایذا دہانی کے لئے عمار اور عوام اور حکام سب کو بھڑکایا ہے۔

۳۳۴

اس سوال و جواب کی وسیہ کاریاں بھی قابل ملاحظہ ہیں۔ بڑی ہوشیاری سے غیر مقلدوں (اہلحدیثوں) کو: "اقراری ملزم" بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں: "بعض" غیر مقلد کلمات مذکورہ استفتاء سے اپنی بریت بیان کرتے ہیں۔ اور وہ بھی "ظاہر میں" گویا اکثریت کو تو "ظاہر" میں بھی ان الزامات سے انکار نہیں ہے اور باطن میں تو سبھی کو تسلیم ہے کہ استفتاء میں جتنی باتیں مولانا سید نذیر حسین صاحب یاد دوسرے علمائے اہلحدیث کی طرف منسوب کی گئی ہیں وہ سب حق اور درست ہیں کیا کہنا ہے اس سادگی اور معصومیت کا؟

بتائیے! اگر اسوقت ہندوستان میں حنفی مذہب کی حکومت رہی ہوتی تو ان فتوؤں کے بعد غریب اہلحدیثوں کو کہیں پناہ ملتی؟ اور حضرت میا نصاحب کو اس سرزمین پر زندہ رہنے کا حق دیا جاتا؟ ہم تو اسکو اپنے ان بزرگوں کی کرامت ہی سمجھتے ہیں، جنہوں نے دیوبندی اور بریلوی دونوں مکتب فکر کے مفتیوں کی اس متفقہ یورش کے باوجود تحریک اہلحدیث کو ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ زندہ رکھا، بلکہ جان کی بازی لگا کر اسکو فروغ دیا، اور پروان چڑھایا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

لودھیانوی صاحب اور ان کے مؤیدین کی منشا کے مطابق حنفی مفتی صاحبان اور عوام نے تو اپنا اپنا کام جاری کر رکھا تھا۔ لیکن ان کا وہ آخری منصوبہ جس کیلئے انہوں نے وہ حکام اہل اسلام کو براہِ انگیختہ کیا

۳۳۵

تھا، اس کی تکمیل کی ہندوستان میں گنجائش نہیں تھی۔ اس لئے میانضبا کو یہ خطرہ محسوس ہوا، اور بالکل بجائے محسوس ہوا کہ حجاز کی حنفی حکومت کو اس منصوبہ کی تکمیل کیلئے بھڑکایا جائے تو تعجب نہیں جیسا کہ وہ ہندوستانی علماء احناف جو اس وقت مکہ معظمہ میں مقیم تھے، ان میں سے بعض کے متعلق حاجیوں کی زبانی اس قسم کی دھمکی کی بات مشہور بھی ہو گئی تھی۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم نے مولوی رحمت اللہ صاحب کیرالوی (ضلع مظفر نگر) کی بابت لکھا ہے کہ وہ مکہ مکرمہ میں اہلحدیث کے ساتھ بڑی دشمنی رکھتے تھے اور انکی ایذا رسانی کے درپے بستے تھے

خصوصاً مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب کی تکلیف دہی کے فکر میں رہنا ایک مدت سے مشہور ہے۔ تھوڑا عرصہ ہوا کہ مکہ میں بعض لوگ بارادہ حج پہنچے تو اسکی زبان سے یہ بات سن آئے ہیں کہ اگر مولوی سید نذیر حسین ایک دفعہ یہاں مکہ میں آجائے تو پھر جان سلامت نہ لے جائے یہ بات مجھے ایسے اشخاص سے ہو چکی ہے جسکو میں دلی مایوس نہ کہہ سکتا ہوں۔ اور میں خود بھی جبکہ مکہ میں مقیم تھا مولوی رحمت اللہ کے زبان سے مولانا ممدوح کے حق میں مغلظ و شناسن چکا ہوں۔ اسی دن سے میں نے مکہ سے کوچ کرنے کا قصد کیا ورنہ میں حج کے بعد سال بھر کا ارادہ قیام رکھتا تھا جس سے صرف چار پانچ مہینے کا عرصہ گزرا تھا۔

(اشاعت السنۃ جلد ۶ ص ۲۱۱)

۳۳۶

ان تفصیلات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ میاں صاحب کو جو خطرہ محسوس ہوا تھا وہ محض خیالی نہیں تھا بلکہ وہ ان واقعات پر مبنی تھا جو ان کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ تو اب ہمیں انصاف سے بتایا جائے کہ ایسے سنگین حالات میں کیا انسانی فطرت کا تقاضا یہی تھا کہ میاں صاحب اپنی حفاظت کیلئے مناسب تدابیر پر غور نہ فرماتے؟ اور ان کے لئے جدوجہد نہ کرتے؟ اگر نہیں، تو پھر حجاز کی حکومت۔

(حکومت کے لفظ کو ذہن میں رکھئے) کے کمی فیصلہ پر دباؤ ڈالنے والی تدبیر اسکے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ میاں صاحب برطانوی حکومت کی رعایا ہونے کی حیثیت سے برطانوی قونصل مقیم جدہ کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرتے؟ ان حالات کو نظر انداز کر کے خواہ مخواہ اس معاملہ کو انگریز کی وفاداری کا معنی پہنانا یقیناً تاریخ پر ظلم ہے۔

اس موقع پر حضرت میاں صاحب

قدس سرہ کی عاقبت اندیشی اور

ایمانی فراست کا اعتراف کرنا پڑتا

ہندوستان سے لیکر مکہ
تک کے علمائے ارحام درپے آزار تھے

ہے کہ ان کی دور بین نگاہوں نے اپنے سفر حج میں پیش آنے والے جن خطرات کو بھانپ لیا تھا وہ آخر ان کو پیش آکر رہے۔ اور کیوں نہ پیش آتے جبکہ ہندوستان سے لے کر مکہ معظمہ تک کے ہندوستانی علمائے احناف اسکے درپے تھے۔ مولانا آزاد مرحوم کا یہ بیان ایک بار پھر بڑھے ہندوستان میں چونکہ اس وقت تقلید اور عدم تقلید کا

۳۳۷

فتنہ زور پر تھا اور مولانا نذیر حسین غیر مقلدین کے سب سے
 بڑے شیخ سمجھے جاتے تھے۔ فوراً مکے میں اطلاع دیدی گئی
 کہ وہاں بیہ کاسیہ سے بڑے سرغنہ آ رہا ہے، اگر یہاں کوئی
 کاروائی نہ کی گئی تو اس بات کو وہاں جہاز میں اپنی فتح سے
 تعمیر کریں گے، اور عوام کو اس سے بہت فتنہ ہوگا۔

اب آئیے! تاریخ کے اوراق میں ہم ڈھونڈیں کہ اس اطلاع کے
 مطابق مکہ میں وہاں بیہ کے سب سے بڑے سرغنہ کے ساتھ کوئی
 ”کاروائی“ کی گئی یا نہیں؟ اگر کی گئی تو وہ کون سے اصحاب تقویٰ ہیں
 جنہوں نے یہ خدمت انجام دی ہے

لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں
 کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

ایک ٹولی نے سچپا کیا اور مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کے
 رسالہ ”اشاعت السنہ“ جلد ششم
 راستہ بھر پریشان کرتی رہی اور ”الحیاء بعد المات“ میں اسکی
 تفصیلات شائع ہوئی ہیں۔ انہیں دونوں سے کچھ اقتباس ہم یہاں تلخیص
 و اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں مولانا بٹالوی لکھتے ہیں:

”مولانا مدوح دہلی سے روانہ ہوئے تو آپ کے حریف نے بھی
 چند اشخاص کو مختلف مواضع پنجاب، دیوبند، دہلی بدایوں

۳۳۸

دیگرہ سے گلابی چو ورقہ رسالہ کے ساتھ روانہ کیا پہلے تو یاروں نے بمبئی پہنچ کر مولانا ممدوح پر در کرنا چاہا اور چند علماء بمبئی کو اپنے ساتھ ملا کر اس گلابی چو ورقہ کے سوالات میں کچھ اور کفریات بڑھا کر مولانا ممدوح کے سامنے پیش کیا۔ جس سے مقصود ان حضرات کا صرف یہ تھا کہ ان سوالات سے اسے افتراءات کو سنکر مولانا ممدوح اور آپ کے رفقار کو خواہ مخواہ طیش و جوش آدے گا۔ اور اس سے معاملہ طویل پکڑے گا۔

اعلیٰ گلابی چو ورقہ رسالہ سے مراد رسالہ ”جامع الشواہد“ ہے جیسا کہ مولانا بٹالوی نے اشاعت السنہ میں دوسری جگہ لکھا ہے: ”اور ایک چو ورقہ رسالہ گلابی موسومہ بجامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد تمام دنیا میں شہرہ کئے“ (جلد ۶ شمارہ ۸ ص ۲۲) یہ رسالہ پہلے گلابی رنگ کے کاغذ پر چھپا تھا پھر دوبارہ کچھ فتوؤں کا اضافہ کر کے زرد رنگ کے کاغذ پر چھپا اور شائع ہوا۔ مولانا بٹالوی ہی لکھتے ہیں: ”اور گلابی چو ورقہ جو زرد ہو کر ۲۰ صفحوں میں مطبع فیض عام دہلی میں دوبارہ چھپا ہے۔ اور اس پر لودھانہ، پانی پتہ، رلیو بندر گنگوہہ۔ رام پور وغیرہ کے علماء کی مہریں زیادہ کی گئی ہیں۔“

(جلد ۶ ص ۲۹۲)

یہی زرد کاغذ والا دار المصنفین اعظم گڑھ میں موجود ہے اور اسی سے ہم نے استفادہ کیا ہے۔ ۱۲ منہ

مگر مولانا ممدوح ان کی غرض فساد کو تارکے۔ جب ان سوالات کو پڑھا کر سنا تو بر ملا صاف صاف فرما دیا کہ یہ سب باتیں مجھ پر بہتان ہیں۔ اور میں ان کے معتقد کو کافر جانتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ اور ان کے ساتھ بحث و مباحثہ میں الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔

جب آپ بمبئی میں جہاز پر سوار ہوئے تو مخالفین نے اسی اسٹیمر میں سوار ہوئے اور وہاں بھی چھڑ چھاڑ سے باز نہ آئے۔ بلکہ ہمیشہ ہر قسم کی ایذا رسانی کی تاک میں لگے رہے۔ مگر آپ نے بغورائے و اعراض عن الجاہلین کسی کو بھی منہ نہ لگایا۔ اور ان لوگوں کو بھی اپنی کسی سازش میں کامیابی نہیں ہوئی۔ زیادہ تر وجہ اسکی یہ تھی کہ ان مخالفین کو برٹش پائل مقیم جدہ کا ڈر لگا ہوا تھا۔ جسے چٹھیوں کے دیکھنے کے بعد آپ کی بہت تعظیم و تکریم کی۔ اور جب تک جہاز کامران میں رہا وہ روز آپ کی ملاقات کے لئے آتا رہا۔

مگر افسوس کہ وہ کامران ہی میں مفدین سوڈان کے ہاتھوں سے قتل ہو گیا۔ اگر وہ جدہ میں واپس آتا تو یقیناً مکہ معظمہ کے معاملات میں نہایت قیمتی امداد کرتا۔

جب مولانا ممدوح مکہ شریفہ پہنچے اور ان کے حریف بھی وہاں داخل ہوئے

مکہ معظمہ میں میا انصاری خلاف افسوسناک لیشہ دوانیاں

۳۴۰

تو مولانا ممدوح کو جام شہادت پہلانے یا مکہ میں قید کرانے کیلئے ان حضرات نے وہاں ایک کمیٹی مقرر کی جس کے پریسڈنٹ مولوی محمد رحمت اللہ کیرانوی تھے۔ اور ممبروں میں حاجی امداد اللہ مولوی عبد القادر بدایونی۔ مولوی خیر الدین اور چند اشخاص دیوبند وغیرہ کے تھے۔ اس کمیٹی کی رات دن کارروائی اور تدبیر آرائی یہ تھی کہ جسطرح ہو سکے مولانا کو یہاں شہید کرا دیں۔ یا جس دوام میں پھنسا دیں.... مگر حج کے زمانے میں چونکہ عام ساکنان مکہ رمطون موزن۔ مولوی مفتی قاضی، گواہ وغیرہ) سبھی فلس کمانے کے لئے حاجیوں کے ارد گرد پھرتے ہیں اور گھر گھر کا طواف کرتے ہیں اس لئے تا فراغ حج کوئی کسی سے تعرض نہیں کرتا۔ اس وجہ سے اس کمیٹی کی کوششوں کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ ظاہر نہ ہوا کہ انہوں نے اپنے خیالی اور جعلی مقدمہ کیلئے گواہوں کو جنکی تعداد پاشا مکہ کی تقریر آئندہ سے ساڑھے تین سو معلوم ہوتی ہے) سکھا پڑھا کر آمادہ کر رکھا تھا۔ اس دوران میں مقدمہ عدالت میں پیش نہ ہوا۔ اس لئے مولانا ممدوح نے اطمینان سے فریضہ حج ادا کیا۔ دسویں ذی الحجہ کے بعد تین دن ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳ ذی الحجہ تک میاں صاحب نے منیٰ میں قیام فرمایا۔ اور تینوں دن برابر وعظ فرماتے رہے۔ جس میں شرک و بدعت سے اجتناب اور عمل بالحدیث کی ترغیب، رسومات بدکی تردید، اور خاص اہل مکہ کی بدعتوں کی اصلاح کا بیان تھا۔ یہ وعظ عربی اور فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہوتا تھا۔ کیونکہ منیٰ میں مختلف ملکوں کے لوگ موجود تھے۔ اس

وعظ و تذکیر سے معاندین کی آتش عداوت و حسد اور تیز ہو گئی۔ تو میاں صاحب کے شاگرد اور رفیق سفر مولوی قلعطف حسین صاحب عظیم آبادی نے بہمت و سماجت عرض کیا کہ یہ وعظ بند فرمادیں۔ یہ جو کیٹیاں ہماری نسبت رات دن ہو رہی ہیں۔ یہ اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہیں گی۔۔۔ مخالفین کی سازش بہت گہری ہو چکی ہے۔ اب جان کی خیر نظر نہیں آتی آپ حج سے فارغ ہو ہی چکے ہیں۔ آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ مدینہ طیبہ جانے کا ارادہ فرمادیں (اب بہت جلد وطن واپس ہو جائیں)۔

اس کے جواب میں میاں صاحب نے صاف صاف کہہ دیا: ”سوجھا! بہت جی چکا اب زندگی کی تمنا نہیں ہے۔ امام نسائیؒ بھی اسی حرم میں شہید ہوئے تھے۔ جہاں میرے قتل کے منصوبے ہو رہے ہیں۔ میں ہر وقت اپنے قتل کیلئے آمادہ ہوں۔ مگر اس تبلیغ سے باز نہ آؤں گا۔“

اس وعظ کا ذکر میاں صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں بھی فرمایا ہے لکھتے ہیں:-

”و زمرہ و منیٰ متضمن احیاء سنت و امامت بدعت روزانہ حیرے میگفتم حالانکہ نرغہ دشمنان دین بود، از خدای خواستم کہ مثل امام نسائی جان در آنجا و ہم چہ کنم کہ خاک ہندوستان و آب و ہوا دہلی مرا نگذاشتہ“ (مکاتیب نذیریہ ص ۱۸۱)

یعنی کہہ و منیٰ میں احیاء سنت اور بدعت کے بارے میں روزانہ وعظ کہتا تھا۔ حالانکہ دشمنان دین کے نرغہ میں تھا۔

۳۴۲

خدا سے چاہتا تھا کہ امام نسائی کی طرح میں بھی اپنی جان اسی جگہ دیدوں۔ لیکن کیا کروں کہ ہندوستان کی خاک اور دہلی کی آب و ہوا نے مجھ کو نہیں چھوڑا۔“

ان خطرناک سازشوں اور افسوس ناک رشتہ دوانیوں کے باوجود میاں صاحب نے مدینہ طیبہ کی حاضری کا ارادہ فسخ نہیں کیا۔ اور ۲۳ رزی الحجہ تک مکہ معظمہ میں اسی انتظار میں کھڑے رہے کہ حاجیوں کا کوئی قافلہ مدینہ منورہ تک پہنچے تو وہ بھی ساتھ ہو لیں۔ ادھر مخالف کمیٹی کے ممبروں کو اپنی گہری اور سازشی کارروائیوں پر ہر طرح اطمینان ہو چکا تھا۔ انھوں نے اپنے خیال میں میاں صاحب کے خلاف پورا مواد جمع کر لیا تھا۔ اس لئے اُسی تاریخ کو پاشا رملہ کے یہاں مخبری کرادی کہ مولوی نذیر حسین معترلی اور وہابی ہیں اور ان کے ایسے ایسے عقائد ہیں۔

میاں صاحب کے خلاف جو
کیس کی تیاری میں ہندوستانی
فتوویٰ سے کام لیا گیا

کیا تھا، اور اس کو کس ”دیانت رازی“ کے ساتھ ترتیب دیا گیا تھا، اس کا حال مولانا آزاد کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں:

”اس زمانے میں ہندوستان میں ایک فتویٰ ”جاث الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد“ کے نام سے مرتب ہوا تھا۔ اس میں چند عقائد تو واقعی اس جماعت کے تھے اور بڑا حصہ

منسوبات کا تھا، یا خود الزامی طور پر ان کے عقائد کا استخراج کیا گیا تھا مثلاً شحم خنزیر کی حلت، بول طفل صغیر کی طہارت، مادۃ انسانی کا پاک اور قابل اکل ہونا، خالہ سے مناکحت کا جواز، اور جواز کذب باری تعالیٰ وغیرہ وغیرہ، والد مرحوم نے مولانا ندیر حسین مرحوم کے عقاید کی نہر سب سے زیادہ مراسی جامع الشواہد سے اخذ کی تھی۔ البتہ معیار الحق سے تقلید شخصی کے عدم وجوب اور التزلم و تعین تقلید محضی کے مفساد اور امام صاحب کی تابعیت سے تاریخی طور پر انکار، اور تحدید دہ درودہ کی عدم صحت اور تحدید نطل مثلیں کی عدم صحت، اور بعض دیگر مسائل مختلف فیہ میں مذہب محدثین کی توثیق وغیرہ کو لیکر بہت رنگ آمیزی کے ساتھ ترجمہ کیا گیا تھا۔ اور یہ استدلال کیا گیا تھا کہ ان سے امام صاحب کی تحقیر و توہین مقصود ہے۔

د آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۱۱۱

اس اقتباس میں مولانا آزاد کا یہ جملہ خاص طور سے قابل توجہ ہے کہ "بہت رنگ آمیزی کے ساتھ ترجمہ کیا گیا تھا" یہ اس کیس کا حال ہے جس کی سازش میں حاجی امداد اللہ صاحب جیسے بزرگ بھی شامل تھے جو دیوبندی حضرات کے پیروں کے پیر تھے!!

مخالفین کی خبری کے بعد میاں صاحب اور ان کے ساتھیوں پر کیا

۳۴۴

گذری؟ اسکی تفصیلات کیلئے رسالہ ”اشاعت السنۃ“ کے اقتبیات نقل کرنے کے بجائے ہم مولانا آزاد کا بیان نقل کروینا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں:-

مکہ میں میاں صاحب کی گرفتاری حسین اور مولانا تلطف حسین اور شریف مکہ کے سامنے پیشی

عظیم آبادی مع ایک اور رفیق کے گرفتار کر لئے گئے اور ایک نہایت تنگ و تاریک محبس میں قید کر دیئے گئے۔ چند دن بعد ان کو شریفانے بلایا۔ اور جب انھوں نے اپنی گرفتاری کی وجہ پوچھی تو کہا وہاں بی عقاید رکھنے کی وجہ سے گرفتار کیا گیا ہے۔ مکہ معظمہ اسلام کا اصلی مرکز ہے۔ اسلئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ فیاسد عقاید رکھنے والوں کا احتساب کریں۔ تاکہ وہ مسلمانوں کو گمراہ نہ کر سکیں۔ دوسرے دن شریف کے بہاں ایک مجلس منعقد ہوئی اور اس میں والد

مرحوم سے کہا گیا کہ ان کے عقاید کی فہرست پیش کریں۔ فہرست میں سب سے پہلا الزام امام صاحب کی توہین کا تھا۔ اور باقی مذکورہ الزامات تھے مولانا نازیر حسین مرحوم کی طرف سے مولوی تلطف حسین تقریر کرتے تھے۔

سب سے پہلے انھوں نے اس حالت پر افسوس کا اظہار کیا کہ ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں کفار کی سلطنت ہے، لیکن وہاں ہمارے عقاید کی وجہ سے ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچایا جاتا۔ یہاں اسلامی حکومت ہے دارالامن ہے اور بلا کسی وجہ کے ہم گرفتار کر کے مبتلائے شکن کیا جاتا

ہے پھر کہا کہ ہم پر یہ الزام ہے کہ ہم وہابی ہیں اور محمد بن عبد الوہاب کی عمتا سے ہیں بالکل غلط ہے۔
 بہتر آن حدیث مانتے ہیں اور اسی پر عمل کرتے ہیں اس پر والد مرحوم نے کہا کہ اجماع و قیاس
 بھی مانتے ہو؟ مولانا نذیر حسین نے کہا کہ ہاں ہم اجماع اور قیاس کو اسی طرح
 مانتے ہیں۔

جس طرح ائمہ مجتہدین مانتے تھے اس پر گفتگو شروع ہوئی اور بہت
 قال و قیل ہوئی۔ اسکے بعد کہا گیا کہ ائمہ اربعہ کی نسبت تمہارا کیا عقیدہ
 ہے؟ انھوں نے کہا ہم انھیں اپنا سرتاج و پیشوا اور برسر حق سمجھتے ہیں
 اور ان میں امام ابو حنیفہؒ کو سب سے زیادہ قابل احترام سمجھتے ہیں۔ اس
 پر معیار الحق پیش کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس طرح کے مباحث
 امام صاحب کے توہین ہیں تو وہ تمام کتابیں بھی توہین پر ہوں گی،
 جن میں مسائل مختلف فیہ پر بحث کی گئی ہے۔ اور خود سلف نے لکھی ہر
 پھر ایک ایک کر کے تمام الزامات سنائے گئے۔ انھوں نے بڑے جوش
 سے اپنی برائت ظاہر کی۔ اس پر ثبوت میں جامع الشواہد پیش کی گئی
 انھوں نے کہا یہ مخالفین کی چیز ہے اور ہم اس کے ذمہ دار نہیں۔ اس پر
 کسی پشادری کا ایک رسالہ پیش کیا گیا، جو مولانا نذیر حسین کا شاگرد تھا
 مگر انھوں نے اس سے بھی اپنی بے تعلقی ظاہر کی۔

اس سے آگے مولانا آزاد فرماتے ہیں:

”معلوم ہوتا ہے مولانا نذیر حسین مرحوم، مجمل و مختصر بیان دیکر
 معاملے کو ختم کرنا چاہتے تھے، کیونکہ سمجھتے تھے تفصیلات میں“

۳۴۶

پڑنایا مباحثہ کرنا، طاقت کے مقابلے میں بے کار ہے آخر میں
انہوں نے اس بیان پر اکتفا کی کہ ہمارا عقیدہ اہل سنت والجماعت
کا ہے۔ ائمہ اربعہ کو ہم مانتے ہیں۔ چاروں کو ہم حق پر سمجھتے ہیں۔
امام ابوحنیفہ کو اپنا پیشوا جانتے ہیں۔ ان کے بعض کو خلاف
شیوہ ایما قی سمجھتے ہیں۔ اور کرتب فقہ پر عمل کرنا، جب تک
قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہو، خود ہمارا شیوہ ہے۔

مولانا آزاد کے والد میاں صاحب کے اس بیان سے کیوں مطمئن ہوتے
وہ تو میاں صاحب کو مصائب میں مبتلا کرنے کیلئے بہانے کی تلاش میں
تھے اس لئے میاں صاحب کے اس بیان کو انہوں نے ”مکاید و ہابیہ“
قرار دیا چنانچہ مولانا آزاد فرماتے ہیں :-

”یہ بیان علمائے حجاز کیلئے ایک حد تک تشفی بخش ہو جاتا،
لیکن جیسا کہ والد مرحوم کہا کرتے تھے، وہ ان باتوں کو دہائیوں
کے ”مکاید“ تصور کرتے تھے کہتے تھے کہ میں نے یہ مکاید نہ
چلنے دیئے اور کہا تفصیلاً بتاؤ کہ ائمہ اربعہ میں کس امام کی تقلید
کرتے ہو؟ اور فلاں فلاں مسائل میں تمہارا کیا اعتقاد ہے؟“

اس پر انہوں نے تیسری مجلس
میاں صاحب نے اپنے عقاید کی
بابت ایک تحریر پیش کی۔
لکھا تھا کہ میں ائمہ اربعہ کی تقلید
کو فراموش نہیں کرتا، لیکن عوام کیلئے اور ان کے

جو فقہ و حدیث میں نظر نہیں رکھتے ہیں جب تک قرآن و حدیث کے خلاف کوئی صریح بات پیش نہ آئے، کتب فقہ متداولہ پر عمل کرنے کو مستحسن سمجھتا ہوں۔ اس کے علاوہ فلاں فلاں عقاید اور الزامات جو میری طرف منسوب کئے گئے ہیں، میں اُن سے بری ہوں اور حلفیہ کہتا ہوں کہ میرے عقاید وہ نہیں ہیں۔

اس کے آگے مولانا آزاد نے بتایا ہے کہ:

اس آشنا میں ان کی گرفتاری کی خبر
جدے میں برٹش قونصل کو پہنچا
میاں صاحب کی رہائی
جاریا تھا۔ بالآخر نودن کے جس کے بعد ان سے اس آخری تحریر پر دستخط کرائے گئے اور انھیں رہا کر دیا گیا۔

مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم نے "اشاعت السنۃ" جلد ۶ - ۷ میں جو تفصیلات لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں صاحب کے مخالفین و معاندین حضرات کی کمیٹی نے جو تجویز کی تھی۔ اس کے بعد کئی بار پاشا مکہ کے یہاں میاں صاحب کی طلبی اور پیشی ہوئی۔ اور ہر بار برٹش کانسل مقیم جدہ کا نائب جو مکہ مکرمہ میں رہتا تھا مداخلت کرتا رہا۔ چنانچہ مولانا موصوف لکھتے ہیں۔

"مکہ مکرمہ میں برٹش کانسل مقیم جدہ کا اسسٹنٹ ایک مسلمان رہتا ہے۔ اس نے مولانا ممدوح اور آپ کے رفیقوں کو جب وہ

۳۴۸

مکہ پہنچتے ہی ان سے ملے تھے اور اس کو انگریزی چٹھیاں دکھائیں اور مخالفین کی تجویزات مخالفانہ سے (اطلاع دی) یہ ہدایت کر دی تھی کہ آپ اطمینان سے اپنے شعائر مذہبی ادا کریں اور کسی سے کوئی تعلق نہ رکھیں اور جب کوئی باز پرس کی نو بہت آئے تو مجھے فوراً مطلع کریں۔ اور اگر طلبی ہو تو بلا توقف پاشاکے ہاں چلے جائیں۔

۲۲ ذی الحجہ قریب دو ہر کے جب پاشاکے یہاں پہونچے تو نائب مذکور نے اپنے وکیل کو پاشاکے پاس بھیج کر دریافت کیا کہ برٹش گورنمنٹ کی رعایا کو آپ نے کیوں عدالت میں طلب کیا ہے؟ پاشا مکہ نے جواب دیا کہ لوگوں نے ان کی نسبت اس قسم کی شکایتیں کی ہیں۔ نائب کانسل کے وکیل نے کہا جن امور کی نسبت وہ شکایت کرتے ہیں ان امور کے متکب یہ اس حدود میں نہیں ہوئے اس لئے اس سلطنت کا مواخذہ ناجائز ہے۔

لے اس جواب کا یہ مطالب نہیں ہے کہ یہ بیتمہ الزامات صحیح ہیں۔ بلکہ نائب کانسل کے وکیل نے اپنی جث کو مخفیہ طور پر ختم کرنے کیلئے بطور مفروضہ کہ یہ جواب دیا تھا۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ بالفرض اگر یہ الزامات صحیح بھی ہوں تو یہ آپ کی رعایا نہیں ہیں۔ اور نہ ان امور کا ارتکاب آپ کی حکومت کے حدود میں ہوا ہے۔ اسلئے آپ کو ان پر مواخذہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ورنہ الزامات کی بابت میا نصیب کا بیان گزر چکا کہ یہ سب جھوٹ اور افترا ہیں ۱۲ منہ

یہ سنکر پاشا نے آپ کو رخصت کر دیا۔ یہ آنا اور جانا، سوال و جواب سب کچھ تقریباً ایک گھنٹہ میں ہو گیا۔

مخالفین کو یہ ناکامی بڑی شاق گذری۔ انھوں نے پھر ایک آخری کوشش کی ساڑھے تین سو گواہ تیار کر کے پاشا کے سامنے اظہار دلویا۔ اسی دن شام کے وقت پھر آپ کو مع ان سابق رفیقوں کے طلب کرایا نائب کانسل کو معلوم ہوا تو خود حرم میں چلا آیا اور اپنے وکیل کو پاشا کے پاس بھیجا۔ پھر اسی طرح سوال و جواب ہونے لگے۔ آخر میں پاشا کی طرف سے جواب ملا کہ ہم نے ان کو حفاظت کیلئے اور مصلحتاً و احتیاطاً اپنے پاس رکھنا چاہا ہے۔ اگر ہم ان کو اس وقت بلا تحقیقات کے چھوڑ دیں گے تو کثرت و خون ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ان کے صدا دشمن جو اس وقت جوش میں ہیں ان کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ یہ سنکر نائب کانسل اور اس کے وکیل نے مولانا ممدوح سے کہہ دیا کہ یہاں کسی آئین و قانون کی پابندی نہیں ہے۔ اور ہم اس سے زیادہ پاشا کو کچھ کہہ نہیں سکتے۔ آپ دیوان میں حاضر ہو جائیں اور اس کی رپورٹ اپنے افسر برٹش کانسل مقیم جدہ کو کر دیں۔ (ملخص از ص ۲۹۹ تا ص ۳۰۱)

غالباً اسی کے بعد میاں صاحب کی گرفتاری عمل میں آئی اور بقول مولانا آزاد ایک نہایت ہی تنگ و تنار ایک محبس میں قید کر دیئے گئے جب برطانوی قونصل مقیم جدہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے اس کا ردوائی پر اعتراض کیا۔ اسی کی مداخلت سے نو دن کے بعد ایک تحریر پر دستخط

لے کر رہا کیے گئے۔

ان تانہنجی واقعات کے سامنے آج نے کے بعد کیا شک باقی رہ جاتا ہے، اسیات میں کہ جدہ کے برطانوی قونصل کے نام میاں صاحب نے جو چٹھیاں حاصل کی تھیں، وہ ان کی عاقبت اندیشی اور فراست ایمانی کی دلیل ہے۔ ظاہری اسباب کی رو سے بلاشبہ ان چٹھیوں نے میاں صاحب کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا۔ ان چٹھیوں ہی کا دباؤ تھا کہ برطانوی قونصل چونکنا رہا۔ اور بار بار مداخلت کی۔ جسکی وجہ سے نہ پاشا بلکہ کو کسی خطرناک اقدام کی جرأت ہوئی اور نہ وہاں کے عوام کو۔ اگر ان چٹھیوں کا دباؤ نہ ہوتا تو بظاہر ہمارے عمار کرام کی گہری سازشوں اور خفیہ کارروائیوں کی بدولت میاں صاحب کی جان عزیز بچنے کی توقع نہ تھی۔ مگر اللہ نے ایسے اسباب پیدا کر دیے جن سے یہ خطرہ پیش نہ آیا۔ سچ ہے۔ ع۔

دشمن چہ کند چوں مہرباں باشد دوست۔

میاں صاحب کی بابت غلط بیانیوں اور مولانا آزاد کے بیان میں میاں صاحب کی جس تحریر کا ذکر آیا ہے اس کے متعلق مخالفین نے ہندوستان میں غلط خبریں بھیجیں اور اس طرح میاں صاحب کی پوزیشن خراب کرنے کی کوشش کی۔ مولانا آزاد نے بڑی صفائی سے اس کا جواب دیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کا حالہ

میں اپنے والد مرحوم کی بھی رعایت نہیں کی ہے، فرماتے ہیں: ”یہ بات بالکل واضح ہے کہ مولانا نذیر حسین مرحوم نے اس تحریر میں ان اصولوں کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ہے، جو اہلحدیث کے اصول سمجھے جاتے ہیں۔ نہ تقلید شخصی کے وجوب کو مانا ہے نہ کتب حدیث پر کتب فقہ کی ترجیح کو۔ صرف برائت و اظہار ہے تاہم یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان کے مخالفین نے ملے اس بات کی خبریں بھیج دیں کہ انھوں نے نہایت سے توبہ کر لی! لطف کی بات یہ ہے کہ خود والد مرحوم باوجود ان تمام تفصیلات کے بیان کرنے کے کہا کرتے تھے۔ مولانا نذیر حسین نے توبہ کر لی، اور زور دیتے تھے کہ انھوں نے تقلید شخصی کو مستحسن تسلیم کر لیا۔ حالانکہ یہ جماعت بھی عوام کھیلے ہمیشہ تقلید کو ضروری بلکہ فرض ٹھہراتی ہے۔ بحث تو صرف التزام و تعین میں ہے۔ نہ کہ نفس تقلید میں“

اے حضرت میاں صاحب قدس سرہ نے ”معیار الحق“ میں مسئلہ تقلید پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ مناسبت معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اس کا کچھ خلاصہ پیش کر دیا جائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ مولانا آزاد نے جو بات کہی ہے اسکی تائید خود میاں صاحب کے کلام میں بھی موجود ہے۔ عالم بالقرآن والحدیث کھیلے تقلید جائز ہے یا نہیں؟ اس پر بحث کرنے کے بعد میاں صاحب فرماتے ہیں: ۱۔ (باقی صفحہ ۳۵۲)

اس سلسلہ میں مولانا آزاد نے یہ بھی فرمایا ہے کہ :-
 "ایک اور پہلو بھی اس واقعہ میں قابل ذکر یہ ہے کہ جس طرح اس طرف
 سے غلط بیانی کی گئی، اسی طرح مولانا ندیر حسین مرحوم کے طرفداروں
 اور نادان معتقدوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ گرفتاری ان کے لئے موجب
 توہین ہے، اس کے واقعہ ہونے ہی سے انکار کر دیا اور کہنا شروع
 کر دیا کہ یہ خبریں محض غلط ہیں، حالانکہ مولانا ندیر حسین مرحوم کا گرفتار
 ہونا، ایک ایسے مرکز میں جیسا مکہ ہے، نہ صرف موجب توہین نہیں

بقیہ حاشیہ ص ۳۵۱ کا "باقی رہی تقلید وقت لاطلمی، سو یہ چار قسم ہے۔ قسم اول واجب
 ہے اور وہ مطلق تقلید ہے، اہل سنت کے مجتہدین میں سے کسی مجتہد کی لاعلیٰ التبعین (۱)
 شاہ ولی اللہ صاحب نے عقد الجید میں اسکی علامت یہ لکھی ہے کہ مقلد کا عمل مجتہد کے قول
 پر سنت کی موافقت کے ساتھ مشروط ہو۔ یعنی اگر وہ قول سنت کے موافق ہوگا تو عمل کروں
 گا اور جب معلوم ہو جائے گا کہ سنت کے خلاف ہے تو اسکو پھینک دوں گا۔ قسم ثانی مباح ہے
 اور وہ کسی مذہب معین کی تقلید ہے بشرطیکہ مقلد اس تعین کو امر شرعی نہ سمجھے، اس تقلید
 کی علامت یہ ہے کہ اگر دوسرے مذہب کے کسی مسئلہ پر عمل کر کے تو اس سے انکار نہ کرے
 اور کسی دوسرے عمل کرنے والے کو برا نہ جانے اور اس پر نکیر نہ کرے۔ قسم ثالث حرام و بدعت
 ہے۔ اور وہ تقلید ہے بطور تعین کے یعنی تعین کو واجب اور لازم سمجھے۔ قسم رابع
 شرک ہے اور وہ ایسی تقلید ہے کہ لاطلمی کے وقت مقلد نے ایک مجتہد کی اتباع کی پھر
 اسکو اس مجتہد کے مذہب کے خلاف ایک ایسی حدیث معلوم ہوئی جو صحیح غیر منسوخ ہے اور کسی دوسری
 حدیث کے معارض بھی نہیں ہے، مگر وہ اس حدیث کو قبول نہیں کرتا (خص از ص ۴۲) منہ

۳۵۳

ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی عیسائی مذہب کے متعلق بہت وسیع اور گہری معلومات رکھتے تھے۔ انہی ڈاکٹر صاحب کی رفاقت میں مولوی رحمت اللہ صاحب کو بھی عیسائیت پر کافی عبور حاصل ہو گیا تھا۔ پادریوں سے بعض اہم مناظرے کئے اور ان کے رد میں کتابیں لکھیں۔ سید سلیمان صاحب ندوی لکھتے ہیں:-

”..... اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا وجود تو رومی عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں اور کون باور کر سکتا تھا کہ اس وقت پادری فنڈ کے مقابلہ کیلئے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہو گا۔ جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل، اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہو گا جو عیسائیوں کو خود ان ہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا۔ اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ ملکر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑ کر دیکھا (دریا چہ حیات شبلی ص ۵۱)

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مولوی رحمت اللہ صاحب نے انقلابیوں کا ساتھ دیا تھا۔ اور انگریزوں سے جنگ کی تھی۔ جب اس جنگ میں ہندوستانیوں کو شکست ہو گئی اور انگریز غالب آ گئے تو انقلابیوں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ گرفتاری کے بعد ان کو طرح طرح کی ایذائیں اور سزائیں دی جانے لگیں۔ مولوی رحمت اللہ صاحب کی گرفتاری کا بھی حکم ہو گیا۔ مگر مولوی صاحب کسی طرح اپنی جان بچا کر ہندوستان سے نکل گئے اور مکہ معظمہ میں

جاکر پناہ گزین ہوئے ۔

مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی روایت ہے کہ :

” غدر کے زمانہ میں ایک مجذوب صاحب ثقلان بمون میں تھے جب مولوی رحمت اللہ صاحب کی گرفتاری کا حکم ہوا اور ان کا ارادہ ہجرت کا ہوا تو لوگوں نے کہا کہ مجذوب صاحب سے ذرا مشورہ لینا چاہیے چنانچہ ان کی خدمت میں گئے اور عرض کیا۔ انھوں نے فرمایا، رہ جاؤ کچھ نہیں ہوگا اس کے بعد مزید اطمینان کے لئے مولوی رحمت اللہ صاحب پھر ان کے پاس گئے، تب مجذوب صاحب فرمانے لگے ” چلا جا یہاں نہیں رہ سکتا ، فاضل ہو کر ایسی چھجھوری بات نہیں بھاتی “ اور اپنے والد صاحب کا نام لیکر کہا تین روپیہ ان کی طرف سے اور چھ روپیہ میری طرف سے مجھے ملتے رہیں گے ۔ پس مولوی رحمت اللہ صاحب نے بھی ہجرت کا قصد کر لیا اور اس تاریخ سے نو روپیہ ماہوار ان کو برابر ملائے ۔ اسیں کبھی فتور واقع نہیں ہوا ۔ مولوی ولایت حسین صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ! اگر مجذوب صاحب کے کہنے کے موافق مولوی رحمت اللہ صاحب ہندوستان میں رہ جاتے تو کچھ دارو گیر نہ ہوتی ؟ حضرت نے ارشاد فرمایا ہاں کوئی صورت برائت کی بجانب اللہ نکل آتی ۔

(تذکرۃ الرشید حصہ دوم ص ۲۷)

مولانا گنگوہی کی یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مولوی

رحمت اللہ پرا رقت بڑی دہشت اور ہیبت طاری تھی ۔ اسی لئے

مجنذب صاحب کی بات پر ان کو اطمینان نہیں ہوا۔ ورنہ یہ حضرات اپنے مسلک کے خاتقا ہی مولویوں کی ولایت اور ان کے ”کشف و کرامات“ پر جیسا عقیدہ رکھتے ہیں اس کے لحاظ سے تو یہ امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ اس ”کشف“ کے بعد بھی مولوی رحمت اللہ صاحب کو اپنی برائت کا یقین نہ ہوتا۔ اور وہ ہندوستان سے باہر نکل جانا ضروری سمجھتے۔ چنانچہ مولانا گنگوہی کو مجذب صاحب کی بات پر اطمینان ہو گیا تھا۔ اور انھوں نے فرمادیا تھا کہ اگر مولوی رحمت اللہ صاحب رہ جاتے تو کوئی صورت ان کی برائت کی منجانب اللہ نکل آتی۔

مولانا ابوالکلام صاحب آزاد مرحوم کا یہ بیان پہلے نقل ہو چکا ہے کہ (مولانا سید نذیر حسین صاحب کے سفر حج سے بہت پہلے)

”علمائے وہابیہ کی ایک بڑی جماعت حجاز کو دارالاسن سمجھکر ہندوستان سے ہجرت کر گئی تھی اور مکہ معظمہ میں مقیم تھی مگر ہندوستانی علماء، سقیمین مکہ نے ان کے خلاف فتنہ اٹھایا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ چند دنوں کے بعد اچانک اس جماعت کے کہیں آدمی گرفتار کر لئے گئے جن میں مولانا رحمت اللہ صاحب بھی تھے۔ لیکن یہ بعد کو رہا کر دیئے گئے۔ کیونکہ انھوں نے اپنی ضغیت کے بہت واضح دلائل پیش کر دیئے۔“

اس بیان سے مولانا رحمت اللہ صاحب کا مسلک واضح ہو جاتا ہے کہ وہ حنفی تھے، ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ”علمائے وہابیہ“

سے مولانا آزاد کی مراد علمائے اہلحدیث ہیں۔ اس کے بعد مولانا بٹالوی مرحوم کا بیان پڑھئے جس سے اندازہ ہوگا کہ موصوف ایسے حنفی تھے جن کے دل میں اہلحدیث اور ان کے مسلک کے خلاف عداوت اور کدورت بھری ہوئی تھی۔ مولانا بٹالوی لکھتے ہیں :-

”مولوی رحمت اللہ مذکور کو اگرچہ عیسائیوں کے رد و جواب میں باعانت ڈاکٹر وزیر خاں بڑا دخل رہا ہے مگر اسلامی علوم خصوصاً قرآن و حدیث میں اسکو چنداں مہارت نہیں ہے۔۔۔ اور اسی وجہ سے وہ بلا واسطہ تقلید سابقین، قرآن و حدیث پڑھنے پڑھانے اور اس پر عمل کرنے کو جائز نہیں سمجھتا۔ اور جو لوگ بلا واسطہ پچھلے علماء کے قرآن و حدیث پڑھیں یا اس پر عمل کریں ان کو وہ مکہ مکرمہ میں چین نہیں لینے دیتے۔“

”ایک بزرگ و شیخ محمد نامی (حرم محترم میں حدیث پڑھایا کرتے تھے اس نے ان کو حکماً اس سے ہٹا دیا۔ پھر وہ ایک مدت تک ایک حلوائی (عبداللہ نامی) کی دوکان کی ایک کوٹھری میں چھپ کر حدیث پڑھاتے رہے اسکو بھی اسنے جب مطلع ہوا بند کرادیا۔“

”ایک دفعہ حدیث کی ایک کتاب ”سفر السعادة“ تصنیف علامہ مجد الدین صاحب قاموس (مکہ میں آئی اور شائقین حدیث نے اسکی ترویج و اشاعت چاہی تو اسکو بھی اس نے جاری نہ

۳۵۸

ہونے دیا۔ خاکسار نے مکہ مکرمہ میں چار مہینے رہ کر اکثر ان حالات کو بحشم خود ملاحظہ کیا ہے۔ صرف سنی سنائی باتوں کو بیان نہیں کر دیا، (اشاعت السنۃ جلد ۶، ص ۲۸۹)

یہ سلوک تو عام شائقین حدیث بلکہ خود حدیث کے ساتھ تھا۔ اسی سلسلہ میں مولانا بیالوی نے میاں صاحب کے ساتھ مولوی رحمت اللہ صاحب کی خصوصی دشمنی کا تذکرہ بھی کیا ہے جسکو اس سے پہلے ہم نقل کر چکے ہیں۔

○ مخالف کمیٹی کے دوسرے ممتاز ممبر جن کا نام مولانا بیالوی نے بتایا ہے وہ ہیں حاجی امداد اللہ صاحب۔ حاجی موصوف کا مولد ونیشا مغربی، یوپی ضلع مظفر نگر کا مشہور قصبہ ”تھانہ بھون“ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے بھی ۱۹۵۷ء کے ہنگامے میں تھانہ بھون اور اطراف کے علاقوں میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا تھا۔ لیکن قسمتی سے جب شورش ناکام ہو گئی اور انگریزوں کے قدم پھر جم گئے تو باغیوں کی دار و گیر شروع ہوئی حاجی صاحب کی گرفتاری کی بھی پولیس نے کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ وہ چھپ کر پنجاب اور سندھ کے راستے سے کراچی چلے گئے اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی فرماتے ہیں۔

” حاجی امداد اللہ صاحب کا اصل نام امداد حسین تھا جسے مولانا اسحاق صاحب نے بدل کر امداد اللہ کر دیا۔ حاجی صاحب کی ذات مرجع خلافت

تھی اور آپ سے بے شمار اہل فن نے فیض پایا ان میں سے مشہور مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد، شیخ فیض الحسن بہار پوری اور دوسرے نامی گرامی علماء ہند ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں آپ معرکہ شمالی کے امیر تھے۔ اس کے بعد موصوت چھپ کر حجاز پہنچ گئے اور مکہ مکرمہ میں اقامت پذیر ہو گئے۔ حاجی امداد اللہ دیوبندی جماعت کے امیر تھے آپ نے ۱۳۱۷ھ میں انتقال فرمایا ۱۷

(شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک ص ۲۵۷)

حاجی صاحب کے مخصوص مسترشدین اور مشہور خلفاء میں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم بھی تھے۔ لیکن ان کی عقیدت مندی صرف خانقاہی تصوف اور بیعت طریقت تک محدود تھی۔ سیاسی نظریات میں مرید اور پیر میں توازن نہ تھا۔ مولانا اشرف علی صاحب انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کرنا اور انقلابی شورش و ہنگامہ برپا کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اس معاملہ میں وہ مولانا شیخ محمد تھانوی کے مسلک پر کاربند تھے۔ جو شاہ اسحاق صاحب کے شاگرد تھے اور ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے مخالف تھے اس کو "اسلامی جہاد" ہونے کا فتویٰ نہیں دیتے تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کا مندرجہ ذیل بیان پڑھئے۔

"شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں جن کے مسلک پر مولانا

علہ شاملی ایک مقام کا نام ہے جو اس زمانہ میں ضلع بہار پور سے متعلق تھا (نقش حیات)

اشرف علی صاحب تھانوی کا رہندہ ہیں اور شیخ الہند کی جماعت کی سیاست کو غلط ملتے ہیں۔ مولانا اشرف علی صاحب کے سوانح حیات جو شائع ہو چکے ہیں ان میں تصریح ہے کہ آپ مولانا شیخ محمد صاحب کے مسلک کے پیرو ہیں۔ مولانا شیخ محمد اور امیر امداد اللہ ایک ہی مرشد کے خلیفہ ہیں اور اسی مسئلہ جہاد پر آپس میں مخالف ہو گئے اور جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تو اب امیر امداد اللہ کی جانشینی کا استحقاق مولانا اشرف علی صاحب کو کس طرح پہنچ سکتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی خطرناک استاد ہی ہے، جو مولانا شیخ الہند اور ان کے اساتذہ کے خصوصی کاموں کا بیکار بنادینا چاہتی ہے (سیاسی تحریک ص ۲۷)۔

یہ سندھی صاحب کا اپنا تاثر ہے لیکن خود حاجی امداد اللہ صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی نظروں میں مولانا اشرف علی کی کیا وقعت تھی۔ اسکا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہو سکتا ہے:

”حضرت حاجی صاحب اور حضرت گنگوہی کو آپ سے بہت محبت تھی۔ ہر دو حضرات آپ کی بہت زیادہ رعایت فرماتے اور شفقت اور محبت کا برتاؤ بھی کرتے تھے حضرت گنگوہی تو پیر بھائی ہونے کی وجہ سے احترام بھی کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ (یعنی مولانا اشرف علی) گنگوہ تشریف لے گئے تو حضرت گنگوہی چار پائی سے نیچے اتر کر برابری میں بیٹھ گئے۔ بعض لوگوں نے

نہیں ہی کیا حضرت وہ تو اپنے آپ کو حضرت کا ایک مرید سمجھتے
ہیں تو حضرت گفتگو ہی نے فرمایا تم تو اندھے ہو گئے ہو میں تو اندھا
نہیں ہوں۔ اسی طرح حضرت حاجی صاحب سے اگر کوئی پوچھتا
تو فرماتے یہ میرا پوتا ہے۔ غرضیکہ ہر دو حضرات سے خصوصی اور
گہرے تعلقات تھے۔ سالہ ج میں آپ دینی مولانا اشرف علی
مہدی صاحب دویارہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور تقریباً چھ مہینہ
رہے۔ ان دنوں تمام کیا۔ اور ذکر و فکر میں مشغول رہے اس قیام میں
حضرت حاجی صاحب نے مخصوص توجہات سے لوازالہ اور غالباً
اسی قیام میں آپ کو اجازت بیعت بھی مرحمت فرمائی کہ
(تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۲۷۷)

یہیں ہے اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ میاں صاحب کے ساتھ
اولاد صاحب وغیرہ کی دشمنی اور ان کی ایذا رسانی کا سبب یہ تھا کہ
میاں صاحب نے غدر ۱۳۵۷ء میں شرکت نہیں کی تھی۔ اور وہ لکھنؤ
حکومت کے خلاف جہاد کرنے کا فتویٰ نہیں دیتے تھے۔ اس لئے کہ
لکھنؤ سبب ہوتا تو مولانا شیخ محمد تھانوی اور مولانا اشرف علی کے ساتھ
بجائے ہی سلوک ہونا چاہیے تھا۔ اور اگر اتنا نہیں تو کم از کم اتنا تو ہوتا
کہ ان کے ساتھ احترام اور شفقت و محبت کا برتاؤ نہ ہوتا؟ مگر
ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ میاں صاحب
کا کہنا "قصور" دراصل کوئی ناقابل معافی "قصور" نہ تھا۔ بلکہ

۳۶۲

یہ قصور یہ جو کچھ تھا وہ یہ کہ عہد نبوی کے چار سو برس بعد کی نکالی ہوئی تقلید کو شرعاً واجب کیوں نہیں کہتے۔ اور اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں پر براہ راست عمل کرنے کا شوق اور جذبہ کیوں رکھتے ہیں۔ ع

نکروہ اند مجنوں پاس حق گناہ دگر

○۔ میاں صاحب کے خلاف مکہ معظمہ کی سازشوں میں حصہ لینے والے تیسرے ممتاز ممبر مولوی عبدالقادر صاحب بدایونی ہیں یہ اہل بدعت کے مشہور عالم مولوی فضل رسول بدایونی کے صاحبزادے ہیں۔ حج ادا کرنے کی نیت سے مکہ معظمہ گئے تھے۔ وہاں شیخ جمال عمر مکی حنفی سے حدیث پڑھی اور سچہ حاصل کی۔ چند رسائل کے مصنف بھی ہیں۔ ایک رسالہ فارسی زبان میں میلاد اور قیام کے ثبوت میں بھی لکھا ہے جس کا نام ہے ”سیف الاسلام السلول علی المناع بعمل المولد والقیام للرسول“ ان کے حالات میں لکھا ہے۔

یہ اکثر کتب درسیہ پیش مولوی نور احمد اکثر درسی کتابیں مولوی نور احمد بدایونی و بعض کتب ہم چوتھو مرحوم سلم العلماء بدایونی سے پڑھیں۔ اور بعض کتابیں و شرح اشارات و محاکمات وغیرہ بخدومت جیسے شرح سلم العلماء اور شرح اشعار مولانا فضل حق خیر آبادی گذرانیدہ مشار اور محاکمات وغیرہ مولانا فضل حق الہیہ بن الاقران گشت ویشرف بیعت خیر آبادی کے سامنے گذار کر اپنے ہم و خلافت از والد خود سعادت اندوز زمانہ لوگوں میں شہرت پائی اپنے والد

گرویدو بایمانے والد خود منہ گام سے بیعت اور خلافت کی سعادت
 زیارت حرمین شریفین زاد ہما اللہ حاصل کی اور جب حرمین شریفین کی
 تشریف ابجد مرت شیخ الفقہار زیارت کیلئے تشریف لیگے تو اپنے
 والمحدثین مولانا شیخ جمال عمر مسکی اخذ والد کے مشورہ کے مطابق وہاں
 حدیث فرمودہ با فادہ علوم دینی شیخ جمال عمر مسکی سے حدیث پڑھی
 و تالیف کتب دینیہ می پردازند اب دینی علوم کے فادہ اور مذہبی کتابوں
 کی تالیف میں مشغول ہیں۔

(تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۷)

موصوف کے ذہن و فکر پر کس باپ کی تربیت کا اثر پڑا تھا، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہم اس موقع پر مولانا آزاد کے تذکرہ کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں :-

”مولوی فضل رسول بدایونی مرحوم سوط الرحمان میں لکھتے ہیں
 ”داؤد ظاہری شیطان کا متبع تھا اس کے بعد ابن حزم ظاہری
 پیدا ہوا۔ جو خبیث تھا، پھر ابن حزم کا شاگرد ابن قیم ہوا اور
 ابن قیم کا شاگرد شقی ابن تیمیہ، ابن تیمیہ نے ایک نیا دین نکالا
 بعض اشرار بد اطوار، جہل، فسقار و حلقہ انقیادش آندہ در بلاد
 اسلامیہ طرفہ ہنگامہ برپا نمودند“ اور ان تمام مورخانہ تحقیقات
 کیلئے آخر میں طبقات سبکی کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔

کجا ابن حزم اور کجا ابن قیم بینہما مفاد ز تنقطع فیہما

۳۶۲

اعناق المظی، پھر لطف یہ کہ ابن تیمیہ ابن قیم کے شاگرد تھے
اور ابن تیمیہ کے ساتھی صرف اشرار و جہلاء تھے۔ اللہ تعالیٰ
ہم سب کی کوتاہیاں معاف فرمائے اور جو گزر چکے ہیں ان
کی مغفرت ۱۱ (حاشیہ تذکرہ ص ۲۵)

یہ ہیں وہ فضل رسول بدایونی جن کے بیٹے تھے عبدالقادر بدایونی، ایسے
صاحب فکر و نظر، خوش عقیدہ و خوش گفتار، محقق باپ کی گود میں پرورش
پانے والے فرزند، اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے، ان کی خلافت
اور جانشینی کی سعادت حاصل کرنے والے مرید سے کیا بعید ہے کہ وہ
میاں صاحب جیسے متبع کتاب و سنت اور محبوب ابن تیمیہ و ابن قیم،
مکرم داؤد و ابن حزم کے خلافت ریشہ و انیوں اور ان کی ایذا رسانیوں
میں حصہ لے۔ جب حاجی امداد اللہ صاحب جیسے صاحب طریقت و
ارشاد اس فتنہ سے نہ بچ سکے، تو کسی بریلوی اور بدایونی عالم کا کیا کہنا؟
ان کا توبہ و آدم ہی نرالا ہے۔

○ اس کمیٹی کے چوتھے ممتاز ممبر مولوی خیر اللہ بن صاحب
تھے۔ یہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے والد ہیں۔ ان کے تفصیلی
حالات آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی کتاب میں موجود ہیں۔
اسی کتاب سے ہم ان کے کچھ ابتدائی حالات اور اس کے بعد بعض وہ
واقعات جن سے ان کے مسلک پر روشنی پڑتی ہے، تلخیص و اختصار
کے ساتھ یہاں نقل کر دیتے ہیں۔

مولانا خیر الدین ^{۸۳}ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والدین کا
صغیر سنی ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے پرورش انچے نانا مولانا منور الدین
کے یہاں ہوئی۔ مولانا منور الدین حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ کے
شاگرد اور مولانا اسماعیل شہید کے ہم درس تھے۔ شاہ عبدالعزیز ^{جسٹا}
کے انتقال کے بعد مولانا اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان اور جلال العینین
لکھی اور ان کے اس مسلک کا ملک میں چرچا ہوا تو تمام علماء میں ہلچل مٹ
گئی۔ ان کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی بلکہ سربراہی مولانا
منور الدین نے دکھائی۔ مولانا شہید کے ساتھ ان کا مناظرہ بھی ہوا۔
..... غدر سے پہلے علماء دہلی کا یہ حال تھا کہ ہندوستان کی حالت اور
بربادیاں دیکھ کر عموماً یہاں کے قیام سے برداشتہ خاطر ہو گئے تھے اور
ایک ایک گھر کے یہاں پھرانے ہونے لگے تھے۔ عام طور پر ہر سال
بڑی بڑی جماعتیں جایا کرتی تھیں جو قافلے کے نام سے مشہور تھیں۔
ایک بڑا قافلہ شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب کا تھا جو دہلی سے مکہ معظمہ
ہجرت کر گیا تھا۔ ان کے بعد مولانا منور الدین بھی ہندوستان سے
برداشتہ خاطر ہو گئے اور ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ انہی کے ساتھ
میں مولانا خیر الدین بھی تھے۔ ان لوگوں کے مکہ معظمہ پہنچ جانے کے پانچ
برس کے بعد ہندوستان میں ^{۸۵}ء کا غدر رہا تھا۔ اور اسی سال مولانا
منور الدین کا مکہ میں انتقال ہو گیا۔ مولانا خیر الدین نے ہندوستان
میں قیام کے دوران ہی میں اپنے نانا اور دوسرے مشہور اساتذہ سے

علوم کی تحصیل کر لی تھی۔ لیکن مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد حرمین کے علماء سے بھی استفادہ کیا۔ قیام حجاز کے تقریباً دس برس بعد انھوں نے شادی کی مکہ میں کچھ عرصہ وہ وہاں کے اساتذہ سے مزید تکمیل و اخذ فیض میں مشغول رہے، پھر حرم میں خود اپنی مجلس درس قائم کی۔ اور اپنے نانا ہی کے زندگی میں شریف مکہ اور تمام اعیان حجاز سے رسم و راہ پیدا کر لی تھی کچھ عرصہ کے بعد اچانک ایک حادثہ پیش آگیا جس میں یہ گر پڑے اور بائیں ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس وقت مکہ میں ڈاکٹری علاج کا عمدہ انتظام نہ تھا۔ جس ڈاکٹر نے ہڈی جوڑی تھی اسکی بندش ٹھیک نہ ہوئی نتیجہ یہ نکلا کہ سخت تکلیف پیدا ہو گئی۔ مجبوراً علاج کیلئے ہندوستان آنا پڑا۔ چنانچہ حسب عادت مع اہل و عیال کے کلکتہ آ گئے اور یہاں علاج کرایا۔ جس سال وہ کلکتہ پہنچے تھے اسی سال ان کی اہلیہ مولانا آزاد کی والدہ) کا یہیں انتقال ہو گیا۔ اس حادثہ سے مولانا خیر الدین اس درجہ برداشتہ خاطر ہوئے کہ باوجود اسکے کہ علاج ابھی مکمل نہ ہوا تھا، فوراً مکہ کا قصد کر لیا۔ مگر حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ سال بھر تک مہلت نہ ملی۔ بہزار وقت دوسرے سال ملے گئے۔ لیکن اب کی دفعہ زیادہ دنوں تک وہاں قیام نہ ہو سکا۔ پھر کلکتہ واپس آ گئے اور ۱۹۰۶ء میں یہیں انتقال کیا۔ ”وہابیوں“ کے متعلق اپنے والد کے تعصب کا حال مولانا آزاد نے بایں الفاظ بیان کیا ہے۔

”ابتداء ہی سے ان کی طبیعت میں ”وہابیوں“ کے متعلق سخت

تعصب قائم ہو گیا تھا اور یہ آخر تک بڑھتا ہی گیا۔ اس بارے میں ان کی طبیعت کا کچھ عجیب حال تھا۔ ہر طرح کی رسوم، ہر طرح کی بدعات، جو سخت سے سخت آخری درجہ کی کہی جاسکتی ہیں۔ ان سب کی وہ توجہ نہیں کرتے تھے۔ اور کسی کو بھی قابل رد اور قابل اعتراض نہ قرار دیتے تھے اور اگر کوئی ذرا سا بھی ان پر اعتراض کرے، تو اسکو وہابیوں کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ بعد کو میں نے دیکھا تو اس بارے میں مقلدین حنفیہ کے جو مختلف حلقے نظر آتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ تنگ حلقہ ان کے مشرب کا تھا۔ اور ہندوستان کے گذشتہ علماء میں صرف مولوی فضل سہیل بدایونی، جنہوں نے تقویۃ الایمان کے رد میں سوط الرحمن لکھی ہے، ٹھیک اسی رنگ پر تھے، جو اس بارے میں والد مرحوم کا تھا۔ ان کے علاوہ ہندوستان کا کوئی سخت سے سخت حنفی بھی معیار حنفیت پر نہیں اتر سکتا تھا۔ جن لوگوں نے اپنی زندگیاں تقلید کی حمایت اور حنفیت کی نصرت میں بسر کر دیں، وہ بھی بعض شدید بدعات و رسوم کی مخالفت کی وجہ سے ان کے نزدیک وہابی تھے۔“

انہوں نے وہابیوں کو دو اصولی قسموں میں بانٹ دیا تھا۔ کہتے تھے دو فرقے ہیں، ایک اسماعیلیہ، دوسرا اسحاقیہ، اسماعیلیہ سے مقصود وہ فرقہ تھا جو بدعات و رسوم کی مخالفت کے ساتھ تقلید شخصی کا بھی تارک ہو، جیسا کہ مولانا اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان اور خط العینین وغیرہ میں لکھا ہے۔ اسحاقیہ سے مقصود وہ فرقہ ہے جو حنفیت و تقلید سے

تو انکار نہیں کرتا، لیکن بدعات و رسوم کا مخالف ہے۔ اسکی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ شاہ محمد اسحاق نے مائتہ مسائل میں بدعات و رسوم سے اختلاف کیا ہے، مگر تقلید و حنفیت کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ہے وہ کہتے تھے کہ جب اسماعیلیہ غیر مقبول ہو گئی تو وہاں بیت نے اپنے مکائد کی اشاعت کے لئے راہ تقیہ اختیار کی اور حنفیت کی اڑت قائم کمر کے اپنے دیگر عقائد کی اشاعت کرنے لگے، جہاں تک مجھے خیال ہے وہ وہابیوں کے کفر پر وثوق کے ساتھ یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے بارہا فتویٰ دیا کہ وہابیہ یا وہابی کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔

کسی حنفی کے لئے کسوٹی یہ تھی کہ اس سے سید احمد صاحب بریلوی، مولانا اسماعیل شہید، مولانا اسحاق، اور تقویۃ الایمان، صراط مستقیم مائتہ مسائل، اربعین کی نسبت سوال کرتے۔ اگر وہ شخص ”بدعتی“ سے ان بزرگوں اور کتابوں کے خلاف عقیدہ ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامل کرتا تو بس یہ وہابیت کا قطعی ثبوت ہوتا۔ علاوہ بریں بعض اور جزئیات جن پر ان کو اصرار تھا۔ ان کے انکار کو بھی وہابیت قرار دیتے تھے۔ غالباً اسلئے کی بات ہے کہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی ان سے ملنے کیلئے کلکتہ آئے، جن سے ان کے برابر تعلقات رہے تھے۔ اور بارہا ہم لوگوں سے کہا تھا کہ یہ شخص بلاشبہ صحیح الاعتقاد ہے۔ لیکن بدعتی تھے وہ اپنے ساتھ بعض اپنی تصانیف لائے، اور چونکہ شیخ احمد دحلان والد کے خاص دوست تھے، اس لئے انھوں نے خاص طور پر اپنا

ایک رسالہ دیا جو ان کے رد میں لکھا تھا۔ اور اس میں عدم ایمان البوین
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان ابو طالب پر زور دیا تھا چنانچہ
اس پر کچھ دیر تک والد نے ان کا ایسا تعاقب کیا کہ آخر وہ ہر کارہ
گئے اور خاموش چلے گئے۔ جانے کے بعد ہم سے کہا کہ اس شخص کے
عقیدے میں بھی فتور ہے۔

البتہ علماءِ حال میں مولانا عبد القادر بدایونی کی تعریف کرتے
تھے اور ان کی حنفیت پر معترض نہ تھے۔ جس زمانہ میں مولوی ظہیر
شوق مرحوم سے اردو شاعری میں، یں اصلاح لیتا تھا، اور اس تعلق
سے ان سے واقفیت ہوئی تھی۔ ان کی ایک دو کتابیں میں نے والد کو
سنائیں جو تقلید و حنفیت کے اثبات میں تھیں۔ اور بڑے ہی غلو کے ساتھ
لکھی گئی تھیں مثلاً جبل المتین میں آمین بالجہر کے جواز ہی سے انکار کیا
گیا ہے۔ لیکن وہ بھی ان کے معیار پر ٹھیک نہ اترے۔ شوق مرحوم اس
زمانے میں آثار السنن لکھ رہے تھے اور اسکے لئے مالی اعانت کے طلبگار
تھے۔ میری تحریک سے کلکتہ آئے اور والد مرحوم سے ملے۔ لیکن انھوں نے
جب ان سے معیار حنفیت کے سوالات کئے اور وہ ساکت رہ گئے تو انھوں
نے رائے قائم کر لی کہ ان کی حنفیت بھی مشتبہ ہے۔ تاہم یہ عجیب بات
تھی کہا وجود اس درجہ تشدد اور دہا بیوں سے نفرت کے طبیعت میں قدیم
سوسائٹی کی وضع داری اور مہمان نوازی کا جذبہ اتنا قوی تھا کہ کوئی ہو،
خواہ مولانا اسماعیل شہید ہی ان کے مہمان کیوں نہ ہو جاتے، لیکن کفر کے

ایک رسالہ دیا جو ان کے رد میں لکھا تھا۔ اور اسمیں عدم ایمان البوین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان ابو طالب پر زور دیا تھا چنانچہ اس پر کچھ دیر تک والد نے ان کا ایسا تعاقب کیا کہ آخر وہ ہکا بکارہ گئے اور خاموش چلے گئے۔ جانے کے بعد ہم سے کہا کہ اس شخص کے عقیدے میں بھی فتور ہے۔

البتہ علماءِ حال میں مولانا عبد القادر بدایونی کی تعریف کرتے تھے اور ان کی حنفیت پر معترض نہ تھے۔ جس زمانہ میں مولوی ظہیر الحسن شوق مرحوم سے اردو شاعری میں، یس اصلاح لیتا تھا، اور اس تعلق سے ان سے واقفیت ہوئی تھی۔ ان کی ایک دو کتابیں میں نے والد کو سنائیں جو تقلید و حنفیت کے اثبات میں تھیں۔ اور بڑے ہی غلو کے ساتھ لکھی گئی تھیں مثلاً حبل المتین میں آمین بالجہر کے جواز ہی سے انکار کیا گیا ہے۔ لیکن وہ بھی ان کے معیار پر ٹھیک نہ اترے۔ شوق مرحوم اس زمانے میں آثار السنن لکھ رہے تھے اور اسکے لئے مالی اعانت کے طلبگار تھے۔ میری تحریک سے کلکتہ آئے اور والد مرحوم سے ملے۔ لیکن انھوں نے جب ان سے معیار حنفیت کے سوالات کئے اور وہ ساکت رہ گئے تو انھوں نے رائے قائم کر لی کہ ان کی حنفیت بھی مشتبہ ہے۔ تاہم یہ عجیب بات تھی کہاں جو اس درجہ تشدد اور دواہابیوں سے نفرت کے طبیعت میں قدیم سوسائٹی کی وضع داری اور مہمان نوازی کا جذبہ اتنا قوی تھا کہ کوئی ہو، خواہ مولانا اسماعیل شہید ہی ان کے مہمان کیوں نہ ہو جاتے، لیکن کفر کے

۳۷۰

فتوے کے ساتھ ان کی خاطر داری اور خدمت بھی کرتے تھے، مولوی ظہیر الحسن سے وہ خوش نہ ہوئے، تاہم چلتے وقت ان کو پانچ سو روپے دیئے تاکہ آثار السنن کا پہلا حصہ شائع کریں۔ اسمیں تین سو انھوں نے اپنے پاس سے دیئے تھے۔ اور دو سو اپنے ایک معتقد سے دلائے تھے۔“

(صلحاً تا صلحاً ۱۶۷)

”وہابیوں کے ساتھ ان کی اس شدید نفرت و عداوت کے اسباب کیا تھے؟ مولانا آزاد نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے چنانچہ فرماتے ہیں: ”اسلام کے اندرونی فرقوں میں انھیں جس قدر کاوش تھی وہ صرف وہابیوں سے تھی، اور اس کا سبب وہ صحبت ہے جس میں غدر سے پہلے ان کا ابتدائی وقت صرف ہوا تھا۔ اتفاق سے ان کے اساتذہ بھی وہی تھے، جنھیں اس بارے میں بہت تشدد تھا، ان کے ہمدرس بھی وہی لوگ تھے جو آگے چل کر اس بارے میں بہت سخت ثابت ہوئے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ اپنی تمام خاندانی باتوں میں اپنے جدِ مرحوم سے فیض یاب ہوئے تھے۔ اور مولانا اسماعیل شہید اور مولانا عبداللہ مرحوم سے رنج کی وجہ سے ان کا بھی بڑا وقت وہابیوں کی مخالفت ہی میں صرف ہوا۔ مکہ گئے اور وہاں بھی اس وقت سے بڑا چرچا ہی تھا۔ نجدیوں کا حملہ ابھی پرانا نہیں ہوا تھا اور بہت سے پولیٹیکل اسباب بھی ایسے تھے جن کی وجہ سے عرب و ترک دونوں وہابیوں سے سخت تعرض و نفرت رکھتے تھے۔ ان اسباب سے روز

بروز والد مرحوم کے اندر بھی یہ جذبہ قوی ہوتا گیا، اور بالآخر ان کی تقریر و
تحریر کا سب سے بڑا موضوع بن گیا۔ شیخ احمد دحلان نے "الرد علی
الوہابیین" لکھی، وہ بھی فی الحقیقت والد مرحوم کے خیالات کا عکس ہے۔
(صفحہ ۱)

یہی وہ چار حضرات ہیں جن کے متعلق مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم نے یہیں بتایا
ہے کہ یہ اس کمیٹی کے نمایاں ممبران تھے جس نے حرم پاک میں بھی حضرت میاں
صاحب قدس سرہ کو چین نہ لینے دیا۔ اور جو مکہ معظمہ جیسے دارالامین
میں بھی دن رات ایسی سازشوں اور تدبیروں میں مصروف تھی جن کے ذریعہ
وقت کے ایک بہت بڑے محدث کو قتل کرنے یا جس دوام میں پھنسنے
کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔

ان حضرات کے اس مختصر تعارف سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا
کہ یہ کمیٹی دیوبندی اور بریلوی دونوں ہی مکتب خیال کے علماء و مشائخ کی
مشترکہ کمیٹی تھی۔ گویا اہل حدیث کے خلاف وہاں ایک "مستحدہ محاذ"
بنایا گیا تھا۔

معرکہ شاملی

کی حقیقت

پچھلے صفحات پر حاجی امداد اللہ صاحب مرحوم کے مختصر تعارف کے سلسلہ میں ”معرکہ شاملی“ کا ذکر آیا ہے۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر کچھ اسکی تفصیلات پیش کریں۔

اس میں تو مورخین کا اختلاف نہیں ہے کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جو انقلابی شورش برپا ہوئی تھی اسی ہنگامے کے زمانے میں یہ جنگ بھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے بیان میں اختلاف ہے کہ یہ جنگ انگریز کی فوج سے ہوئی تھی؟ یا خود انقلابیوں کے ساتھ ہوئی تھی؟ اور اسکے اسباب و محرکات کیا تھے؟ اس میں حصہ لینے والے دیوبندی علماء، انگریز کے مخالف تھے، یا اسکے خواہ اور فرمانبردار تھے؟

اس کے متعلق سب سے پہلے مولانا حسین احمد صاحب پہلا بیان مدنی کا بیان پڑھئے۔ مولانا مدنی لکھتے ہیں:-

”جب انقلاب ۱۸۵۷ء کی تحریک اطراف و جوانب ہندو خصوصاً اطراف دہلی میں چلنی شروع ہوئی تو ان حضرات کے جوش حریت میں نہی حرکت پیدا ہوئی، ان بزرگوں نے محسوس کیا کہ اس انقلاب

میں حصہ لینا فرض اور لازم ہے۔ انگریزوں کے افعال مافیہ اور احوال حاضرہ پر بخوبی مطلع تھے۔ اس تمام جماعت میں حضرت حافظ صاحب صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔ زیادہ پیش پیش تھے (حضرت حافظ صاحب قطب العالم میاں نجی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ کے اولین اور اعلیٰ ترین خلفاء میں سے تھے۔)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تحریک انقلاب میں حافظ صاحب کے ہم نوا و ضرورت تھے مگر پیش پیش اور اس قدر زیادہ جوش میں نہ تھے۔ اسی قصہ تھانہ بھون میں میاں جی صاحب کے تیسرے خلیفہ مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے چونکہ تینوں حضرات پر بھائی اور ایک ہی مقدس ہستی میاں جی صاحب کے در یوزہ گرتے اس لئے آپس میں میل جول اتحاد و اتفاق بڑے پیمانہ پر رہتا تھا۔ مگر مولانا شیخ محمد صاحب علوم عربیہ کے باقاعدہ فاضل تھے۔ علماء دہلی سے تمام نصاب علم ظاہر پڑھ چکے تھے۔ بخلاف حضرت حافظ صاحب اور حاجی صاحب کے کہ دونوں حضرات نے علوم عربیہ کی تکمیل نہیں کی تھی۔ اگرچہ نسبت باطنیہ میں بدبھا بڑھے ہوئے تھے۔ اس بنا پر مسائل شرعیہ میں ہر دو حضرات مولانا شیخ محمد صاحب ہی کا اتباع کرتے تھے۔ بد قسمتی سے مولانا کی رائے یہ ہی تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار، موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔

۳۴۴

اس اختلاف اور فتویٰ کی بنا پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب
 اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ان کے اوطان سے دونوں
 حضرات نے بلوایا۔۔۔ جب ہر دو حضرات در مولانا نانوتوی
 اور مولانا گنگوہی پہنچ گئے تو ایک اجتماع میں اس مسئلہ پر گفتگو
 ہوئی۔ حضرت نانوتویؒ نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد
 صاحب سے پوچھا چونکہ وہ چچا پیر تھے اس لئے ہمیشہ ان
 کا ادب کیا جاتا تھا کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین
 و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے؟ تو انہوں نے جواب
 دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے
 سروسامان ہیں۔ مولانا نانوتویؒ نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان
 نہیں ہے جتنا کہ غزوہ بدر میں تھا؟ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب
 مرحوم نے سکوت فرمایا۔ اس پر حافظ ضامن صاحب نے فرمایا
 کہ بس سمجھ میں آگیا اور پھر جہاد کی تیاری شروع ہو گئی اور اعلان
 کر دیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام مقرر کیا گیا
 اور حضرت مولانا نانوتویؒ کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا اور
 مولانا رشید مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو قاضی بنایا گیا
 اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب
 تنہا نوی کو میمنہ، میسرہ و رائیں بائیں کا افسر قرار دیا گیا۔ چونکہ
 اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے تقویٰ، علم،

تصوف، تشیع کا بہت زیادہ شہرہ تھا۔۔۔۔۔ لوگ ان پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے اسلئے بہت تھوڑی مدت میں جوق جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ اس وقت تک ہتھیاروں پر پابندی نہ تھی، عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار تھے۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ اور خانہ بھون اور اطراف میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی۔ اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیئے گئے۔ خبر آئی کہ توپخانہ سہارنپور سے شاہی کو بھیجا گیا ہے۔ ایک پلٹن لاری ہے، رات کو یہاں سے گزرے گی۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش ہوئی، کیونکہ جو ہتھیار ان مجاہدین کے پاس تھے وہ تلوار، جمدوق، توڑے والی، اور برچھے وغیرہ تھے، مگر توپ کسی کے پاس نہ تھی۔

توپ خانہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔
حضرت گنگوہی نے فرمایا فکر مت کرو۔

بڑک ایک باغ کے کنارے سے گذرتی تھی، حضرت مولانا رشید صاحب گنگوہی کو تیس یا چالیس مجاہدین پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے افسر مقرر کر دیا تھا۔ آپ اپنے تمام ماتحتوں کو لیکر باغ میں چھپ گئے اور سب کو حکم کیا کہ پہلے سے تیار رہو جب میں حکم کروں سب کے سب ایک دم فیر کرنا۔ چنانچہ جب پلٹن مع توپخانہ باغ کے سامنے سے گذری تو سب نے یک دم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر

آدمی یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ تو پوچھنا چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔
حضرت گنگوہیؒ نے تو پوچھنا کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کی مسجد
کے سامنے لا کر ڈال دیا۔

شامی اس زمانہ میں ہمرکزی مقام تھا۔ ضلع بہار پور سے متعلق
تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی۔ کچھ فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی۔ قرار
پایا کہ اس پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا
گیا۔ جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی وہ مغلوب ہو گئی
حضرت حافظ ضامن صاحب اسی ہنگامہ میں شہید ہو گئے
حضرت حافظ صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا
پڑ گیا ان کی شہادت سے پہلے روزانہ خبر آتی تھی کہ آج فلاں
مقام انگریزوں سے چھین لیا گیا۔ آج فلاں مقام پر ہندوستان یوں
کا قبضہ ہوا مگر حافظ صاحب مرحوم کی شہادت کے بعد پہلے پہل
خبر آئی کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور یہی حال ہر جگہ
کی خبروں کا تھا۔۔۔۔۔ لوگوں کی ہمتیں پست ہو گئیں اور سب
اپنے اپنے اوطان کو واپس آ گئے۔ اسی کے بعد قصبہ تھانہ بھون
انداس کے اطراف و جوانب کے وہ مقامات جن کی شرکایت
کسی دشمن نے کر دی برباد کر دیئے گئے دار و گیر پکڑ دھبہ کا بے پناہ
زمانہ آیا چاروں طرف تختیاں بچید و بے نہایت حتی درندوں
کی طرح عمل میں لائی جانے لگیں۔ پرانی دشمنیوں کو نکالنے کا لوگوں

کو موقع مل گیا۔ جس کو جس سے کوئی پُر خاش یا رنجش ہوتی انگریز افسر کے یہاں شکایت کر دیتا کہ یہ شخص بغاوت میں شریک تھا۔۔۔۔۔ (نقش حیات مسلم تامل) جب دار و گیر اور پکڑ دھر کا زمانہ آیا تو ان حضرات کے خلاف بھی مجبوروں نے شکایت کر دی۔ گرفتاری کا حکم ہو گیا۔ حاجی الداد صاحب تو خفیہ تادیبوں سے کام لے کر مکہ معظمہ چلے گئے۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ہندوستان ہی میں رہے۔ پولیس نے ان کا پیچھا کیا مگر مولانا نانوتوی تو گرفتار نہ ہو سکے۔ البتہ مولانا گنگوہی پکڑے گئے۔ لیکن نہ اپنے جرم کا اقرار کیا اور نہ کوئی موثر شہادت ملی اس لئے رہا ہو گئے۔

بہر حال مولانا مدنی کے بیان کا جو طویل اقتباس ہم نے اوپر نقل کیا ہے اس میں آپ نے پڑھ لیا کہ یہ حضرات انگریزی حکومت کے مخالف تھے۔ اس کے خلاف جہاد کرنا فرض جانتے تھے۔ لیکن ان حضرات کے ایک دوسرے عقیدت مند مولانا عاشق الہی میرٹھی مرحوم کا تاثر اور بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ مولانا گنگوہی کی بابت لکھتے ہیں:

حضرت مولانا کو یہ بات معلوم ہو چلی تھی کہ آپ

دوسرا بیان کا نام بھی مشتبہ اور قابل اخذ مجرموں کی فہرست میں درج ہو چکا ہے۔ اور آپ کی گرفتاری و تلاش میں دوش آیا چاہتی ہے مگر آپ کو ہ استقلال بنے ہوئے خدا کے حکم پر راضی تھے۔ اور سمجھے ہوئے تھے کہ میں جب حقیقت میں سرکار

کافر ماں بردار رہا ہوں۔ تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکانہ ہوگا۔ اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے اسے اختیار ہے جو چاہے کرے..... (تذکرۃ الرشید ص ۱۱)

دوسری جگہ ان سب حضرات کے متعلق لکھتے ہیں:-

”ہر چند کہ یہ حضرات حقیقتہً بے گناہ تھے مگر دشمنوں کی

یادہ گوئی نے ان کو باغی و مفسد اور مجرم و سرکاری

خطا دار ٹھہرا رکھا تھا اس لئے گرفتاری کی تلاش تھی۔

مگر حق تعالیٰ کی حفاظت برسر تھی اس لئے کوئی آنچ نہ آئی

اور جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ

تھے تازلیست خیر خواہ ہی ثابت رہے۔ ہاں چند روز

کی تفریق بین الاحباب مقدر تھی وہ اٹھانی تھی سواٹھائی

(تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۷)

اب رہا یہ سوال کہ جب ”یہ حضرات اپنی مہربان سرکار

کے دلی خیر خواہ تھے اور تازلیست خیر خواہ ہی رہے۔ اور اس سرکار

کو اپنا مالک سمجھتے تھے۔ اس کے فرماں بردار تھے“ تو پھر

تھانہ بھون اور شالی میں انگریزی فوج سے جنگ کیسے کی؟

وہاں سے انگریز افسروں کو نکال کر؟ اسلامی حکومت ”کیسے قائم

کر لی تھی؟ اس کا جواب معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ

ہم تذکرۃ الرشید کے مصنف مولانا عاشق الہی کی زبانی وہ ساری

داستان سنائیں جو انہوں نے بیان کی ہے۔ تب یہ راز کھلے گا کہ درحقیقت بات کیا ہے؟ موصوف لکھتے ہیں:-

”اصل قصہ یوں سنا تھا کہ قاضی سعادت علی خاں پسر نجابت علی خاں رئیس اعظم زمیندار تھانہ بھون ضلع مظفرنگر کے دو بیٹے تھے جن میں بڑے لڑکے عنایت علی خاں نے باپ کے مرنے پر ریاست کا کام سنبھال رکھا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی عبدالرحیم خاں جو بڑے بھائی کو باپ کی جگہ سمجھتے تھے باطلینان حسب خواہش جہاں جی چاہتا چلے جاتے اور امیرانہ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ حقیقت میں دونوں بھائی ایک دوسرے کے جاں نثار اور شیدا و عاشق زار تھے۔ اسی گھٹا ٹوپ اندھیاء میں جبکہ کئی دن جگہ غدر پڑ چکا اور دہلی اس کا آشیانہ بنا ہوا تھا۔ عبدالرحیم خاں مع چند اجاب کے سہارنپور گئے اور سرائے میں کچی دوست کے پاس ٹھہرے۔ زمیندارانہ قصوں میں آدمی کے دشمن بہترے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک بنیا جس کو قدیم سے اس ریاست کے ساتھ عداوت تھی اتفاق سے وہاں مقیم تھا۔ اس نے زمانہ غدر کو غنیمت سمجھا اور کچھی صاحب انگریں سے جو باغیوں کی سرکوبی کے لئے حکم موت کا مجازہ ہا گیا تھا

ضلع سہارنپور میں معین کیا گیا تھا، جا مخبری کی کہ تھانہ
 کارنیں بھی کہنی سے باغی ہو گیا۔ چنانچہ اس کا بھائی دہلی
 میں کمک بھیجنے کے لئے ہاتھی خریدنے آیا اور کئی دن
 سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ادھر یہ جھوٹی مخبری
 ہوئی اور ادھر گلی کو چوں میں دشمنوں نے اس افواہ
 کو پھیلا دیا۔ یہاں تک کہ ایک گار دلبرت سرائے
 روانہ کیا گیا اور عبدالرحیم خاں معہ ہمراہیان بالزام
 بغدادت جیل خانہ بھیج دیئے گئے۔ زمانہ تھا احتیاط
 کا فوراً ناکردہ گناہ جماعت کو پھانسی کا حکم ہو گیا۔
 اور اگلے دن قاضی عنایت علی خاں کو اپنے بھائی کے
 دنیا سے رحلت کی اطلاع ملی۔ اس صدمہ سے عنایت
 علی پر رنج و غم کے پل ٹوٹ پڑے۔ اور جوشِ حزن میں
 بھائی کے انتقام کا خیال پختہ ہو گیا۔ اتفاق سے چند
 سوار کپاروں کے کندھوں پر کار تو سوں کی کئی بہنگیاں
 لدوائے سہارنپور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے کہ
 قاضی صاحب کو اطلاع ہوئی اور یہ اپنے جنوں میں
 مست چند رفقاؤں کو ساتھ لئے شیر علی کے باغ
 کی سمت شُرک پر جا پڑے اور جس وقت سوار
 سامنے سے گزرے ان کا اسباب لوٹ لیا۔ ایک سوار

اس جنگ میں زخمی ہو کر بسرت مشرق جنگل کو بھاگا
 مگر تھوڑے ہی فاصلہ پر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔
 اس فساد کی خبر مظفرنگر پہنچی تو حاکم ضلع کی طرف سے
 تھانہ پر فوج کشی کا حکم ہو گیا۔ جس پر عنایت علی خاں
 نے علم فساد کو کھلم کھلا بلند کیا۔ چنانچہ شالی کی طرف
 انگریزی فوج کے جانے کی جھوٹی خبر بلکہ منقارہ بجایا
 گیا اور جتھہ کا جتھہ تحصیل شالی پر چڑھ دوڑا اور کیا جو کچھ کیا۔
 جس وقت گورنمنٹ کو اہل کاران تحصیل کے مارے
 جانے اور خزانہ کے لوٹے جانے کی اطلاع ملی تو حاکم
 شالی پہونچا اور چار طرف نقشوں اور قبضہ کی دیرانی و
 بربادی دیکھ کر غصہ سے تھرا اٹھا۔ آخر یہ کہہ کر تھانہ
 بھون بھی اسی طرح سہار کر کر چھوڑ دوں گا یہ مظفرنگر واپس
 ہو گیا۔ اس لئے کہ تنہا تھا اور اس بد امنی کے وقت
 میں جان کا خطرہ قوی۔ چند ماہ بعد جب اسن ہوا
 اور دہلی کے فتح ہو جانے کی خبر مشہور ہوئی تو قاضی
 صاحب کو اپنی جان کا فکر ہوا یہاں تک کہ تھانہ میں یہ خبر
 گرم ہوئی کہ علی الصباح انگریزی فوج یہاں پہونچا
 چاہتی ہے۔ اس وحشت اثر اطلاع سے لوگوں کے
 تلوے کے نیچے سے زمین نکل گئی اور بھاگنے کی

سوچی کہ بدھرمہ سمائے نکل جائیں۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت قاضی صاحب نے معہ چند ہمراہیان کے تھانہ بھون کو خیر باد کہی اور سمت نجیب آباد روانہ ہوئے۔ اور وہیں سے خدا جانے کہاں گئے اور کیا ہوئے کچھ پتہ نہ چلا۔

سنا گیا ہے کہ قاضی عنایت علی کو ہمارے اکثر دینی حضرات نے اس کا ردائی سے منع کیا اور کمپنی کی طرف سے بھی پیام پہنچا کہ تم فساد سے باز آؤ۔ اپنے بھائی کو صبر کرو غلطی سے یہ حرکت ہوگئی، اگر تم انتقام سے باز آگئے تو تم کو تھانہ کا نواب بنا دیا جائے گا، مگر تقدیر کے مضبوط پنجوں سے بھاگ جانا طاقت سے باہر ہے حق تعالیٰ کے علم میں جب اس گھرانے کی تباہی و جلا وطنی اور گشتگی و خانہ دیرانی اسی طرح مقدر تھی تو قاضی عنایت علی کیا سمجھے صبح صادق نمودار ہوئی تو بلائے بے دریاں اپنے ساتھ لائی۔ تھانہ بھون سے کاری فوج سے گھیر لیا گیا اور شرعی جانب سے گولہ باری شروع ہوگئی، دن نکلنے پر فوج قصبہ میں داخل ہوئی، قتل و قتال لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا.... خلاصہ یہ کہ رات کی تاریکی چھانے سے پہلے پہلے حاکم ضلع کا قول پورا ہو گیا کہ شاملی کی طرح تھانہ بھون کو بھی مسمار کر دوں گا۔ اللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ (حاشیہ تذکرۃ الرشید جلد اول ص ۱۷۵) قلعے کی اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ تھانہ بھون اور شاملی میں جو جنگ ہوئی اس کا محرک جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ نہ تھا، بلکہ تھانہ بھون کے رئیس اور زمیندار

قاضی منایت علی خاں نے اپنے بھال کا انتقام لینے کیلئے غصہ اور جوش میں یہ ہنگامہ برپا کیا تھا۔ اور اس ہنگامہ میں ان کے ساتھ ان کے کچھ رفقا اور کی رعایا شریک تھی۔ نہ حاجی امداد اللہ صاحب کی شرکت کا اس میں ذکر ہے اور نہ مولانا قاسم نانوتوی اور نہ مولانا رشید احمد گنگوہی کا۔ ان حضرات کی لڑائی کا قصہ دوسرا ہے جو آگے آرہا ہے لیکن اس سے پہلے تھانہ بھون اور اس کے اطراف میں "اسلامی حکومت" قائم کر دینا جو اس نے بیان کیا جاتا ہے اس کے متعلق مولانا عاشق الہی مرحوم کی تحقیق پڑھے، مولانا موصوف لکھتے ہیں:-

اس بد امنی کی حالت میں جس کو قصہ کی اصلیت ظاہر کرنے کیلئے مختصر الفاظ میں حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے عام باشندگان قصہ کی یہ حالت ہوئی گویا ان کا دلی و منتظم بادشاہ سرے اٹھ گیا۔ اور شرعی و طبعی ضروریات و منجصات میں بھی کوئی خبر گیرا نہ رہا جس کی رائے پر عمل کریں۔ پس یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہلکسی حاکم کی سرپرستی کے گزران دشوار ہے گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا اسن اٹھا لیا اور بذریعہ اشتہار عام اطلاع دیدی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہیے۔ اس لئے آپ چونکہ ہمارے دینی سرور ہیں اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بھی بار اپنے سر رکھیں اور امیر المؤمنین بن کر ہمارے باہمی فیضے چکا دیا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا اور آپ نے دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک قاضی شرع بن کر فیصلہ بھی فرمائے۔ اسی قصہ نے مغلوں

۳۸۴

میں شریک ہونے کی راہ چلائی۔ اور مخبروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا۔ حضرت امام ربانی قدس سرہ دس برس ہوئے اعلیٰ حضرت کو اپنے دین و دنیا کا سردار بنا ہی چکے تھے ہمیشہ آمد و رفت رہتی ہی تھی۔ اب جبکہ ہر چار طرف بد امنی تھی آپ کے لئے یہاں حاضر رہنے سے زیادہ بہتر کوئی جگہ دنیا میں نہ تھی۔ اور اعلیٰ حضرت کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضائیں مولوی کی ضرورت تھی کہ حق بات میں اعانت کرتا رہے۔ اس لئے آپ اور مولانا محمد قاسم صاحب معہ دیگر خدام کے یہیں رہ پڑے۔

(تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۴۴)

اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ گورنمنٹ کی اس عام اطلاع کے بعد کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہئے۔ "قصبہ تھانہ بھون کے لوگوں نے حاجی امداد اللہ صاحب کو رجن کے وہ پہلے سے معتقد تھے) نزاعات اور خصومات وغیرہ کا فیصلہ کرنے کرنے کیلئے انتظاماً اپنا سربراہ بنالیا۔ اور حاجی صاحب کے ساتھ عقیدت اور تعلقات کی بنا پر اس بد امنی کے زمانے میں مولانا گنگوہی اور مولانا توتوی نے بھی یہیں اقامت اختیار کر لی۔ خود حاجی صاحب کو بھی اپنے تعاون کے لئے ان حضرات کی رفاقت کی ضرورت تھی اس لئے ان کی اقامت کو پسند کیا۔

سرکاری اور اجتماعی کے اس نظام کی مثالیں ہندوستان کے پچھلے دور میں نادر نہیں ہیں لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ وہ بیچارے پریسکینڈ کے اس فن سے ناواقف تھے کہ انگریزوں کا نظام کو اسلامی حکومت امام ربانی سے مراد مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں۔ اس کتاب میں ان کو بار بار اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

اور مقامی سردار کو "امیر المومنین" کے خطاب سے نوازتے اس لئے گنہگار ہو کر رہ گئے۔

اب مولانا عاشق الہی جیسے عقیدت مند ہی کی زبانی وہ قصہ بھی سن لیجئے جس میں ان حضرات کے دستِ بدست جنگ کرنے کا واقعہ مذکور ہے۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں:

"اتنی بات یقینی ہے کہ اس گھبراہٹ کے زمانے میں جبکہ عام لوگ بزرگوں کو اڑوں گھر میں بیٹھے ہوئے... کانپتے تھے حضرت امام ربانی اور نیز دیگر حضرات اپنے کاروبار نہایت ہی اطمینان کے ساتھ انجام دیتے اور جس شغل میں اس سے قبل مصروف تھے بدستوران کاموں میں مشغول رہتے تھے کبھی ذرہ بھر اضطراب نہیں پیدا ہوا اور کسی وقت جہہ برابر تشویش لاحق نہیں ہوئی۔ آپ کو اور آپ کے محقق جمع کو جب کسی ضرورت کیلئے شامی، کیرانہ، مظفر نگر جانے کی ضرورت ہوئی غایت درجہ سکون و وقار کے ساتھ گئے اور طمانینت قلبی کے ساتھ واپس ہوئے۔

ان ایام میں آپ کو ان سفردوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا جو غول کے غول پھرتے تھے۔ حفاظتِ جان کیلئے تلوار البتہ پاس رکھتے تھے اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بہادر شہ کی طرح نکلے چلے آتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی اپنے

۳۸۶

رفیق جانی مولانا قاسم العلوم اور طبیب روحانی اعلیٰ حضرت
 حاجی صاحب و نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ
 بند و چیمپوں سے مقابلہ ہو گیا ، یہ نبرد آزمادیر حتما اپنی سرکار
 کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا
 نہ تھا۔ اس لئے اٹل پہاڑ کی طرح پُر آجما کر ڈٹ گیا۔ اور
 سرکار پر جاں نثاری کے لئے تیار ہو گیا۔ اللہ ربّے شجاعت
 و جواہر دی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر
 سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں
 تلواریں لئے جم غفیر بند و چیمپوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا
 زمین نے پاؤں پکڑ لئے ہیں، چنانچہ آپ پر فرس ہوئیں اور
 حضرت حافظ ضامن صاحب زیناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے
 حضرت مولانا قاسم العلوم ایک مرتبہ بیکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے
 جس نے دیکھا جانا کہ کنپٹی میں گولی لگی اور دماغ پار کر کے نکل
 گئی۔ اعلیٰ حضرت نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھا اور فرمایا :
 کیا ہوا میاں ؟ یہ عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا ہمیں گولی کا نشان
 تک نہ ملا۔ اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔۔۔
 آخر جب مفسدوں کی معرکہ آرائی سے پیچھا چھٹا تو حضرت
 اپنے شہید و فاروحانی مربی کی نعش کو کاندھے پر لیکر اٹھے
 اور چار پائی پر لٹا کر یکے بعد دیگرے تھانہ میں بسمتِ مغرب

زمین کی گود کے حوالہ کیا۔

جب بغاوت و ساد کا قصہ فرو ہوا، اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی ربائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں انھوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا۔ اور یہ مخبری کی کہ تھانہ کے فساد میں اصل الاصول ہی لوگ تھے۔ اور شاہلی تحصیل پر حملہ کرنے والے یہی گروہ تھا۔ بستی کی دوکانوں کے چھڑاٹھوں تحصیل کے دروازہ پر جمع کئے اور اس میں آگ لگا دی۔ یہاں تک کہ جس وقت آدھے کو اڑجل گئے۔ ابھی آگ بجھنے بھی نہ پائی تھی کہ ان نڈر ریتاؤں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گس کر خزانہ سرکار کا لوٹا تھا۔ حالانکہ یہ کمبل پوش فاقہ کش نفس کش حضرات فساد سے کورسوں دور تھے۔

تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۷۷ تا ۷۹

اس بیان کو غور سے پڑھئے! کتنی وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں ان حضرات نے جو جنگ لڑی تھی وہ انگریزوں کی سرکار کے خلاف اور بغاوت کی جنگ نہ تھی بلکہ اس کے برعکس وہ تو سرکاری حمایت میں ”جاں نثارانہ“ اور وفادارانہ جنگ تھی۔

ان کی یہ نبرد آزمائی انگریزی فوج اور پلیٹن کے مقابلے میں نہ تھی بلکہ ”سنگرم“ کے مخالف باغیوں کی سرکوبی کے لئے تھی۔ ان حضرات کے حق میں یہ کہنا ”تہمت“ اور جھوٹی خبری“ ہے کہ انھوں نے تھانہ بھون کے فساد میں حصہ لیا تھا اور شاعلی تحصیل پر چڑھائی کی تھی۔

”تذکرۃ الرشید“ کے ان تمام اقتباسات میں ہمارے **درس عبرت** | ان مہربانوں کے لئے درس عبرت ہے، جو بعض لوگوں کے ذاتی تاثرات اور طبعی رجحانات کی آڑ لیکر حضرت میاں حسن کو اپنے مطاعن کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ابھی بعض کتابیں ہم کو نہیں ملی ہیں، ان کی تلاش جاری ہے بل جانے کے بعد مزید سنی خیر انکشافات کی توقع ہے۔

اس ضمنی گفتگو کے بعد ہم پھر اپنے سابق سلسلہ بحث ”میاں نصاحب کے سفر حج کے واقعات“ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

حضرت میاں نصاحب قدس سرہ کے **ایک مضمی اور علی تو بہ نامہ** | سفر حج کے واقعات کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کے خلاف مکہ معظمہ میں جو ”متحدہ محاذ“ بنایا گیا تھا جب وہ انکو قتل کرانے یا جس دوام میں پھنانے کے منصوبے میں ناکام ہو گیا تو پھر اس نے دوسرے عنوان سے حضرت کے وقار کو گرانے کی کوشش کی۔

”مکہ سے یہ جھوٹی خبر سہندوسہ ان بھیجی گئی کہ مولانا سید نذیر حسین صاحب نے پاشا مکہ کے سامنے ”وہابیت“ سے توبہ کر لی اور اپنے حقیقی ہونے

کا اقرار کر لیا، عربی اور اردو عبارت میں ایک فرضی اور جعلی توبہ نامہ بھی تیار کر لیا گیا اور اسی کو چھپوا کر شائع کیا گیا۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم نے "اشاعۃ السنۃ" جلد ۶ ص ۳۳۷ میں اس کا ذکر کیا ہے اسکی اردو عبارت یہ ہے :

"سید محمد نذیر حسین متبع سنت والجماعت عقیدۃً وفعلاً اور

اس کے خلاف جتنے مذاہب ہیں خواہ رافضی خواہ خارجی خواہ

وپابی سب کو برا سمجھتا ہوں اور موافق مذہب حنفی کے فتویٰ

دیتا ہوں اور حنفی المذہب ہوں وَتَبَيَّنَتْ مَا اخْطَاؤُتْ"

حضرت میا نصاحب کے قلم کے لکھے ہوئے دو سو سے زائد خطوط کا ایک

مجموعہ "مکاتیب نذیریہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جس میں غاری

اور اردو دونوں قسم کے خطوط موجود ہیں "توبہ نامہ" کی مذکورہ بالا عبارت

کو ان خطوط سے مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے، اگر ادب دان شا کا معمولی ذوق بھی

ہوگا تو آپ خود پکارا بھینس گئے، کہ ایسی بودی بے ربط اور گنجلک

عبارت مولانا نذیر حسین محدث دہلوی کی نہیں ہو سکتی۔ رہ گیا اس کی

تاریخی حیثیت کا معاملہ، سوا اسکی بابت مولانا آزاد مرحوم کا بیان پڑھئے

فرماتے ہیں :

"ایک توبہ نامہ بھی مولانا نذیر حسین مرحوم کا بعض رسالوں میں

میری نظر سے گزرا ہے، اور وہ مباحثہ مرشد آباد میں پیش بھی

کیا گیا تھا، لیکن اس کے فرضی ہونے پر میں ایسی شہادتیں رکھتا

۳۹۰

ہوں جس سے زیادہ قابل اعتبار شہادتیں اور نہیں ہو سکتیں، کیونکہ جو تحریر مولانا نذیر حسین نے دی تھی وہ بارہا والد مرحوم نے مجھے حرف بحرف سنائی ہے، اور وہ وہی ہے جسکا ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں فتنے سے بچنے کے لئے ایجابی طور پر جس وضاحت سے انھیں اپنے عقاید بیان کرنا چاہئے تھا اس سے انھوں نے گریز کی۔ لیکن منفی طور پر انھوں نے اپنے اصلی عقائد سے ہرگز انکار نہیں کیا، اور ان حالات کو دیکھتے ہوئے جو انھیں وہاں پیش آئے تھے ان کے اس تسامح کو کوئی بھی قابل الزام کمزوری نہیں قرار دے سکتا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر وہ حریف کے ساتھ بحث و جدال میں اتر آتے تو نتیجہ نہایت ہولناک ہوتا۔

(آزاد کی کہانی ص ۱۰۸)

اس بیان میں مولانا آزاد نے اپنے مختصر اور محتاط جملوں میں جامعیت کے ساتھ چند بڑی اہم باتوں کی طرف اشارے فرمائے ہیں ہم ان کا تجزیہ کر کے بتاتے ہیں۔

پہلی بات جو مولانا نے پورے دثوق اور جزم و یقین کے ساتھ فرمائی ہے وہ یہ کہ جو ”توبہ نامہ“ مولانا سید نذیر حسین کی طرف منسوب کیا جاتا ہے

یہ تحریر ص ۳۴ و ص ۳۵ پر نقل ہو چکی ہے ۱۲

یہاں تک کہ اس کو بعض رسالوں میں شائع کر دیا گیا ہے وہ بلاشبہ فرضی ہے۔ اسکے فرضی اور جعلی ہونے کی وہ اتنی معتبر اور قطعی شہادتیں اپنے پاس رکھتے تھے کہ جس سے زیادہ معتبر شہادت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ اس کے باوجود بڑے بڑے "ثقہ" حضرات اس فرضی تو بہ نامہ کی تشہیر میں مصروف تھے۔ چنانچہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں۔

"غیب کی بات تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے مگر اصل حال یہ ہے کہ اس زمانہ میں غیر مقلد تقیہ کر کے اکثر اپنے آپ کو حنفی کہہ دیتے ہیں اور واقع میں حنفیہ کو مشرک بتلاتے ہیں۔ خود مولوی نذیر حسین نے مکہ معظمہ میں غیر مقلد ہونے سے تبری اور حلف کیا اور حنفی اپنے آپ کو بتلایا اور ہندوستان میں وہ ہر روز سخت غیر مقلد تھے اور اب بھی ذلے ہی ہیں، سو جب امام کا یہ حال ہو تو ان کے مقتدی کیسے کچھ ہونگے اور مولوی نذیر حسین کا حنفیوں کو بدتر از ہنود کہنا معتبر لوگوں سے سنا گیا ہے۔۔۔۔۔ (تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۱۸)

بتائیے جب "ابو حنیفہ الزماں، جنید الدوراء، امام ربانی علیہ السلام کا یہ حال ہے تو ان کے مقتدی کیسے کچھ ہوں گے، کتنی دیدہ دلیری کے ساتھ، انوسناک اور بے بنیاد الزامات میاں صاحب سمیت سب غیر مقلدوں کے ذمے

لے یہ سب القاب مولانا گیسوی کی شان میں مولانا مدنی نے استعمال کئے ہیں، ماحظ ہو شہادت و ثبوت

لگا دیئے گئے ہیں۔ کس دنیا میں رہتے ہیں وہ؟ غیر مقلد جو واقع میں خفیہ کو
مشرک بھی بتلاتے ہیں؟ اور پھر ”تقیہ کر کے اپنے آپ کو خفی بھی کہہ دیتے
ہیں؟ اور وہ ایسا اکثر کرتے ہیں؟ کتنا فساد انگیز، مکروہ، اور جھوٹا
ہے مولانا گنگوہی۔ کہ ”مستبر“ راویوں کا یہ بیان کہ مولانا سید نذیر حسین
خفیوں کو ہندوؤں سے بھی بدتر کہتے تھے؟ بھلا ایسی باتیں مجہول اور گنہگار
شخصوں کی طرف منسوب کر کے کتابوں میں نقل کر دینے کا مقصد اس کے
سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اچھڑیوں اور میاں صاحب کے خلاف لوگوں
میں بدظنی اور نفرت پھیلانی جائے؟

تعجب ہوتا ہے کہ مولانا گنگوہی کے سوانح نگار نے تو اہل حدیث
اور میاں صاحب کے متعلق گنگوہی صاحب کے یہ خیالات نقل کئے ہیں۔
لیکن ”فتاویٰ رشیدیہ“ میں اسکے برخلاف گنگوہی صاحب نے میاں
صاحب کے بارے میں اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا ہے۔ مندرجہ ذیل
سوال و جواب پڑھئے۔

سوال :- مولانا سید نذیر حسین صاحب کو جو دہلی میں محدث ہیں۔ جو
لوگ ان کو مردود اور خارج اہل سنت جانتے ہیں اور لاندہرب کہتے
ہیں آیا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں۔ باوجود صحیح نہ ہونے کے ایسے لوگ فاسق

لے اس الزام کے جھوٹ ہونے کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ میاں صاحب جمعو کی نماز ہمیشہ دہلی
کی مشہور جامع مجددی خفی امام کے پیچھے ادا کرتے تھے دیکھو الحیاۃ بعد الماۃ ص ۱۳۷ طبع اول

بدکار ہیں یا نہیں۔ اور مولانا صاحب کے عقائد اور اعمال موافق اہل سنت والجماعت ہیں یا نہیں؟ جواب بطور بسط کے ارقام فرمادیں کیونکہ ایک عالم ان کو لعن طعن کرتا ہے اور بدتر فاسقین سے جانتا چھٹا **جواب** :- بندہ کو ان کا حال معلوم نہیں اور نہ میرے ساتھ ان کی ملاقات ہے۔ لیکن جو لوگ ان کے حال کے بیان میں مختلف ہیں اگرچہ ان کو مردود اور خارج اہل سنت سے کہنا بھی سخت بیجا ہے عقاید میں سب متحد مقلد غیر مقلد ہیں البتہ اعمال میں مختلف ہوتے ہیں والہ تعالیٰ اعلم۔

رشید احمد گنگوہی رفقاوی رشیدیہ طبع کراچی ص ۱۵۱) اگر جواب کی عبارت کا مطلب سمجھنے میں کچھ الجھن محسوس ہو تو اسکی توجہ داری چھ پر نہیں ہے کیونکہ نقل بالکل اصل کے مطابق ہے غالباً یہ لاعلمی والی بات گنگوہی صاحب نے پہلے فرمائی ہوگی۔ پھر بعد میں جب یہ معتبر لوگوں سے سن سنا کر ”واقعہ“ ہو گئے تب وہ الزامات عائد کئے جو ان کے سوانح نگار نے ذکر کئے ہیں۔

دوسری بات مولانا آزاد کے مذکورہ بالا بیان میں یہ بتائی گئی ہے کہ ”یہ تو بے نامہ مباحثہ مرشد آباد میں پیش بھی کیا گیا تھا“ اس مباحثہ کی دو روئیدادیں اہل حدیث کی طرف سے شائع کی گئی ہیں۔ ایک مولانا محمد سعید صاحب بنارس مرحوم کی مرتب کی ہوئی ہے۔ اور دوسری مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی مرحوم کی۔ ان دونوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مباحثہ مقام گورا بازار ضلع مرشد آباد (بنگال) میں بمسماہ

۳۹۴

جمادی الاولیٰ ۱۳۱۵ھ (مطابق مارچ ۱۸۹۸ء) ہوا تھا۔ موضوع بحث مسئلہ وجوب تقلید شخصی تھا یہ مناظرہ کئی دنوں تک ہوتا رہا۔ فریقین کے اکابر علماء کا اجتماع تھا۔ اہل حدیث کی طرف سے شروع سے آخر تک مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی ہی مناظر رہے مگر احناف کے مناظر بدلتے رہے۔ شروع میں مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب جوپوری۔ مولانا کریم بخش صاحب کلکتہ، مولوی شیر علی صاحب طاعارف ولایتی باری باری سامنے آتے رہے۔ آخر میں مولانا عبدالحق صاحب (تفسیر حقانی والے) دہلی سے پہنچے انہی نے یہ ”توبہ نامہ“ پیش کیا تھا اس کے جواب میں مولانا رحیم آبادی نے فرمایا تھا۔

”ہمارے مخاطب نے یہ کہا ہے کہ ان لوگوں کے اوستاد و جوان کے بھی اوستاد ہیں) مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب نے مکہ معظمہ میں توبہ کیا ہے۔۔۔ اصل حال یہ ہے کہ دلیل دینے و مباحثہ کرنے میں جب یہ لوگ بر نہیں آتے تو جھوٹ بول کر سستان باندھ کر بازی لیجنا چاہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ لوگ رسول کی عظمت نہیں کرتے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء نہیں جانتے۔ سوز کی چربی حلال کہتے، خالہ بچھو کچی سے نکاح جائز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہم لوگ ایسے عقیدہ و مذہب والے کو کافر جانتے ہیں۔ پہلے مشہور کر دیا، اخباروں میں چھاپ دیا کہ مولانا نذیر حسین صاحب قتل کئے گئے پھر شتہ کیا کہ وہ مکہ معظمہ میں قید ہیں جب جناب مولانا سفر حج سے مکان پر واپس آگئے اور یہ لوگ

صاف طور سے جھوٹے بن گئے۔ تو یہ توبہ نامہ جعلی بنا کر مشہور کیا ہے۔ جسکی عربی تک صحیح نہیں۔ اور دفتر وہاں ترکی زبان میں ہے اور یہ عربی اور اس پر مہر وغیرہ ندارد۔ اسکی تکذیب کے واسطے اہل حدیث نے خاں دفتر سے وہاں کے پروانہ حاکم جو مزین بہ مہر و دستخط ہے اسکا فوٹو گراف منگوا کر ان کو جھوٹا ثابت کر دیا۔ وہ فوٹو گراف بعینہ موجود ہے حضور شائین میں پیش کیا گیا، مگر ساتھ اس کے ان لوگوں کو جھوٹا بولتے شرم نہیں آتی۔ شاید سمجھا ہو گا کہ وہ فوٹو گراف یہاں کہاں سے آئے گا۔ ہمارا جھوٹ چل جائے گا فقط درود و مناظرہ مرشد آباد (۳۳) مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم نے اس فرضی اور جعلی توبہ نامہ کی

لے عربی توبہ نامہ کا پورا متن ابھی ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ اسکی دو تین ابتدائی سطریں اشاعت السنہ جلد ششم ۱۳۲۴ء میں نقل کی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل پاشا، مکہ کی تحریر ہے جس میں میاں صاحب کے متعلق ”وہابیت“ سے توبہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ غالباً یہی عربی تحریر مباحثہ مرشد آباد میں پیش کی گئی تھی۔ اس زمانہ میں حجاز ترکوں کی حکومت کے ماتحت تھا اور سرکاری کاغذات ترکی زبان میں ہوتے تھے۔ اس لئے مولانا رحیم آبادی نے گرفت کی کہ اگر یہ تحریر پاشا، مکہ کی ہے اور سرکاری ہے تو ترکی زبان میں ہونا چاہئے نہ کہ عربی میں۔ عربی بھی صحیح نہیں ہے اور نہ اس پر سرکاری مہر ہے نہ دستخط

۳۹۴

بابت بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور اچھی طرح اسکی کھال ادھیر کر رکھی ہے۔

ہے۔ ملاحظہ ہوا شاعۃ السنۃ جلد ششم ۱۱ از ص ۳۲۳ تا ص ۳۲۴

تیسری خاص اور اہم بات جسکی مولانا آزاد نے نشان دہی فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا سید نذیر حسین صاحب نے اپنے عقاید کی بابت جو تحریر دی تھی اس میں انھوں نے منفی طور پر تو اپنے اصلی عقائد سے ہرگز انکار نہیں کیا ہے۔ البتہ ایجابی طور پر اپنے عقاید کے اظہار میں کچھ تسامح سے کام لیا ہے۔ لیکن ایسا انھوں نے ”قتلے“ سے بچنے کیلئے کیا تھا۔ اور جن حالات میں وہ وہاں گھرے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھتے ہوئے اس تسامح کو کوئی بھی قابل الزام کمزوری نہیں قرار دے سکتا کیوں کہ اگر ایجابی طور پر وہ صاف صاف اپنے عقاید کا اظہار کر کے بحث و جدال پر اتر آتے تو اس کا نتیجہ نہایت ہولناک ہوتا۔

مولانا آزاد کا یہ آخری فقرہ کہ ”نتیجہ نہایت ہولناک ہوتا“ بڑا معنی خیز ہے۔ اسکے صاف معنی یہ ہیں کہ میاں صاحب علیہ الرحمۃ کو قتل کرانے کے بارے میں علمائے دیوبند و بریلی کی سازش اپنا پورا کام کر چکی تھی۔ اسلئے یہ ہولناک حادثہ حرم پاک میں پیش آکر رہتا۔

توبہ نامہ کی بابت: ”الحیاۃ بعد المماتہ“
 اس موقع پر حضرت میاں صاحب کے سوانح نگار مولوی فضل حسین صاحب کی بحث کا تحقیقی جائزہ

مظفر پوری نے ”الحیاۃ بعد المماتہ“ میں جو بحث کی ہے اسکو پڑھ کر مجھے

تجربہ بھی ہوا اور افسوس بھی۔ ان کی تحریر بہت سے ناظرین کے لئے غلط فہمی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بحث کا تحقیقی جائزہ لیا جائے۔

موصوف کا تاثر یہ ہے کہ "توبہ نامہ" کے واقعہ کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مخالفین نے توبہ نامہ کی جو نقل پیش کی ہے اسکو اس بنا پر جعلی قرار دینا کہ اس پر پاشا رملہ کا دستخط اور دفتر کی مہر نہیں ہے۔ یا مخالفین سے یہ مطالبہ کرنا کہ میاں صاحب کے اصلی اور دستخطی توبہ نامہ کا فولٹا شائع کرو۔ یہ سب مناظرانہ ڈھنگ کی باتیں ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

"اور مخالفین کو خطاب کر کے بہ آواز بلند منادی کر دی کہ اگر توبہ نامہ دستخطی شیخ کا ہے تو اسکا فولٹو بھی اسی طرح شائع کرو جس طرح ہم نے شائع کیا ہے۔ مخالفین توبہ نامہ اصلی اب لاتے ہی کہاں سے وہ تو تھا یا شاہ رملہ کے دفتر میں جو پیچھے ضائع کر دیا گیا ہو گا۔ دو ایک قلمی نقل اسکی لے کر یہ لوگ چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین فولٹو شائع نہیں کر سکے اور نقلی توبہ نامہ جعلی قرار دیا گیا یہ ڈھنگ ہیں مناظرے کے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں:-

"اب میرا سوال یہ ہے کہ اس واقعہ توبہ کے چھپانے کی کوشش کیوں کی گئی؟ اور اسکے ظاہر کرنے میں میاں صاحب کی کسر شان

۳۹۸

ہی کیا تھی؟ کسی ناکر وہ گناہ سے اگر جبراً توبہ کرائی جائے تو توبہ کرنے والے کی ذلت ہی کیا ہوئی، مثل مشہور ہے اپنی عزت اپنے ہاتھ - ذلت ہو تو نا جائز دباؤ ڈالنے والے کی - جسے غیر مجرم کو مجرم فرض کر لیا اور اس سے جبراً توبہ بھی کرائی - (ص ۹۸ و ص ۹۹)

بلاشبہ کسی تاریخی واقعہ کو چھپانے کی کوشش کرنا، سعی ناجہود ہے اگر ایسا کیا گیا ہے تو ہم بھی اسکو ناپسند کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی گزارش ہے کہ اسی طرح کسی تاریخی واقعہ کی صورت کو مسخ کر کے پیش کرنا بھی مذہب اور ناپسندیدہ حرکت ہے۔ اس لئے کسی واقعہ کی نسبت صرف اس کے ہونے اور نہ ہونے ہی کی جانچ کافی نہیں ہے، بلکہ اسکی بھی تحقیق ہونا ضروری ہے کہ واقعہ اگر پیش آیا تھا تو اسکی اصلی صورت کیا تھی؟ اس لحاظ سے یہاں ہم اس لئے غور طلب مسئلہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ میاں صاحب نے حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر توبہ کی تھی یا نہیں؟ بلکہ اصل جھگڑا تو اس بات کا ہے کہ توبہ نامہ کا مضمون کیا تھا؟

مخالفین کا دعویٰ یہ ہے کہ "مولانا سید نذیر حسین صاحب نے غیر عقید ہونے سے ترقی اور طعن کیا۔ اور اس بات کا اقرار کیا کہ میں حنفی المذہب ہوں، حنفی مذہب کے مطابق فتویٰ دیتا ہوں۔ اہل سنت والجماعت کے خلاف جتنے مذاہب ہیں خواہ رافضی خواہ خارجی خواہ وہابی سب کو برا سمجھتا ہوں" تو کیا واقعی توبہ نامہ کا مضمون یہی تھا؟ مصنف "الحیاء لبہ المماتہ" کے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ توبہ نامہ کے

اس مضمون کو صحیح سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا وہ مذکورہ بالا بیان ایک بار پھر پڑھئے جس میں انھوں نے صاف طور سے یہ تسلیم کیا ہے کہ ”مخالفین کے پاس اصلی توبہ نامہ تو نہیں ہے۔ مگر اسکی دو ایک قلمی نقل لے کر یہ لوگ چلے گئے“ (اور اب ہندوستان میں اسی کو پیش کرتے ہیں) یہ نقل اگرچہ اصل کے مطابق ہے، لیکن اصل کا فوٹو نہیں ہے۔ اس لئے اس نقلی توبہ نامہ کو جعلی قرار دیدیا گیا۔

مصنف ”الحیاء“ نے اپنے اس بیان کے ثبوت میں اگر تاریخ کی کوئی قابل اعتماد شہادت پیش کی ہوتی تو ہمیں اس کے ماننے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔ اور ہم بھی یہی کہتے کہ چونکہ یہ جبراً ہوا تھا اسلئے اس کا کوئی وزن نہیں ہے اور نہ اس میں میاں صاحب کی کوئی ذلت ہے لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ اتنے شدید الزام کی تائید کرتے ہوئے مصنف ”الحیاء“ مرحوم نے اپنی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کی اور بلا کسی تاریخی ثبوت اور شہادت کے یہ تسلیم کر لیا کہ مخالفین جو توبہ نامہ پیش کرتے ہیں۔ یہ اصل کے مطابق ہے۔ اسکو جعلی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ واقعہ کی جو ”اصلی اور سچی“ رویداد انھوں نے خود پیش کی ہے۔ اس میں بھی مخالفین کے شائع کردہ توبہ نامہ کے ایک لفظ کی بھی تائید و تصدیق موجود نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل بیان غور سے پڑھئے۔

مصنف ”الحیاء“ لکھتے ہیں:

”میرے پاس کافی دلائل اسکے موجود ہیں کہ واقعات پہلک سے چھپائے گئے۔ جس کا مختصر مگر اصلی اور سچا بیان یہ ہے کہ میاں حسنا کے ہم وطن و مہاجر ہموطن نے پاشا مکہ کے ہاں نہایت موقت اور موثر طریقہ پر مخبری کی کہ مولوی نذیر حسین دہلوی جو یمن وستان کر جج کو آئے ہیں وہ معتزلی اور وہابی ہیں۔ اگر ان کی تنبیہ اور سرزنش نہیں کی جائے گی تو اہل مکہ بلکہ اہل عرب کا عقیدہ فاسد ہو جائیگا اور تین سو سے زیادہ آدمیوں نے پاشا کے سامنے اسکی گواہی دی۔ چونکہ اہل عرب اور ترک اعتزال کو نہایت ہی برا سمجھتے ہیں پاشا نے آپ کو مع ان لوگوں کے جن کا ذکر اوپر گزر چکا دوبارہ طلب کیا اور تین روز تک اپنے مکان میں نظر بند رکھا۔ اور پوچھا کہ آپ معتزلی ہیں؟ میاں صاحب نے جواب دیا کہ نہیں۔ پوچھا کہ اعتزال آپ کیسا سمجھتے ہیں؟ آپ نے کہا نہایت بُرا۔ تب پاشا نے کہا کہ اچھا اعتزال سے آپ تخریری طور پر توبہ کیجئے اور اس توبہ نامہ پر اپنا دستخط کیجئے۔ کچھ دیر کی روکد کے بعد میاں صاحب نے اپنا دستخط کر دیا۔ اور لکھ دیا کہ میں معتزلی نہیں ہوں اور اعتزال سے توبہ کرتا ہوں۔ (الحیاء بعد المات ص ۹)

اس موقع پر مصنف ”الحیاء“ نے حاشیہ میں میاں صاحب کا ایک خط بھی نقل کیا ہے جس سے غالباً اپنے بیان کی تائید مقصود ہے۔ یہ خط میاں صاحب نے سفر حج سے واپس آنے کے بعد اپنے ایک شاگرد

۴۰۱

مولوی سید عبدالعزیز صاحب ساکن موضع صمدن ضلع فرخ آباد روپلی
کو لکھا تھا اسکا ضروری حصہ یہ ہے :-

والحمد للہ میں سفر حجاز سے واپس آیا اپنے اخبار میں سب
حال دیکھے ہوں گے۔ نصرة السنہ نے جو چھاپا ہے وہ صحیح کیفیت
سمجھو۔ برادران ہند کی عنایت تھی، میرا جو اعزاز و تعظیم و تجل
عرب میں ہوا اس کا شکریہ بجناب باری تعالیٰ کرتا ہوں بیشک
سعایت معاندین و منافقین سے مجھے ابتداء بہت دشواریاں
پیش آنا محسوس ہوئی تھیں، مگر الحمد للہ کہ وہ بالکل کچھ نہ تھیں یہ تم
پر ظاہر ہے کہ میں معترضگی نہیں ہوں۔ بس مجھ پر کیا حصر ہے۔
بلکہ تمام مسلمین پر اس سے توبہ کرنا واجب ہے۔ میں نے بھی
توبہ کی۔ عرب میں اعتزال کو بہت خراب سمجھتے ہیں اور فی الواقع
وہ بُری چیز بھی ہے۔۔۔

پڑھ لیا آپ نے مصنف "الحیاء" کا وہ بیان جسکی بابت انھوں نے
خود اقرار کیا ہے کہ یہ "اصلی اور سچا" ہے اُسی کے ساتھ حضرت میاں
لے مسلمانوں کے گمراہ فرقوں میں ایک فرقہ "معتزلہ" بھی ہے انھیں کو "قدریہ" بھی کہتے ہیں کیونکہ
یہ لوگ انسانوں کے افعال کو انسانوں کی قدرت کی طرف منسوب کرتے ہیں یعنی خود انسانوں کو اپنے افعال
کا خالق مانتے ہیں۔ اور تقدیر کے بھی منکر ہیں۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کلام الہی مخلوق ہے۔ یہ لوگ اللہ
تعالیٰ کو مخریجہ کائنات مانتے ہیں ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ان کے
ای قسم کے عقائد ہیں جو ظاہر کتاب سنت کے خلاف ہیں اسلئے اہل حدیث ان سے اپنی برکت
اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ ۱۲

صاحب کا وہ مکتوب گرامی بھی آپ کے ملاحظہ میں آگیا جسکو مصنف
 "الحیاء" ہی نے نقل کیا ہے۔ اب بتائیے ان سے مصنف "الحیاء"
 کے اس دعویٰ کی کس طرح تائید و تصدیق ہوتی ہے کہ مخالفین کے شائع
 کردہ توبہ نامہ کا مضمون، اصلی توبہ نامہ کی نقل ہے اسکو جعلی قرار دینا
 مناظرانہ ڈھنگ کی بات ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ "اصلی توبہ نامہ"
 میں تو صرف "اعتزال" سے توبہ کرنے کا ذکر ہے جس کا "نقلی توبہ نامہ"
 میں کبھی نام و نشان بھی نہیں ہے تو پھر اسکے بعد اب کیا شبہ باقی
 رہ جاتا ہے۔ اس بات کے تسلیم کر لینے میں کہ مخالفین کا شائع کردہ توبہ
 نامہ یقیناً فرضی اور جعلی ہے۔ جو لوگ اسکے اصلی ہونے کا یا نقل کو اصل کے
 مطابق ہونیکا دعویٰ کریں ان سے اسکا قابل اعتبار ثبوت طلب کرنا
 مناظرانہ قسم کی دھاندلی نہیں ہے بلکہ قرآن حکیم کے اس قانون کی تعمیل ہے۔
 "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ
 فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا
 قَوْمًا بِمَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ
 نَادِمِينَ" پھر اپنے لئے پڑھنا پڑے۔

یہ ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب کی تفسیر بیان القرآن سے لیا گیا ہے موصو
 نے اس آیت میں "فاسق" کا ترجمہ "شریر" کیا ہے۔ کیا میاں صاحب کو
 بدنام کرنے اور ان کے توسط سے پوری جماعت اہل حدیث کو بلا وجہ مطعون
 کرنے کے درپے ہونا، شرارت کی بات نہیں ہے؟ اور ایسے لوگوں کو "شریر"

کہنا غلط ہے ؟ اگر نہیں، اور یقیناً نہیں، تو پھر ان کی کسی خبر کو بلا تحقیق کیسے مان لیا جائے ؟

اگر کہا جائے کہ خبر مخفی لفظین کا شائع کردہ ایک شبہ اور اس کا جواب [توبہ نامہ تو واقعی جعلی اور فرضی ہے مگر یہ تو ثابت ہوا کہ میا نصاحب نے "اعتزال" سے توبہ کی تھی۔ تو کیا وہ معتزلی تھے ؟ اگر نہیں تو پھر اس سے توبہ کرنیکا کیا مطلب ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مصنف "الحیاء" کے بیان میں گنہگار چکا کہ پاشا، مکہ کے سوال کرنے پر میا صاحب نے صفائی کے ساتھ فرمایا تھا کہ میں معتزلی نہیں ہوں۔ اور اعتزال کو نہایت بُرا سمجھتا ہوں اس کے باوجود پاشا نے مطالبہ کیا آپ تحریریں طور پر اعتزال سے توبہ کریں۔ میا نصاحب نے اس پر اُسکے ساتھ رد و کد کی۔ مگر جب وہ نہیں مانا تو میا نصاحب نے دستخط کر دیا اور لکھ دیا کہ "میں معتزلی نہیں ہوں" اور اعتزال سے توبہ کرتا ہوں "میا نصاحب کی تحریر ان دونوں فقروں پر غور کیجئے۔ پہلا فقرہ میا نصاحب کا یہ ہے کہ "میں معتزلی نہیں ہوں" اس کے بعد یہ فقرہ لکھا ہے کہ "میں اعتزال سے توبہ کرتا ہوں" ظاہر ہے کہ پہلے فقرے میں میا نصاحب نے اپنا مستقل اور مستمر عقیدہ بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اسی عقیدہ کی بنا پر دوسرے فقرے میں اعتزال سے اپنی برائت اور نفرت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن برائت اور نفرت کے بجائے "توبہ" کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ اسی کی بابت پاشا مکہ

۴۰۴

کا اصرار تھا۔ گویا ان دونوں فقروں سے میاں صاحب کا مقصد یہ تھا کہ
 ”میں معتزلی نہیں ہوں“۔ بلکہ اعتزال کو نہایت برا سمجھتا ہوں اسلئے
 اس سے اپنی بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتا ہوں“۔ اس توجیہ کی تصدیق
 خود حضرت میاں صاحب کے کلام سے ہوتی ہے۔ حضرت کے جس مکتوب
 گرامی کا اقتباس اوپر ہم نے نقل کیا ہے اس میں وہ فرماتے ہیں:-
 ”یہ تم پر ظاہر ہے کہ میں معتزلی نہیں ہوں، پس مجھ پر کیا حصر
 ہے۔ بلکہ تمام مسلمین پر اس سے توبہ کرنا واجب ہے۔۔۔۔۔“
 کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ اس سے میاں صاحب کی مراد یہ ہے کہ تمام
 مسلمان معتزلی ہیں۔ اسلئے ان پر واجب ہے کہ اس سے توبہ کریں؟
 لہذا اسکے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہاں ”توبہ کرنے“ سے میاں
 صاحب کی مراد یہی ہے کہ جب کبھی اسکا موقع آئے اسوقت مسلمانوں
 پر واجب ہے کہ اعتزال سے اپنی نفرت اور بیزاری کا اظہار کریں۔
 بس یہی مراد اور مقصد اس ”توبہ“ سے بھی ہے جس پر پاشا مکہ نے
 میاں صاحب سے دستخط کرایا تھا۔



شمس العلماء کا خطاب

حاضرین و معاندین کی طرف سے حضرت میا نصاحب قدس سرہ کی ذات گرامی کو جن مطاعن کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ان میں سے ایک طعنہ یہ بھی ہے کہ ان کو گورنمنٹ انکلیشیہ کی طرف سے ۲۲ جون ۱۹۹۷ء مطابق ۲۱ محرم ۱۴۱۵ھ روز سہ شنبہ کو ”شمس العلماء“ کا خطاب ملا تھا۔ اس واقعہ کو میا نصاحب کے سوانح نگار نے ”الحیاء بعد المماتہ“ میں خصوصی اہتمام سے ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسکی بابت میا صاحب نے گویا اپنی خوشنودی کا اظہار کیا تھا چنانچہ مصنف ”الحیاء“ لکھتے ہیں:

”شمس العلماء کے خطاب کا تذکرہ جب کوئی شخص میا صاحب کے روبرو کرتا تو آپ نہایت ہی سادگی سے فرماتے کہ میا صاحب سے کیا ہوتا ہے ہمارے لئے تو پورا خطاب قرآن مجید میں حنیفاً مسلماً کا موجود ہے۔ دنیاوی خطاب سلاطین سے ملا کرتا ہے۔ یہ گویا ان کے خوشنودی کا اظہار ہے مجھے تو کوئی نذیر کہے تو کیا اور شمس العلماء کہے تو کیا۔ میں نہایت خورش ہوں کہ ہر ایک میا صاحب مجھے کہتا ہے۔ بھائی سادا کیلئے پیارا لفظ اس سے بڑھ کر نہیں ہے اس لفظ کی برکات سے میری درویشانہ طرز میں فرق نہ آئے بس خدا کا یہی فضل ہے۔

(الحیاء بعد المماتہ ص ۱۰۳)

منقولہ بالا اقتباس میں خط کشیدہ فقرہ مصنف "الحیاء" کا اپنا ذاتی تاثر اور استنباط ہے۔ یہ حضرت میانصاحب کے الفاظ نہیں ہیں۔ اسلئے اس فقرے سے ہم پر کوئی حجت نہیں قائم کیجا سکتی۔ ہمارے لئے قابل غور تو صرف وہ جملے ہیں جو میانصاحب نے فرمائے ہیں۔ تاہم ہم پوری دیانتداری سے عرض کرتے ہیں کہ بار بار غور کرنے کے باوجود ہماری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ آئی کہ مصنف "الحیاء" نے آخر میاں صاحب کے کس جملے سے اپنا یہ تاثر مستنبط کیا ہے کہ "یہ گویا ان کے خوشنودی کا اظہار ہے"۔ اسکے برخلاف ہم تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس موقع پر حضرت میانصاحب نے جتنے جملے ارشاد فرمائے ہیں وہ سب کے سب ان کی باوقار اور پر عظمت شخصیت کے بالکل شایان شان ہیں۔ ان کے لفظ لفظ سے اس قسم کے دنیاوی خطابات اور شاہی اعزازات کی بابت استغنا اور بے نیازی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اس خطاب (حنیفاً مُسْلِماً) کو اپنا سرمایہ افتخار قرار دیا جو قرآن مجید میں شہنشاہ دو جہاں کی طرف سے پوری امت مسلمہ کو ملا ہے۔ اسکے بعد یہ کہہ کر کہ "دنیاوی خطاب سلاطین سے ملا کرتے ہیں" میاں صاحب نے ایسے خطابات کی وقعت کو گرایا ہے۔ اور ان کی اہمیت کو گھٹایا ہے۔ اسلئے کہ احکم الحاکمین کے عطا کردہ خطاب کے مقابلہ میں دنیاوی سلاطین کے خطابات کے ذکر کو نزدیکانثا اسکے سوا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔

۴۰۷

پس اس سے اس خطاب شمس العلماء کی بابت میاں صاحب کی پسندیدگی اور خوشنودی کا اظہار تو ہرگز نہیں ہوتا۔ ہاں اس سے ان کی نگاہ میں اس خطاب کی بے وقعتی کا اظہار البتہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے صاف صاف فرمادیا کہ ”مجھے کوئی نذیر کہے تو کیا“ اور شمس العلماء کہے تو کیا؟ یعنی اگر نذیر کہنے سے میری عزت افزائی نہیں ہوتی تو شمس العلماء کہنے سے بھی میری شان نہیں بڑھتی۔ میری نگاہ میں یہ دونوں ہی لفظ برابر ہیں اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے آگے یہ بھی فرمایا ”میں نہایت خوش ہوں کہ ہر ایک میاں صاحب مجھے کہتا ہے“ گویا مقصد یہ تھا کہ دنیاوی عزت افزائی کے لحاظ سے یہ شاہی خطاب میرے لئے خوشنودی کا باعث نہیں بلکہ اس لحاظ سے میرے لئے خوشنودی کا باعث وہ خطاب ہے جو خاندان ولی اللہی کی جانشینی کے طفیل میں زبان خلق کی طرف سے مجھے ملا ہے اور سادات کیلئے لوگوں نے اختیار کیا ہے۔ کتنی متانت اور سنجیدگی کیساتھ فرماتے ہیں ”بھائی سادات کیلئے پیارا لفظ اس سے بڑھ کر نہیں ہے“

سوچنے کی بات ہے کہ جو اللہ کا بندہ ”میاں صاحب“ جیسے سادہ لفظ کو اپنے حق میں سب سے بڑھ کر ”پیارا لفظ“ سمجھتا ہو اور اپنی فقیرانہ اور درویشانہ زندگی کو اس لفظ کی ”برکات“ میں شمار کرتا ہو جس کا جذبہ یہ ہو کہ ”اس لفظ کی برکات سے میری درویشانہ طرز میں فرق نہ آئے۔ بس خدا کا فضل یہی ہے“ بھلا وہ اس اونچے خطاب پر

۴۰۸

اپنی خوشنودی کا کیا اظہار کریگا؟ جو کسی دنیا دار حاکم کی طرف سے محض اپنے دنیاوی اغراض و مصالح کے پیش نظر ملا ہو۔ اور جس کی بابت اس بات کا پورا خطرہ موجود ہو کہ اسکی وجہ سے نفس امارہ تفوق اور برتری کے احساس میں مبتلا ہو کر، جاہ پسندی، شہرت طلبی، اور نام و نمود کا رسیا بن جائے گا۔ حضرت میاں صاحبؒ اپنی فقیرانہ زندگی پر کس طرح مطمئن اور قانع تھے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ مصنف الحیاۃ لکھتے ہیں:-

”نواب سکندر بیگ مرحومہ والیہ بھوپال اپنے مدارالمہام نشی جلال الدین مرحوم کیساتھ دہلی آئیں اور میاں صاحب سے عہدہٴ فضلے ریاست کے قبول کرنے کی استدعا کی۔ مگر آپ نے ملازمت سے قطعاً انکار کیا اور فرمایا کہ میں تو وہاں کا قاضی القضاۃ ہو کر امیرانہ ٹھاٹھ سے مندرگٹے حاکم بنا ہوا بیٹھا رہونگا۔ یہ غریب طلباء چٹائی کے بیٹھنے والے مجھ کو کہاں دھونڈھتے پھر گئے۔“

(الحیاۃ بعد المات ص ۱۳۱)

بتائیے! جس مرد خدا نے ایک مسلمان ریاست کے تختے ہوئے اعزاز کو پا کر اپنی خوشی کا اظہار نہ کیا ہو۔ اور نہ رضا و رغبت کیساتھ اسکو قبول کر لینا گوارہ کیا ہو۔ اس کی نسبت ہم کس طرح باور کریں کہ اس نے انگریز کے دئے ہوئے اعزاز کو پا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا ہوگا اور رضا و رغبت کیساتھ اسے منظور کیا ہوگا؟ یہ صحیح ہے کہ میان صاحبؒ

۴۰۹

نے اس خطاب کو واپس نہیں کیا، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اسکا سبب یہی تھا کہ وہ اس سے خوش تھے۔ اسکے دوسرے اسباب بھی ہو سکتے ہیں اور وہی قرین قیاس ہیں جیسا کہ ہم آگے بتائیں گے۔ اس سے پہلے ایک دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے جس سے معلوم ہو سکے گا کہ کس طرح میاں صاحب اپنی فاقری میں بھی شاہی آن بان کی شان رکھتے تھے۔ انھیں مثنیٰ جلال الدین مرحوم مدارالمہام ریاست بھوپال نے جن کا ذکر ابھی اوپر گزرا ہے ایک مرتبہ حضرت میاں صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ اپنے مدرسہ کی امداد کیلئے بھوپال کی رئیسہ کی خدمت میں کوئی تحریر بھیجیں۔ اسکے جواب میں میاں صاحب نے ان کو لکھا:

یہ دربار اعانت مدرسہ مرا کہ نوشتہ اند کہ تحریر میرے بجناب سرکار عالیہ والیہ ملک باید نوشتہ تا معاملہ رو باصلاح گیرد مرا از انچوں لغو تحریر یکھا ہمیشہ اجتناب است برود خداوند تعالیٰ نشہ درین لی وہم وے تعالیٰ شانہ از خزانہ غیب اعانت مدرسہ و متعلمین خواہد کرد چہ کہ مرا از رجوع خدمت اغنیاء کراستے بخشیدہ است بندہ فقیر برائے خود نہ می خواہد ہر کہ دریں جا آوردہ مراد طالبان را روزی کافی وانی می رساند پس مایہ قناعت خود فروختن کارا بلہیان است... مکاتیب
نذیریہ ص ۱۷۱

ترجمہ (آپ نے میرے مدرسہ کی امداد کے بارے میں جو تحریر فرمایا

ہے کہ سرکار عالیہ والیہ ریاست کو لکھنا چاہیے تاکہ معاملہ درست ہو جائے۔ تو مجھ کو ایسی لغو تحریکوں سے ہمیشہ پرہیز رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دروازہ پر بیٹھ کر پڑھتا ہوں۔ وہی اپنے خزانہ غیب سے مدرسہ اور طالب علموں کی مدد کریگا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے امیروں کے دروازے پر جانے سے کراہت بخشی ہے۔ بندہ فقیر اپنی ذات کیلئے کچھ نہیں چاہتا ہے۔ جو یہاں لایا ہے وہی مجھ کو اور میرے طالب علموں کو پوری روزی بہم پہنچاتا ہے۔ ایسی صورت میں صبر و قناعت کی پوچھی کو فروخت کر دینا نادانوں کا کام ہے ۴

جس صاحب صدق و صفا، مومن با خدا کی خود داری کا یہ عالم ہو کہ ایک مسلمان اور عقیدت مند والیہ ملک کی خدمت میں اپنے لئے نہیں اپنے مدرسہ اور طلباء کی اعانت کیلئے بھی درخواست پیش کرنا، لغو اور بیکار حرکت سمجھتا ہو۔ جو پوری بے نیازی اور اطمینان قلب کیساتھ یہ اعلان کرتا ہو کہ "مرا از رجوع خدمت اغنیاء گراہتے بخشیدہ است" مجھے اللہ تعالیٰ نے امیروں کے درباروں اور مالداروں کے دروازوں پر اپنی حاجت لیکر جانے سے کراہت اور نفرت کی نعمت بخشی ہے، اس کے حق میں تو یہ سوچنا بھی، اس کی خود داری اور بے نیازی کی توہین سمجھتا ہوں کہ کسی ناگزیر افسر کے عطا کردہ خطاب کو اس نے اپنی رفعت شان کا ذریعہ سمجھا ہو، اور اس بنا پر اس کی بابت اپنی خوشنودی کا اظہار کیا ہو۔ جاشا

ثم حاشا۔

مصنف "الحياة" ہی نے نقل کیا ہے کہ :-

"مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب لاہوری فرماتے ہیں کہ مہجرب
دہلی میں پڑھتا تھا تو میاں صاحب اکثر میری فروگاہ پر تشریف
لاتے اور اسی صف نعال کے قریب چٹائی پر بیٹھ جاتے۔ میں
باصرار عرض کرتا کہ حضور ادھر فرش پر بیٹھیں۔ تو فرماتے تھے
برلباط اغنیاء ہرگز نیامید اہل فقر

زانکہ نقش بوریایاں قوم راز نجیر یا ست

(الحياة بعد المماتہ ص ۱۳۳)

ذرا سوچئے! جس بوریائیش فقر کی طبیعت کا یہ رنگ ہو کہ وہ اپنے
شاگردوں کے سامنے بھی جو توں کے قریب چٹائی پر بیٹھ جانے ہی کو اپنی
عزت سمجھتا ہو، اس کے مزاج کیساتھ یہ بات کس طرح میل کھاسکتی ہے کہ
وہ کوئی دنیاوی اعزاز و خطاب پا کر خوش ہوا ہوگا، اور اپنی اس خوشی کا
دوسروں پر اظہار بھی کیا ہوگا؟

"شمس العلماء" کا خطاب حاصل کرنیکی میاں صاحب کو شش
تو کیا کرتے، ان کو تو کبھی اسکا وہیم و گمان بھی نہ گذرا تھا کہ ان پہلے انگریز
کی یہ "نوازش" ہوگی۔

مصنف "الحياة" لکھتے ہیں :-

"معلوم ہوا ہے کہ جس وقت کمشنر دہلی نے بحکم افسانہ گورنر

پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے اس خطاب کی خبر آپ کو دی اس سے ایک منٹ آگے میاں صاحب کے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ میں اس عام لقب سے ملقب ہوں گا۔ (الحیاء ص ۳۱)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میاں صاحب نے اپنے وجدان و شعور کیساتھ بالقصد انگریزی حکومت کی خیر خواہی کی نیت سے کبھی کوئی ایسی نیت انجام نہیں دی تھی جسکے صلہ میں خود انکو کسی خصوصی انعام و اکرام کی توقع ہوتی۔ کیونکہ اگر ان کا اپنا کوئی ایسا کارنامہ ہوتا، تو پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس اعزاز یا خطاب یا اس قسم کے کسی دوسرے انعام و اکرام کے ملنے سے بالکل خالی الذہن ہوتے۔

درحقیقت یہ انگریز کی ایک حکمت عملی اور پالیسی تھی۔ اس نے اپنے مفاد کی خاطر میاں صاحب کو یہ اعزاز دیا تھا۔ غالباً میاں صاحب بھی اسکو بھانپ گئے تھے۔ جیسا کہ ان کے بعض وہ فقرے اس پر دلالت کرتے ہیں جو اس خطاب کی خوشخبری سنانے والوں کے سامنے انھوں نے پہلی بار فرمائی تھی۔ چنانچہ مصنف "الحیاء" کا بیان ہے کہ

یہ جرب لوگ خلعت و خطاب کیساتھ میاں صاحب سے ملے اور آپ کو اس سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہم غریب آدمی خلعت و خطاب لیکر کیا کریں گے۔ خلعت و خطاب تو بڑے آدمیوں کو ملنا چاہیے۔ ہم کو دینا لا حاصل ہے۔ بعد اس گفت

۴۱۳

شنید کے آپ نے اسی قدر فرمایا، اچھا صاحب آپ حاکم

ہو جو چاہو کہو۔ (الحیاء بعد المماۃ ص ۱۰۳)

میاں صاحب کا یہ فقرہ اپنی جگہ بڑا ذمہ داری ہے کہ ”ہم کو دینا لا حاصل ہے“ یعنی خلعت و خطاب دے کر بڑے آدمیوں کو خرید لیا جاتا ہے اور موقع بموقع ان کو اپنے مقصد برآری کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے مجھ جیسے آدمی کو خلعت و

خطاب دینا لا حاصل ہے کیونکہ مجھے اس خطاب کے ذریعہ نہ خریدا جاسکتا ہے اور نہ اپنے مقصد کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یوں تم حاکم ہو۔ اپنے منہ سے کہنے کو جو تمھارا جی چاہے کہو۔ شیخین کہو یا شمس العلماء مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے نزدیک یہ دونوں ہی برابر ہیں!

اسی مقصد کو میاں صاحب نے ایک سنجیدہ انداز میں ادا کیا ہے۔ اور یہی انداز ان کی باوقار شخصیت کیلئے مناسب بھی تھا اسلئے کہ وہ کوئی ہنگامہ پسند لیڈر تو تھے نہیں کہ تیز و تند جملے استعمال کر کے ”زندہ باد“ کے نعرے لگواتے۔ اور بھولوں کے ہار سے اپنا استقبال کراتے۔

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ میاں صاحب کو یہ خطاب مولانا بٹالوی مرحوم نے دلایا تھا! معلوم نہیں وہ اپنے اس دعوے پر کیا ثبوت رکھتے ہیں مجھے تو اب تک تاریخ سے اسکی کوئی شہادت نہیں ملی۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ میاں صاحب کی اپنی کسی کوشش کو اس خطاب کے ملنے میں قطعاً کوئی دخل نہیں تھا۔ اب رہا یہ شبہ کہ پھر میاں صاحب نے اس کو صاف لفظوں

میں روکیوں نہیں کر دیا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس خطاب کے ملنے پر میا نصاحب نے اپنے تاثرات کا اظہار جن الفاظ میں فرمایا تھا، جب اُن سے معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا کہ میا نصاحب کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ اور نہ انھوں نے اس سے کوئی دلچسپی لی تھی، تو نتیجہ کے اعتبار سے میا نصاحب کا یہ طرز عمل اسکے رد کر دینے ہی کے مرادف ہے۔ البتہ صاف و صریح لفظوں میں رد نہیں کیا، اسلئے کہ ابھی چند ہی سال گزرے تھے کہ اہل حدیث انگریزی حکومت کی نگاہوں میں سخت معتوب تھے، کیونکہ بقول مولانا غلام رسول مہرؒ اہل حدیث اور وہابیوں کو مترادف سمجھا جاتا تھا، بغاوت کے الزام میں ان پر کئی مقدمات چل چکے تھے۔ اور ان مقدمات کی وجہ سے ان میں سے بہتوں کی بڑی بڑی جائیدادیں ضبط ہو چکی تھیں۔ کتنوں کو کالا پانی اور حبس و دام کی سزا ہو چکی تھی۔ خود میا نصاحب بھی ایک مقدمہ کے سلسلے میں گرفتار ہو کر تقریباً ایک سال تک جیل میں نظر بند تھے۔ ادھر علماء احناف کی اشتعال انگیز یوں کی وجہ سے حنفی عوام برابر موقع کی تاک میں رہتے تھے انگریز افسروں کے پاس جا جا کر وہابیوں کے خلاف منجری کرتے تھے انکو بھڑکاتے تھے کہ ”وہابی آپ کے باغی اور بدخواہ ہیں۔“

الغرض سالہا سال کی پریشانیاں اور مصیبتیں جھیلنے کے بعد اب بظاہر فضا میں کچھ سکون پیدا ہوا تھا۔ اور اہل حدیث کے خلاف انگریزی بدگیاہوں

لے ملاحظہ ہو سرگزشت مجاہدین ص ۱۲۰

میں کمی آگئی تھی، ایسی حالت میں اگر صاف و صریح لفظوں میں میاں صاحب اس خطاب کو رد کر دیتے تو یہی حنفی حضرات جنہوں نے آج تک میاں صاحب کا یہ بیان نہیں چھوڑا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ اور انگریز افسروں کے پاس جا کر انکے کان بھرتے کہ اگر یہ آپ کے باغی اور بدخواہ نہیں ہیں تو آپ کا خطاب انہوں نے کیوں واپس کر دیا؟ اس طرح خطرہ تھا کہ میاں صاحب اور پوری جماعت اہل حدیث پر پھر مصیبت کا درد شروع ہو جاتا۔ یہ مصلحت تھی جسکے باعث میاں صاحب نے اس معاملہ میں بظاہر اغماض اور حشیم پوشی سے کام لیا۔



میاں ضا کی خانہ تلاشی اور جیل کی نظر بندی

حضرت میاں صاحب علیہ الرحمۃ کی زندگی کے ان واقعات کے سلسلے میں جو ان کے زمانہ کی حکومت اور سیاست سے متعلق ہیں، یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہیں کہ ۱۸۶۵ء و ۱۸۶۶ء وسطاً بق ۱۲۸۰ھ میں پٹنہ اور ان سالہ وغیرہ میں بہت سے مسلمان اس الزام میں گرفتار کئے گئے۔ اور ان پر سنگین مقدمات چلائے گئے کہ یہ لوگ خفیہ طریقے سے سرحد پار کے ان مجاہدین کی مدد کر رہے ہیں جو انگریزوں سے برسر پیکار ہیں۔ ان ماخوذین میں بڑی تعداد اہلحدیثوں کی تھی۔ اسی لئے یہ مقدمات ”وہابی کیس“ کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ ان کی تفصیلات بڑی دردا نگیز ہیں جو انشاء اللہ اپنے موقع پر پیش کی جائیں گی۔ حضرت میاں صاحب قدس سرہ اہلحدیث کے سرخیل اور سرتاج تھے۔ اسلئے وہ بھی ان مقدمات کی لپیٹ میں آئے پہلے ان کے مکان اور مسجد کی تلاشی ہوئی۔ کچھ خطوط اور کاغذات پولیس اپنے ساتھ لے گئی اسکے بعد خود میاں صاحب کو دہلی سے پشاور طلب

۴۱۶

کیا گیا۔ اور پشاور سے پھر راولپنڈی لے جایا گیا۔ راولپنڈی ہی کے جیل خانے میں ایک سال تک نظر بند رکھے گئے۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:-

..... (ان مقدمات میں) شیخ اکمل میاں نذیر حسین۔
محدث دہلوی بھی ہدفِ ابتلا بنے تھے۔ میاں صاحب مرحوم اہلِ حدیث
کے سرتاج تھے۔ اہلِ حدیث اور وہابیوں کو مترادف سمجھا جاتا تھا
مغزوں نے میاں صاحب کے خلاف بھی شکایتیں حکومت کے پاس پہنچائیں
انکے مکان کی تلاشی ہوئی۔ اور بہت سے خط پائے گئے، جو ہندوستان کے
مختلف حصوں سے آتے رہتے تھے۔ ان میں یا تو مسئلے پوچھے جاتے تھے
یا مختلف دینی کتابوں کے متعلق دریافت کیا جاتا تھا۔ میاں صاحب سے
پوچھا گیا کہ آپ کے پاس اتنے خطوط کیوں آتے ہیں؟ انھوں نے بے
تکلف جواب دیا کہ یہ سوال خط بھیجنے والوں سے کرنا چاہیے نہ کہ مجھ سے
ایک خط میں مرقوم تھا کہ ”نخبۃ الفکر“ اصولِ حدیث کی ایک
کتاب ایضاً دیجئے۔ مخبر نے کہا کہ یہ خاص اصطلاح ہے جس کا مفہوم کچھ
اور ہے۔ اور یہ لوگ خطوں میں اصطلاحی الفاظ سے کام لیتے ہیں۔

میاں صاحب نے یہ سنا تو جلال میں آگئے۔ اور فرمایا نخبۃ الفکر
کیا؟ توپ؟ نخبۃ الفکر کیا؟ بندوق؟ نخبۃ الفکر کیا؟ گولہ
بارود؟ بہر حال آپ کو دہلی سے راولپنڈی لے گئے۔ اور وہاں کم و بیش

لے حاشیہ ”الحیاء بعد المأثمۃ“ ۸۶۵ -

۴۱۸

ایک سال جیل خانے میں نظر بند رکھا..... میاں صاحب نے سرکاری
 لاٹری سے کتا بیس منگوانے کی اجازت لے لی تھی اور ان کا بیشتر وقت
 مطالعہ میں گذرتا تھا..... میاں صاحب کے خلاف کوئی الزام پایہ
 ثبوت کو نہ پہنچ سکا تو تقریباً ایک سال کے بعد انھیں ابتلا سے نجات ملی
 میاں صاحب کے صاحبزادے مولانا سید شریف حسین کے ایک مکتوب
 سے واضح ہوتا ہے کہ چیمبر لین صاحب تحقیقات پر مقرر ہوئے تھے پہلے
 چند آدمی دہلی آئے اور میاں صاحب سے مجاہدین یا ان کے معاونین
 کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ پھر چیمبر لین
 کے حکم سے انھیں پشاور طلب کیا گیا۔ میاں صاحب پشاور پہنچے تو
 معلوم ہوا کہ چیمبر لین راولپنڈی چلا گیا۔ چنانچہ میاں صاحب کو راولپنڈی
 آنا پڑا۔ اس اثنا میں چیمبر لین کسی سرکاری کام کے سلسلے میں انبالہ گیا اور
 وہاں فوت ہو گیا۔ میاں صاحب اسکے قائم مقام کے انتظار میں راولپنڈی
 ہی میں ٹھہرے رہے۔ قائم مقام نے میاں صاحب سے مجاہدین کا نام
 اور حال پوچھا۔ انھوں نے بے خبری ظاہر کی تو وہ بہت خفا ہوا۔ یہ خط
 اس زمانے میں لکھا گیا تھا جب میاں صاحب کی ابتلا پر پانچ مہینے
 گذر چکے تھے۔

(سرگزشت مجاہدین ص ۲۰۲ و ۲۰۳)

ان مقدمات کے ایک خاص ملزم، جناب مولوی محمد عیوب صاحب تھانیری

لاہور کا تیسبندیر یہ ص ۳۲

کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ راولپنڈی جیل میں میاں صاحب پر جبر کیا جاتا تھا کہ وہ ان کل ممبران اہلحدیث کے نام ظاہر کریں جو اس باغیانہ تحریک میں شریک ہیں۔

(ملاحظہ ہو کالاپانی ص ۱۷ شائع کردہ مسلمان اکیڈمی کراچی)
اور مصنف "الحیاء" نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "راولپنڈی جیل میں میاں صاحب کو روزانہ پھانسی کی دھمکی دی جاتی تھی"۔
(الحیاء بعد الماتہ ص ۱۳۶)

تلاشی میں جو خطوط اور کاغذات برآمد ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض کے متعلق ایک سرکاری رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مولوی محمد جعفر تھانوی (تین خط) مبارک علی ساکن پٹنہ دو خط) عطار الترمذی (تھانوی) محمد سوداگر (موڑہ کے کانپور، امین الدین کلکتہ، ابوسعید محمد حسین بٹالوی۔ محمد سوداگر (موڑہ کے خطوط تھے۔ خود میاں صاحب کے خطوط کی نقول میں جو مختلف حضرات کو لکھے گئے تھے، بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کے غدر ۱۸۵۷ء کے دوران کے پانچ فرمان بھی نکلے ضمیمہ کالاپانی از ایوب قادری شائع کردہ مسلمان اکیڈمی کراچی)۔

ایک عجیب اعتراض جماعت اہل حدیث کے ایک خصوصی کرم

فرما جو سر تاج اہل حدیث حضرت میاں صاحب علیہ الرحمۃ کے خلاف طرح طرح کی باتیں پھیلانے، اور ان کے وقار کو لوگوں کی نگاہوں میں گرانے ہی کو ایک بڑی دینی خدمت

۴۲۰

سمجھ رہے ہیں۔ ان کے سامنے میاں صاحب کی نظر بندی کے اس واقعہ کو کسی نے پیش کر کے کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں صاحب انگریز نواز نہیں تھے؛ تو اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا۔

”آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۸۶۰ء کے بعد بھی سازش کے مقدمات سیدہ مالہ، راج محل، اور آخری مقدمہ سازش سیدہ پٹنہ چلے لیکن ان تمام مقدمات میں میاں صاحب مرحوم پر کوئی الزام نہیں لگا۔ اور نہ وہ کچھ بھی ماخوذ ہوئے۔

بتلیئے یہ جواب دھاندلے بازی کے سوا اور کیا ہے؟ یہ بھی کوئی اعتراض ہے کہ ایک ہی دفعہ تو پکڑے گئے؟ میں پوچھتا ہوں کہ حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا قوی، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رجن کے بارے میں کچھ لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہ انگریز کے مخالف تھے (کتنی بار ماخوذ ہوئے تھے؟ غدر کے بعد بغاوت کے سیکڑوں مقدمات چلائے گئے۔ بتایا جائے کہ ان میں سے کتنے مقدمات میں یہ حضرات ملزم بنے تھے۔ اور کتنی بار جیل گئے تھے؟

اگر تاریخ ان سوالوں کا جواب نفی میں دیتی ہے، تو کیا ان حضرات کے خلاف بھی کبھی کوئی ”بخوی“ کیا گیا؟ ان کے عقیدت مندوں کو بھی کبھی یہ طعنہ دیا گیا کہ تمہارے فلاں بزرگ تو بغاوت کے کسی مقدمہ میں کبھی نہیں پکڑے گئے اور فلاں تو صرف ایک ہی دفعہ ماخوذ ہوئے تھے۔ آخر اہل حدیث اور میاں صاحب ہی کے خلاف اپنی تاریخ دانی

کے مظاہرے کا شوق کیوں پورا کیا جا رہا ہے؟

مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ درحقیقت یہ دل کا ایک ارمان ہے، جو شعوری یا غیر شعوری طور پر اعتراض کی صورت میں زبان قلم پر آگیا ہے۔ دراصل ملال اس بات کا ہے کہ میاں صاحب کو یہ موقع کیوں ملا؟ کہ کسی قدر اطمینان کے ساتھ وہ توجید خالص کی اشاعت اور سنت کے احیاء میں لگے رہے۔ جس کے نتیجے میں رسمی حنفیت پر زوال آیا۔

ایسا کیوں نہیں ہوا؟ کہ وہ بار بار پکڑے جاتے۔ ان پر طرح طرح کے مقدمات

چلا کر خوب پریشان کیا جاتا۔ وہ ساکھاسال تک جھکیوں میں گرے رہتے تھے۔ تا آنکہ علمائے احناف کی اشتعال انگیز بیوں کی بدولت کسی حنفی: مجاہد کے ہاتھوں شہید کر دیئے گئے ہوتے۔ یا ان کے خلاف جھوٹی شہادتیں گزار کر ان کو پھانسی دلوادی گئی ہوتی۔ یا کم از کم یہ ہوا ہوتا کہ ”کالے پانی“ ہی بھیج دیئے گئے ہوتے۔

اگر ایسا نہیں ہے تو پھر بات کا رخ پھرنے کی کوشش کیوں کی گئی ہے؟ سوال تو یہ تھا کہ اگر واقعی میاں صاحب انگریز نواز تھے تو انگریزوں کی نگاہ ان پر اتنی کڑی کیوں تھی؟ کہ بغاوت کے ملزموں کی گرفتاری دہلی میں نہیں، انبالہ اور پٹنہ میں ہوتی ہے، لیکن تلامذہ میاں صاحب کے گھر میں ہوتی ہے اور اتنے اہتمام کیساتھ ہوتی ہے کہ گھر کا کونہ کونہ چھان ڈالتے ہیں۔ مسجد کی چٹائیاں تک الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ ایک ایک جھٹی پڑھی جاتی ہے۔ پرزہ پرزہ ٹٹولا جاتا ہے۔ ”نخبۃ الفکر“ کو

۴۲۳

سے میاں صاحب کی طرف سے ”انگریز نوازی“ کا ثبوت کیسے ہو گیا؟ یہ کیوں نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی حکمت ان کے شامل حال تھی۔ وہ میاں صاحب کے درس قرآن اور درس حدیث کے فیض اور ان کے وعظ و تبلیغ کی برکات سے اصلاح عقائد و اعمال کی نصرت لینا چاہتا تھا۔ اسلئے ان کو اسکی توفیق بخشی اور پریشانیوں میں ڈالنے کے بجائے سکون کے ساتھ کام کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔

کیا لطف کی بات ہے کہ حاجی امداد اللہ صاحب اور مولانا محمد قاسم نانوتوی اپنی خفیہ تدریروں میں کامیاب ہو جائیں، اور ایک بار بھی انگریز کی گرفت میں نہ آئیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی صرف ایک مرتبہ پکڑے جائیں اور اس میں بھی توڑیہ کر کے اپنے آپ کو مواخذہ سے بچائے جائیں۔ تو ایسکو تو ان بزرگوں کا روحانی تصرف اور انکی کرامت سمجھا جائے۔ لیکن اگر میاں صاحب بار بار ماخوذ نہ ہوں تو اسکو انکی ”انگریز نوازی“ کہا جائے۔ واہ رے انصافے!!

ان معاندانہ ریشہ و انیوں کے مقابلہ میں کچھ دوستانہ حسن ظنیان بھی ہیں جو آج میاں صاحب

جب میاں صاحب کے بعض عقیدہ مندوں کا غلط حسن ظن

کے حق میں غلط فہمی پیدا کرنے کا باعث بن رہی ہیں۔ ہمارے خیال میں اس موقع پر ان کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ قصہ یہ ہے کہ جب ہندوستان میں انگریز کا ستارہ چمک رہا تھا اور پورا ملک اس کے

۴۲۴

استبدادی پنچے کے نیچے رہا ہوا تھا۔ اس وقت ایک مدت تک الہدیش
 ”دہانی“ کے نام سے بحیثیت فرقے کے انگریز کے معتب رہ چکے تھے
 اس لئے جن کے دل و دماغ پر اس ماحول کا رعب چھایا ہوا تھا، انھوں
 نے اپنے زعم میں میاں صاحب کی خیر خواہی اور بھلائی کے لئے اور میاں
 صاحب کے ساتھ اپنی محبت و عقیدت ظاہر کرنے کے لئے یہی سبب
 سمجھا تھا کہ حضرت میاں صاحب کو انگریزی حکومت کا ”خیر خواہ“ اور
 ”وفادار“ بتائیں۔ چنانچہ انگریزی حکومت کے استبدادی دور میں
 بعض ایسی کتابیں لکھی گئیں جن میں میاں صاحب کے بعض عقیدہ مندوں
 نے میاں صاحب کی شان میں ایسے ہی کلمات استعمال کئے۔ اور انکے
 متعلق بعض واقعات کی بنا پر اپنے ذاتی تاثرات کو اسی انداز میں پیش
 کیا ہے۔ میاں صاحب کے سوانح نگار مولوی فضل حسین صاحب
 مظفر پوری مرحوم بھی انھیں لوگوں میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب
 میں خانہ تلماشی اور نظر بندی کے مذکورہ بالا واقعہ کا جہاں ذکر کیا ہے۔
 وہاں یہ دکھانے کے بعد کہ تلماشی میں کوئی قابل گرفت چیز برآمد نہیں
 ہوئی اپنے تاثرات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-
 ”الغرض بعد تحقیقات کامل یہ بات روز روشن کی طرح کھل گئی
 کہ ان پر (یعنی میاں صاحب پر) مواخذہ محض ناجائز ہے اور
 یہ بالکل بری الزمہ ہیں اسلئے رپاکر دیئے گئے۔ یہ باتیں ہیں
 جو میاں صاحب کے ظاہر و باطن کے یکساں ہونے پر دلالت

کرتی ہیں۔ وہ جس طرح غدر شیعہ میں سنرلینس کی جان بچانے سے وفادار ثابت ہوئے تھے اسی طرح مسیحیوں کے مقدمات بغاوت میں بھی بے لگاؤ ٹھہرے۔

(الحیاء بعد المات ص ۸۲)

یہ میاں صاحب کے ظاہر و باطن کے یکساں ہونے سے موصوف کا مقصد یہ ہے کہ وہ جس طرح ظاہر میں انگریزی حکومت کے وفادار رہتے ویسے ہی باطن میں بھی اس کے وفادار ہی تھے۔ ظاہر میں وفاداری کا ثبوت ان کے زعم میں سنرلینس کا واقعہ ہے اور باطن میں وفاداری کا ثبوت تلہائی اور تفتیش کا واقعہ ہے۔ مصنف "الحیاء" کے اس تاثر اور فیصلہ پر تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہے اسلئے کہ ان کے دل و دماغ پر اپنے زمانہ کے حالات اور خارجی اثرات کا دباؤ تھا۔ مگر جو لوگ آج اس استدلال کی کمزوری کو محسوس نہیں کر رہے ہیں، یا جان بوجھ کر اس کمزور استدلال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں ان کے فکر و نظر پر تعجب اور انکی ذہنیت پر افسوس ضرور ہے۔ چنانچہ جن اہل نظر حضرات نے ان واقعات پر منصفانہ غور کیا ہے انہوں نے مصنف الحیاء کے استدلال کی کمزوری کو محسوس کیا ہے۔ اور اس کا صاف صاف اعتراف کیا ہے۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی لکھتے ہیں۔

یہ فضل حسین مظفر پوری نے الحیاء بعد المات میں میاں صاحب

کو وقت کا لحاظ رکھ کر وفادار ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہوئی

کچھ مفتی صاحب نے کتنی صفائی سے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے

کہ مولوی فضل حسین صاحب (مصنف الحیاء بعد الممات) نے "وقت کا لحاظ رکھ کر" یہ بات کہی ہے ورنہ ان کی دلیل میں کوئی جان نہیں ہے۔ مفتی صاحب کا یہ بیان پورے حوالہ کے ساتھ پہلے بھی ایک جگہ نقل ہو چکا ہے۔

مجھے تو رحم آتا ہے ان حضرات کی بے بسی پر جو خواہش اور کوشش کے باوجود میاں صاحب کی زندگی بھر کے واقعات میں سے ایک واقعہ کے سوا، کوئی دوسرا ایسا واقعہ پانے میں کامیاب نہیں ہو سکے جسکو وہ ظاہری طور پر میاں صاحب کی "وفاداری" کے ثبوت کی دلیل بنا سکیں۔ صرف ایک مظلوم اور زخم خوردہ عورت کی جان بچانے کا واقعہ ہے جسکو بار بار پیش کیا جاتا ہے اور ہیر پھیر کر اسی کو دہرایا جاتا ہے اس واقعہ کی بابت ہم بہت تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ خود میاں صاحب کے الفاظ اور بیان سے اس بات کو ثابت کر چکے ہیں کہ اس معاملہ کو انگریزوں کی وفاداری اور خیر خواہی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا محرک انسانی ہمدردی اور اسلامی احکام کی بجا آوری کے سوا، ہرگز دوسرا جذبہ نہیں تھا۔

اور اب تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر مصیبت زدہ انگریز عورت کو پناہ دینے کا اتفاقی واقعہ انگریزی حکومت کی وفاداری اور خیر خواہی کی دلیل ہے تو بہادر شاہ ظفر مرحوم کو دہن پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اور پوری بے دردی کے ساتھ جلا وطنی کی سزا دی گئی (انگریزوں کا سب سے بڑا خیر خواہ

اور وفادار کہنا چاہیے جنہوں نے اپنے شہزادوں کو خصوصیت کے ساتھ اسکی نصیحت کی تھی اور حکم دیا تھا کہ انگریز عورتوں اور بچوں کو انقلابیوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا جائے۔ ان کی حفاظت اور نگہداشت کی جائے۔ جیسا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے واقعات کے ایک چشم دید گواہ (عبداللطیف) کا تاریخی روزنامہ "ندوة المصنفین" دہلی نے شائع کیا ہے عبداللطیفؒ کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے روزنامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس ہنگامہ کے زمانہ میں بھی دہلی کے لال قلعہ میں آمدورفت رکھتے تھے۔ اور شاہی دربار کے بہت سے واقعات سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ اسی روزنامہ سے ۲۸ رمضان ۱۲۷۳ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کا ایک واقعہ جو قلعہ میں بہادر شاہ کے دربار میں پیش آیا تھا۔ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ اصل روزنامہ فارسی زبان میں ہے۔ لیکن اسکے مرتب رخلیق احمد نظامیؒ نے اسکا ترجمہ کر دیا ہے اور وہ ترجمہ بھی اصل کے ساتھ شائع ہوا ہے ہم اختصار کے خیال سے صرف ترجمہ یہاں ذکر کرتے ہیں۔ عبداللطیفؒ مذکور کا بیان ہے کہ ہنگامہ کی افسوسناک خبریں سنکر

"در سو بھری ہوئی اور نصیحت آمیز باتیں بادشاہ کی زبان پر

جاری ہوئیں خصوصاً مرزا مغلؒ، مرزا عبداللہؒ اور مرزا مختصرؒ

لہ بہادر شاہ کے بیٹے تھے ہنگامہ کے زمانہ میں سپہ سالار بنائے گئے تھے دہلی کا نظم و نسق ذاتی طور پر

۴۲۸

کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ متواتر معتبر خادموں کی زبانی (خبریں) سن کر ہماری طبیعت پریشان ہو گئی۔ ہم حیران ہیں۔ اس کا علاج ہمارے پاس نہیں۔ اس لئے کہ نہ کوئی ہماری بات سنتا ہے اور نہ کوئی ہماری بات کا اثر قبول کرتا ہے۔ تمہیں چاہئے کہ اس قوت کسی مہدی کی تلاش نہ کرو۔ خود سمو نہیں۔ بیکار نہ بیٹھو۔ بہادر کی طرح اٹھو۔ اگر ہماری نصیحت کا اثر لوگ تو یقیناً پسندیدہ خدا بنو گے۔ اور موروثی خزانہ پاؤ گے۔ پس سب سے پہلے مردانگی اور فرزانیگی کے ساتھ انگریزوں کی عورتوں اور بچوں کو ان ظالموں (کے پنجے) سے رہائی دلانے کا عزم کرو۔ ان سفاکوں کا کام آزار دینا ہے اور ہماری نیت ان کی حفاظت اور خدا کی رضا جوئی ہے۔ ایسا کرو کہ ان کی کوئی عورت، لڑکا یا کمزور اور معذور آدمی ہلاک نہ ہو ان سب کی نگہداشت کرو۔ ان کے کھانے پینے کا سامان کرنے کے واسطے کسی نیک سرشت کو مقرر کرو جو ہر ایک کو کما حقہ دے تاکہ وہ بھوک پیاس سے نہ مرے۔ ان کا قتل کرنا کریم النفسی کے

بقیہ حاشیہ ص ۴۲۷ کا۔ ان کے سپرد تھا۔ ہڈن نے گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔ ۱۲

۱۳ بہادر شاہ کے پوتے اور مرزا محوشہ رخ کے بیٹے تھے۔ ۱۲

۱۴ بہادر شاہ کے بیٹے تھے۔ ہڈن نے نہایت بے رحمی کے ساتھ گولی کا نشانہ

بنایا تھا۔ ۱۳

خلاف ہے اور شریعت کی بنیاد گرانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اس طرح دین سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور انسان عذاب اور وبال میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ گناہگاروں کے شفیع ہمارے نبیؐ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت رکی نعش حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اکئی میدان کارزار میں پائی گئی۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتراض فرمایا اور عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع کیا۔ اگرچہ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ حکم و مانعت ہماری جانب سے نہیں شریعت کی جانب سے ہے، لیکن ان میں سے ہر ایک سرکش اور خود بین ہے، ہمیں اندیشہ ہے کہ ان مظلوموں پر جو ستم ہوا ہے وہ دفتر قضا و قدر میں کہیں ہمارے نام نہ لکھا جائے۔ مولانا نظامی فرماتے ہیں

پذیرا سخن بود شد جائے گیر
سخن کنز دل آید بود دل پذیر

کلام دل گیر تھا سیلے شاہزادوں پر بھی اثر کر گیا۔ انھوں نے ہمت کے قدم بڑھائے اور کامیاب ہوئے۔ مظلوموں کو خود لا کر کو توالی کو سونپ دیا۔ اور ان کی حفاظت کی ہدایت کی۔

۴۳۰

پس کو توالی کے گھروں کو ان کی جائے پناہ بنایا۔ اور بعض کو قلعہ
میں پناہ دی کہ کچھ مدت وہ وہاں زندگی بسر کر لیں۔

(۱۵۷ء کا تاریخی روزنامہ صفحہ ۱۲)

اس اقتباس کو پڑھئے اور اندازہ کیجئے کہ انگریز عورتوں اور بچوں کیساتھ
سفاکی اور بے رحمی کے برتاؤ سے بہادر شاہ مرحوم کے دل کو کتنا صدمہ تھا
اور اس بارے میں شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کو دیکھ کر وہ کتنے
رنجیدہ اور آخرت کے مواخذہ کے ڈر سے کیسا پریشان تھے۔
بس بہادر شاہ کی طرح حضرت میاں صاحب کے دل میں بھی یہی
دینی جذبات اور ملی احساسات موجزن تھے۔ جنہوں نے ان کو مسٹر ٹینسن کے
ساتھ ہمدردی کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ جیسا کہ انہیں کے الفاظ سے ہم اسکو
پہلے ثابت کر چکے ہیں پس ان جذبات کے پیش نظر اگر بہادر شاہ کا ہمدردانہ
سلوک ان کے متعلق ”وفاداری“ اور انگریز نوازی کا تصور نہیں پیدا کرتا
تو پھر میاں صاحب کے متعلق یہ تصور پیدا کرنے والے یا تو ان کے معاند
اور حاسد ہیں یا انگریزوں کی استبداد سے بری طرح مرعوب ہیں۔ اللہ اعلم
لغزشوں کو معاف کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں بہادر شاہ اور میاں صاحب دونوں
کے جذبات میں موافقت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسٹر لی سنس کو اپناہ دینے
کی بنا پر جب لوگوں نے میاں صاحب کو پریشان کیا، اور بہادر شاہ کو
اسکی اطلاع ملی تو وہ اس خبر کو سن کر بہت برہم ہوئے۔ فوراً شہزادوں کو

۴۳۱

ان کی خدمت میں بھیجا کہ جا کر اسکا انتظام کرے۔ اور ساتھ ہی شہزادوں کے ذریعہ اپنے حق میں میاں صاحب سے دعا کرنے کی استدعا کی چنانچہ مذکورہ بالا ”روزنامچہ“ میں اس واقعہ کا بھی موجود ہے۔ ۱۲ محرم ۱۲۸۵ھ مطابق ۲ ستمبر ۱۸۶۸ء کے روزنامچہ میں عبداللطیف مذکور نے لکھا ہے۔

”معز الملک رضی اللہ عنہ بہادر مرزا محمد قدرت اللہ بیگ خاں باد لے پرورد آمدہ بہ خسرو بہر گزار د کہ مولوی سید نذیر حسین مرے ازال رسول است ورع و تقویٰ مراد را سر است شبانہ روز ہنگامہ درس و تدریس بجائے حال من مولوی محمد عبدالخالق مرحوم گرم می دارد، امروز ستم پروران بگمان پناہ دہی نہ نے نصرانیہ سوئے اور سوطن آوردہ بخانہ اش شور شے بہہ سورہ ناپسندیدہ و ناسمجیدہ کردہ دلش را آزار دادہ۔ وقتش را ربوہ جور بے اندازہ و بدعتے تازہ روا داشتہ اند کہ ازال اہل عقیدت را دل محزون و خاطر المناک است۔“

خسرو یکج گرامی ایشان بر آشفت و بہ شاہ زادگان فرمود کہ مولوی سید محمد نذیر حسین را کہ از شدت ناکساں پریشیدہ حال بودہ است و رہانند و غلہ بے جا ازاں جا بردارند، و استدعائے دعا برائے ما کنند کہ دعائے صلح و علماء موجب فلاح دین و دنیا ست، آبلے مابوقت بے کسی از اتقیار و زیادہ امداد و عامی خواستند، بعون اللہ نقش مراد بروئے کاری دیدند

۲۳۲

ہمانا مولانا از سادات حسنی و حسینی است و در حدیث پایہ
اجتہاد گرفت، و رفقہ برتری مایہ۔ و اصول آگاہی کمال دارد
و در علم تفسیر بے مثال است، و امروز در علم و عمل بے نظیر است
شب باز و سفید کار است، ہر آئینہ در پرستش ایزدی بزرگی
گرفت، بہ پزدوش ایزدی ستروگی یافت پس مولوی سید
شریف حسین ہم با حدیث و تفاسیر سرمایہ افزونہ داشت
حیف کہ ہم دریں سال بعالم اعلیٰ شتافت و منظور حق شد۔
(۱۳۰۴ھ)

اسی کتاب کے صفحہ ۱۷ پر اس کا ترجمہ بھی ہے جو درج ذیل ہے۔
"معز الملک رضی اللہ ولہ بہادر مرزا احمد قدرت اللہ بیگ
خاں غمزدہ ہو کر آئے اور بادشاہ سے عرض کیا کہ مولوی سید نذیر
حسین آل رسول سے ہیں پارسا اور پرہیزگار ہیں۔ میرے ماموں
مولوی محمد عبدالخالق مرحوم کی جگہ دن رات درس و تدریس کا ہنگامہ
گرم رکھتے ہیں۔ آج ظالموں نے ایک عیسائی عورت کو پناہ دینے
کا ان پر شبہ کیا۔ اور ان سے بدظن ہو گئے ان کے مکان پر بیہودہ

۱۔ مرزا قدرت اللہ بیگ دہلی کے عمائدین میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا خاندان عرصہ
سے شاہان مغلیہ کے دربار میں اعلیٰ مراتب رکھتا تھا۔ ۱۲
۲۔ مولوی سید عبدالخالق صاحب میاں صاحب کے استاد بھی تھے اور خسر بھی ۱۲

۴۳۳

شورش اور غیر سنجیدہ حرکتیں کیں۔ ان کو آنا پہنچایا۔ ان کا وقت ضائع کیا بے اندازہ جو رستم اور بدعتیں روا رکھیں۔ جسکی وجہ سے ان کے عقیدہ مندوں کا دل غمگین اور المناک ہے۔

بادشاہ ان کی کجروی پر غصہ ہوئے اور شاہزادوں سے فرمایا کہ مولوی سید محمد زید حسین کو جو نالائقوں کی سختی سے پریشان حال ہیں، نجات لائیں اور ان کے بیجا اور ناجائز غلبہ کو ختم کریں۔ (مولوی صاحب) ہمارے لئے دعا کی استدعا کریں۔ کیونکہ نیک لوگوں اور عالموں کی دعا دین و دنیا کی بہبود کا باعث ہے۔ ہمارے آباء و اجداد بے کسی کے وقت تار بیا زید و تقویٰ سے دلع کے طالب ہوتے تھے۔ اور مدد الہی سے اپنی مراویں پاتے تھے۔

یقیناً مولانا سادات حسنی و حسینی سے ہیں۔ حدیث میں انھوں نے مجتہد کا مرتبہ حاصل کیا۔ فقہ و اصول فقہ میں کافی کمال بہم پہنچایا۔ علم تفسیر میں بی مثال ہیں۔ موجودہ زمانہ میں علم و عمل میں بے نظیر ہیں۔ شب بیدار اور نیکو کاریں۔ بے شہر عبادت الہی میں انھوں نے بزرگی حاصل کی ہے۔ معرفت خداوندی میں بھی عظمت پائی ہے۔ ان کے صاحبزادے مولوی سید شریف حسین بھی نفایس و احادیث کا اچھا علم رکھتے ہیں۔ افسوس کہ اس سال عالم بالاکو سدھارے اور ۱۲۳۱ھ منظور حتیٰ ہوئے

عبد اللطیف کے اس بیان سے صاف عیاں ہے کہ بہادر شاہ کے دل میں میاں صاحب کی بڑی قدر و منزلت تھی، وہ میاں صاحب کے صلاح و تقویٰ،

۴۳۴

اور علم و فضل کی جلالت کے معترف و مستقر تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بہادر شاہ کی نظر میں میاں صاحب انگریز لوہار اور اسکے وفادار نہ تھے۔ ورنہ اس حریت پسند کی نگاہ میں ان کی وقعت گر جاتی۔

رہ گیا تلالی اور تفتیش کا معاملہ جسکو مولوی فضل حسین صاحب نے اپنے خیال میں وقت کی مصلحت کے لحاظ سے میاں صاحب کی ”باطنی وفاداری“ کی دلیل قرار دیا ہے، تو اسکی بابت عرض ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ سرحد پار کے مجاہدین کے پاس ہندوستان سے خفیہ طور پر جو امدادی رقوم وغیرہ بھیجی جاتی تھیں، اودران کے لئے جن جن لوگوں کو واسطہ اور جن جن مقامات کو مرکز بنایا گیا تھا، ان واسطوں اور مرکروں میں سے میاں صاحب کی ذات کوئی واسطہ، اور ان کی قیامگاہ اس کا کوئی مرکز نہ تھی۔ اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ میاں صاحب اس کام کے مخالف تھے، اور اس کے مقابلہ میں وہ انگریز کے وفادار تھے۔

ہم یہ کیسے مان لیں جب کہ مولانا عبید اللہ سندھی جیسے شخص نے اس کا اقرار کیا ہے کہ :-

”مولانا ذیر حسین دہلوی اور مولانا عبید اللہ غزنوی بھی مولانا ولایت

علی کی پارٹی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔“ (سیاحی تحریک ص ۱۳۲)

دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

”اسی لئے مولانا ذیر حسین اور نواب صدیق حسن جیسے عالم بھی

ان کا (مولانا ولایت علی کا) ساتھ دیتے ہیں (سیاحی تحریک ص ۱۳۳)

۴۳۵

یہ مولانا ولایت علی کی پارٹی ۛ ان مجاہدین اور ان کے معادنین کے علاوہ دوسری کون سی تھی جو سرحد کے پار انگریز کے خلاف محاذ جنگ بنائے ہوئے تھے؟ تو پھر اس پارٹی سے ۛ خاص تعلق ۛ رکھنے اور اسکا ۛ ساتھ دینے ۛ کا مطلب اسکے سوا اور کیا ہوا کہ پارٹی کے جملہ مقاصد کو بروئے کار لانے میں یہ حضرات بھی شریک تھے؟

مولانا سید محمدی اہل حدیث کے خیر خواہ نہ تھے، ان کی تحریریں شاید ہیں کہ وہ اہل حدیث کے مخالف تھے۔ ہمیشہ اہل حدیث کی تنقیص اور توہین کے درپے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ یہ بات بھی انھوں نے تنقید و تنقیص ہی کے ضمن میں کہی ہے۔ مگر اللہ کی شان ہے کہ یہ ہمارے حق میں مفید ثابت ہوئی اسی کو کہتے ہیں ۛ

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

۴۳۶



